

ثبات

اُردو کے تخلیقی ادب کا ترجمان

جلد اول، شمارہ: اول

جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء

مدیر

ارشاد محمود ناسخاد

شعبہ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مجلسِ ادارت

سرپرست :	ڈاکٹر شاہد صدیقی
نگران :	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر
مدیر :	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

مجلسِ مشاورت

(الف بانی ترتیب سے)

(بین الاقوامی)

(قومی)

☆	افتخار عارف.....(اسلام آباد)	☆	خلیل طوق آر.....(ٹرکی)
☆	تحسین فراقی.....(لاہور)	☆	ستیہ پال آنند.....(امریکا)
☆	خورشید رضوی.....(لاہور)	☆	سویامانے یاسر.....(جاپان)
☆	زابدہ حنا.....(کراچی)	☆	سہیل عباس بلوچ.....(جاپان)
☆	محمد حمید شاہد.....(اسلام آباد)	☆	شمس الرحمن فاروقی.....(انڈیا)
☆	مرزا حامد بیگ.....(لاہور)	☆	محمد عمر میمن.....(امریکا)
☆	ناصر عباس نیر.....(لاہور)	☆	محمد کیومرثی.....(ایران)
☆	یاسمین حمید.....(لاہور)		

☆ مندرجات متن کی ذمہ داری کلیتہاً تخلیق کاروں پر عائد ہوتی ہے۔ ثبات کا اس سے اتفاق ضروری نہیں۔

☆ ثبات میں شامل تمام تخلیقات نظم و نشر غیر مطبوعہ اور Peer Reviewed ہیں۔

نگرانِ طباعت: ڈاکٹر محمد نعیم قریشی، ناظم: پی پی یو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

برائے رابطہ: Sabaat@aiou.edu.pk

حسن ترتیب

☆	مطلع	ارشاد محمود ناسد	۷
☆	عقیدتیں:	حیرت سرا میں سارا اُجالا یقین کا ہے	
☆	والعصر	سعود عثمانی	۹
☆	نعت	امین راحت چغتائی	۱۰
☆	نعت	افتخار عارف	۱۱
☆	خون شہدا	توصیف تبسم	۱۲
☆	افسانے:	گچھ خواب ہے گچھ اصل ہے، گچھ طرزِ ادا ہے	
☆	بادشاہ سوگ میں ہے	رشید امجد	۱۳
☆	ہور و سکوپ	انور زاہدی	۱۶
☆	ساتواں دھوون	شاہین عباس	۲۷
☆	گرد	علی اکبر ناطق	۳۴
☆	چار جہتی کہانی	شفیق انجم	۳۹
☆	داغ	خاور چودھری	۴۳
☆	انسان مرتا بھی ہے	شکیل انجم راجا	۵۱
☆	غزلیں:	جمال کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا	
☆	گچھ اور تو ہم بے ہنروں سے نہ بن آئی	خورشید رضوی	۵۳
☆	میانِ عرصہ موت و حیات رقص میں ہے	افتخار عارف	۵۴
☆	محافظِ روشِ رنگاں کوئی نہیں ہے	افتخار عارف	۵۵
☆	سواری نہ خیمہ نہ پانی یہاں	محمد اظہار الحق	۵۶
☆	خلوت ہے، وصال ہے، طرب ہے	صابر ظفر	۵۷
☆	ہوگی نہ مجھ فقیر سے تعبیر ہست و بود	غلام حسین ساجد	۵۸
☆	کیا کر سکیں گے خاطرِ تقدیم ہست و بود	غلام حسین ساجد	۵۸
☆	پارینہ ہے صباحتِ آنجیل ہست و بود	غلام حسین ساجد	۵۹
☆	کم پڑ رہی ہے راحتِ امکاں ہست و بود	غلام حسین ساجد	۶۰

ثبات-----۴

۶۱	غلام حسین ساجد	☆	دیکھا جو میں نے پھاند کے دیوار ہست و بود
۶۲	حسن عباس رضا	☆	را بطوں کے درمیاں سے اک گوی گم ہو گئی
۶۳	سعود عثمانی	☆	جب بھی اس کی یاد سے پوچھوں تب حیرانی ہو
۶۳	سعود عثمانی	☆	دنیا سب آزمائی ہوئی ہے فقیر کی
۶۵	ہارون الرشید	☆	آنسوؤں میں بہایا جاتا ہے
۶۶	رحمان حفیظ	☆	اُڑاتے آئے ہو تم اپنے خواب زار کی خاک
۶۶	رحمان حفیظ	☆	متن و سند سے اور نہ تطیر سے اُٹھے
۶۸	اشرف آصف	☆	شبِ حیات کا حسرت کدہ سنوارا گیا
۶۸	اشرف آصف	☆	رونقِ بازار مٹی، حسنِ زر مٹی کا ہے
۶۹	اشرف آصف	☆	زخمِ احساس کی گہرائیاں کب دیکھتا ہے
۷۰	خورشید ربانی	☆	خواب کی راہ دیکھتا دریا
۷۰	خورشید ربانی	☆	کوئی پوچھے اگر اداسی کا
۷۲	عابد سیال	☆	کوئی سلسلہ باریابی کا ہو
۷۲	عابد سیال	☆	کس کو سودا تھا بھٹک جائے، یہاں تک آئے
۷۴	شیراز زیدی	☆	عمر بھر جیسے کسی خواب سے دو چار رہے
۷۴	شیراز زیدی	☆	بنیاد کون رکھتا ہے گھر کی حباب پر
۷۶	پرویز ساحر	☆	بلا کی وضع داری چاہتی ہے
۷۶	پرویز ساحر	☆	تماش گر بھی، تماشائی بھی، تماشا ہے
۷۷	پرویز ساحر	☆	موجوں کی طغیانی بڑھتی جاتی ہے
۷۸	پرویز ساحر	☆	جب تلک اس کرۂ خاک میں رہنا ہے مجھے
۷۸	پرویز ساحر	☆	وحشیاں یوں نہ ہمیں دیکھ کے حیرت کیے جائیں
۸۰	عمران عامی	☆	کبھی کے رنگ میں ہوں ان کبھی کا آدمی ہوں
۸۱	عمران عامی	☆	اب اور کتنی بتا ہم تجھے صفائی دیں
۸۲	افتخار شفیق	☆	تم نہیں ہو تو گماں ہے کہ نہیں تھے ہم بھی

ناول: کوزے میں جتنے رنگ ہیں دریا کے دم سے ہیں

۸۳	مرزا حامد بیگ	☆	انارکلی
۹۴	زاد حسن	☆	درد مندوں کا دل

دوہے: جیسی جا کی بدھ ہے بھنیا ویسی ہی بتلائے

☆ دوہے خاور چودھری ۱۰۵

نظمیں: کہ میرے ساتھ زمانہ بھی اضطراب میں ہے

☆ آنسو کی شہادت امین راحت چغتائی ۱۰۷

☆ ٹی وی اینکر ستیہ پال آنند ۱۰۹

☆ آج کا فاسٹ ستیہ پال آنند ۱۱۰

☆ پینا، ناپینا ستیہ پال آنند ۱۱۱

☆ تیسرا باب ستیہ پال آنند ۱۱۳

☆ بلاوا معین نظامی ۱۱۵

☆ تاریخ، خدا اور تہائی نصیر احمد ناصر ۱۱۶

☆ ہم خود فریبی کا شہکار ہیں نصیر احمد ناصر ۱۱۷

☆ آئن اسٹائن شاعر نہیں تھا نصیر احمد ناصر ۱۱۸

☆ وقت کی بوطیقا نصیر احمد ناصر ۱۱۸

☆ ساری ماؤں کے نام علی محمد فرشی ۱۲۰

☆ موت کا لس انجم سلیمی ۱۲۲

☆ بیل ذبح ہو گیا قاسم یعقوب ۱۲۳

☆ چھڑاں والی مسجد کی گلی قاسم یعقوب ۱۲۴

☆ ہم بار جائیں گے علی اکبر ناطق ۱۲۶

مضامین: معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

☆ بیسویں صدی کے اواخر کی پاکستانی غزل اور اجتماعی حیات احسان اکبر ۱۲۷

☆ غلام عباس کے افسانے محمد حمید شاہد ۱۳۶

☆ اردو تنقید کے وسطی دور کا رنگ و آہنگ صفدر رشید ۱۵۵

☆ ”ایک نظم زید کے نام“ کا تجزیاتی مطالعہ علی محمد فرشی ۱۶۱

☆ وحید احمد کی نظم ”علاج بالمثل“ کا تجزیاتی مطالعہ علی دانش ۱۷۲

☆ برصغیر کی موسیقی میں ٹھمری کی روایت یاسر اقبال ۱۷۷

سفر نامے: ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

۱۸۳	☆	داستانے از دکن آوردہ ام	رفیع الدین ہاشمی
۱۹۷	☆	جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال	نجیبہ عارف
۲۰۵	☆	مانچسٹر، لندن اور کیمبرج	امجد علی شاکر
۲۱۶	☆	سہ رنگ بارش	سعود عثمانی

خاکے: ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

۲۱۹	☆	بابا سردار	معین نظامی
۲۲۲	☆	میرے آپاجی	سعید اکرم
۲۲۷	☆	ایک اور ضیا۔۔۔	اشفاق احمد ورک

گیت مالا: کتنا دشوار ہے آواز کو نغمہ کرنا

۲۳۱	☆	چھن چھن چھن چھن پائل باجے، کھن کھن کنگنا بولے	مشتاق عاجز
۲۳۱	☆	تورے نین بڑے پت چور	مشتاق عاجز
۲۳۲	☆	گھر گھر آئے گھور بدروا، چھم چھم برکھا بر سے	مشتاق عاجز
۲۳۳	☆	سکھی ری مورا نکلا بلیم ہرجائی	مشتاق عاجز
۲۳۴	☆	ڈھل گئے سائے شام نہ آئے	مشتاق عاجز

خودنوشت: ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

۲۳۵	☆	سیر گریباں	امین راحت چغتائی
-----	---	------------	------------------

تراجم: پانی کے ساتھ ساتھ سفر میں ہے عکس ماہ

۲۳۹	☆	دُنیاؤں کی دکان	رابرٹ شیلکے / شہر یار خان
۲۴۸	☆	خمیسے کا کوٹ	جمال ابڑو / منظور علی ویسریو
۲۵۰	☆	خانہ بدوش	دُر محمد کاسی / اسماعیل گوہر
۲۵۳	☆	اکتاویو پاکی نظمیں	اکتاویو پاکی / رضا المصطفیٰ ترک
۲۵۶	☆	مائی ری!	سارا شگفتہ / زاہد حسن

وفیات: جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

۲۵۷	☆	بُکھتے چلے جاتے ہیں چراغ [۲۰۱۷ء]	محمد منیر احمد سلج
-----	---	----------------------------------	--------------------

مطلع

[۱]

انسانی اعمال و افعال میں سب سے تحریریں اور جمال پرور وظیفہ ادب کی تخلیق ہے۔ ادب محض زندگی کا ترجمان اور نقیب نہیں بلکہ اس کے رنگ و آہنگ کا محرم، اس کی پہنائیوں کا رازدار اور اس کے کیف و کم کا اظہار یہ بھی ہے۔ ادب صرف زندگی کی سمت و رفتار کے گوشوارے مرتب نہیں کرتا بلکہ راہِ راست سے ہٹے اور بے لگام ہوتے رہوارِ حیات کو قابو میں رکھنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ زندگی کا پہیا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ یہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی اور نئے منظروں سے ہم کلام ہوتی ہے۔ ادب کی آنکھ ان تغیرات کی مسلسل نگرانی کرتی ہے اور زمانے کی کروٹوں سے زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا حساب رکھتی ہے۔ ہر عہد اپنے خوابوں، خواہشوں، تمنائوں، ارادوں اور کیفیتوں کو زندگی کے منظر نامے پر سجا کر اپنے انفرادی خال و خط ابھارتا ہے؛ اس عمل کے سارے مراحل ادب کی کارگاہ سے نمودار ہوتے ہیں گویا ادب فرد اور اجتماع کی جملہ کارگزاریوں کی تہذیب گری کر کے انھیں جمالیاتی منطقے کی حریم میں لے آتا ہے۔ یہی وظیفہ ادب کا جواز بھی ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت کا آئینہ بھی۔

سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی نے عہدِ رواں کو حیرت آگیز منظروں سے دوچار کر دیا ہے۔ اعتماد اور یقین کی روایتوں پر خوف کی پہرہ داری ہے۔ خواب دھندلانے لگے ہیں۔ زمینی فاصلے سمٹ رہے ہیں؛ دُنیا گلوب و لیٹج بنتی جا رہی ہے مگر فرد کا فرد اور اجتماع سے رشتہ کٹتا جاتا ہے، دُوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ فکر کا انتشار، تصورات کی نامتائی اور نظر کی نارسائی ادھرے فلسفوں اور خام نظریوں کی صورتِ انسانی معاشروں کے گرد لپکتی چلی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے شاید ادب سے بہتر اور کوئی وسیلہ نہیں۔ جسے دانشِ عصر حاضر ایک طرف دیوار سے لگا کر فراموش کرنے کے درپے ہے۔ شعر و ادب کے معاشرتی ادارے دم توڑ چکے ہیں، جامعات اور دوسری تعلیم گاہوں کا رُخ تخلیقی ادب کے ہمہ رنگ اور سرسبز و شاداب چمنستانوں کے بجائے کچی پکی تحقیق اور غیر موثر تنقید کے خارزاروں کی طرف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تحقیق اور تنقید کے تیشہ تیز سے قوموں اور معاشروں کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے اور افراد و اقوام کے ماضی و حال کو چھیل کر اُن کے مستقبل کے خال و خط سنوارے جاتے ہیں مگر اس واضح حقیقت سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوگا کہ تحقیق اور تنقید کی قدیلوں کو تخلیق روشن کرتی ہے۔ تعلیمی اداروں اور معاشروں میں تخلیقی فضا کی موجودگی ہر عہد کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی، وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد نے پچھلے چند برسوں میں یونیورسٹی میں ایک ایسا ماحول خلق کرنے میں نہایت فعالیت کا مظاہرہ کیا ہے، جس سے یونیورسٹی کا منظر نامہ جذب و احساس اور فکر و نظر کے نئے رنگوں سے جگمگا اٹھا ہے۔ انھوں نے اس تعلیمی ادارے کو مذاکروں، مباحثوں، مشاعروں، مجلسوں اور محفلوں کے ذریعے متحرک کرنے میں جو سرگرمی دکھائی ہے وہ بجا طور پر لائق تحسین ہے۔ عصر حاضر کے تقاضوں، ضرورتوں اور مسائل سے کاملاً آگہی کے باعث ان کی آنکھوں میں کئی خواب کو دیتے نظر آتے ہیں۔ جامعہ کے مختلف شعبوں سے پندرہ تحقیقی مجلّوں کا اجرا اور متعدد قومی و بین الاقوامی کانفرنسوں کے کامیاب انعقاد کے باوصف وہ خوب سے خوب تر کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تخلیقی فضا کی ضرورت کے احساس کے تحت جامعہ سے تحقیقی مجلات کے قدم بہ قدم ایک اُردو تخلیقی مجلے کے اجرا کا ارادہ کیا۔ **ثبات** ان کے اسی ارادے کی عملی صورت ہے۔ پاکستانی جامعات کی تاریخ میں **ثبات** پہلا Peer Reviewed تخلیقی مجلہ ہے۔ اللہ الحمد

ثبات کے شمارہ اول کے لیے صفِ اول کے تخلیق کاروں نے اپنی غیر مطبوعہ اور تازہ تخلیقات سے نوازا۔ ہم ان کی اس عنایتِ خسروانہ کے بے حد ممنون ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ آئندہ شماروں کے لیے بھی دستِ تعاون بڑھاتے رہیں گے۔ مجلس مشاورت (قومی و بین الاقوامی) کے معزز ممبران اور مجلسِ مبصرین کے اراکینِ گرامی کی سرپرستی اور رہنمائی کے لیے مجلسِ ادارت ان کی شکر گزار ہے۔

مدیر



والعصر

وہ چوکور سادائزہ مجھ کو دائیں سے بائیں لیے چل رہا تھا
 طواف اپنے مرکز کی جانب مجھے کھینچتا تھا
 تمازت بھرا عصر کا وقت تھا اور دن ڈھل رہا تھا
 میں رکنِ عراقی سے آگے بڑھا رکنِ شامی کی جانب
 اور اس کو نگاہوں سے بوسہ دیا
 کوئی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور اس میں بدن جل رہا تھا
 میں تھوڑا جھکا، میری بائیں ہتھیلی نے رکنِ یمانی کو چوما
 مرے ساتھ پیروں تلے میرا دل چل رہا تھا
 اور آنکھیں جو ہمراہ آئی تھیں مجھ کو بھگونے

مرے تین کونے
 الٰہی یہ میرے عراق اور شام اور یمن ہیں
 الٰہی مرے تین کونے



نعت

یہ عقل کی حیرانی، جذبوں کی فراوانی
 سرکار کے سائل کی پر نور ہے پیشانی
 طیبہ کی تمنا اور یہ بے سروسامانی
 اس شوق کے عالم پر حیران ہے حیرانی
 ہر سانس درودوں سے مہکی ہوئی آتی ہے
 حرفوں کے گلابوں میں خوشبو کی فراوانی
 دن رات کرم اُن کے ہوتے ہیں مدینے میں
 کوتاہی داماں ہے سائل کی پریشانی
 کیا جانیں محبت کے اسباب و علل کیا ہیں؟
 دن رات زباں پر ہے خواجہ کی ثنا خوانی
 سرکار کی بستی کے شاید ہیں قریں راحت
 ہر نقش کف پا پر جھکتی نہیں پیشانی



نعت

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
 جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا
 مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
 کوئی مجھ میں تھا جو صفحے اُلٹتا جا رہا تھا
 بلاوے پر یقین تھا اور قدم اُٹھتے نہیں تھے
 عجب سیلِ اَلَم آنکھوں میں اُڈا آ رہا تھا
 ہر اک بولا ہوا جملہ ، ہر اک لکھا ہوا لفظ
 لہو میں گونجتا تھا اور قیامت ڈھا رہا تھا
 اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
 وہی جو منتہائے ہر دُعا بنتا رہا تھا
 بہت نامطمئن آنکھیں اچانک جاگ اُٹھیں
 کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا
 مدینہ سامنے تھا ، منتظر تھا در سخی کا
 دلِ آؤردہ اپنے بخت پر اترا رہا تھا
 دُعا بعد از دُعا ، سجدہ بہ سجدہ ، اشک در اشک
 میں مشّتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا



خونِ شہدا (تضمین بر شعر عربی شیرازی)

سب سے پہلے ہے سزاوارِ ثنا ، ذاتِ احد
مدح واجب ہے مگر کم ہیں حروفِ ابجد
یہ عناصر کا جہاں ، آنکھ کا حیرت خانہ
دیکھتی جاتی ہے ، ششدر ہوئی جاتی ہے خرد
سبز پتوں میں چھپی آگ ، شرر پانی میں
آنکھ کس کو کرے تسلیم ، کرے کس کو رد
بڑھتی جاتی ہے خلاؤں میں مسلسل یہ زمیں
وقتِ اک خطِ کشیدہ ہے ، ازل ہے نہ ابد
جو دیے بُجھ گئے روشن ہیں ہوا کے رُخ پر
کربلا! معجزہ کس کا ہے حیاتِ سرمد
ہے شہیدوں کا لہو ، طیب و طاہر ورنہ
کیوں اُنھی کپڑوں میں رکھتے ہیں انھیں زیرِ لحد
ہے یہی حال یہاں اُن کے عزاداروں کا
نعمتِ گریہ جنھیں دی گئی ، اللہُ صمد
”تو ز یک قطرہ خوں ، ترک وضو گیری و ما
سیلِ خوں از مژہ ریزیم و طہارتِ نرود“



بادشاہ سوگ میں ہے

وہ اکثر درباریوں سے کہتا۔۔۔۔۔۔ ”اپنے اپنے زمانے کے حکمرانوں نے کیسی کیسی تاریخیں لکھوائی ہیں“
 درباری اثبات میں سر ہلاتے۔

”کوئی بھی نہیں۔ بس ایک فقیر ہوں“

”اندر کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”شہر شہر پھر نامیری عادت ہے، بس ادھر نکل آیا۔ شہر نظر آیا تو سوچا اندر جا کر دیکھوں۔“

”تم داستان گو تو نہیں؟“

”مجھے کیا معلوم داستان کیا ہوتی ہے؟“

”توسیا ح ہو؟“

”فقیر سیاح“

اُسے ایک طرف بٹھادیا گیا اور بادشاہ کو اس کے کوائف کی اطلاع دی گئی۔ بادشاہ اُس وقت اپنی ایک کنیز کو سامنے بٹھا کر اس کے منہ میں انگور کے دانے پھینک رہا تھا۔ اس پُرسرت و لذت بھرے لمحے میں اُسے کو تو ال کا آنا بُرا لگا۔

بولا۔۔ ”داستان گو نہیں سے تو آنے دو“

اُسے شہر میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ ابھی وہ شہر کے بڑے چوک میں پہنچا ہی تھا کہ ہر طرف سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ شاہی محل کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ اُس نے کنبیوں کو روک کر پوچھنے کی کوشش کی لیکن کوئی رُکا ہی نہیں۔ ہجوم کے ساتھ ساتھ وہ بھی گھٹناتا ہوا شاہی محل کے سامنے پہنچ گیا۔

ایک بڑے چوتّرے پر کھڑا شخص اعلان کر رہا تھا کہ بادشاہ سلامت انتہائی غم میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر کے منہ میں انگور کے دانے پھینکتے ہوئے ایک دانہ کنیر کی سانس کی نالی میں چلا گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ بادشاہ سلامت نے اُسے لپٹا لیا ہوا ہے اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔ درباری ان کے ارد گرد کھڑے آہ و بکا کر رہے ہیں۔

سارا شہر غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

بادشاہ کا سوگ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ بادشاہ سوگ میں ہو تو درباری کیسے سوگ میں نہیں ہوں گے؟ شہر کا سارا نظام اٹھل پٹھل ہو گیا۔ جو کسی کا جی چاہتا، کرتا۔ شہر کے بچوں بچ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا کہ وہ اُس سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاملہ کو تو ال کے پاس آیا تو وہ بولا۔۔۔ ”میں سوگ میں ہوں، اپنا فیصلہ خود ہی کر لو۔“ مارنے والا طاقت ور تھا اس لیے مدعی کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوا۔ اگلے دن ایک بیوی نے اپنے شوہر کو مار دیا۔ اُسے شبہ تھا کہ وہ دوسری عورتوں سے ملتا ہے۔ معاملہ نائب کو تو ال تک آیا لیکن وہ سوگ میں تھا، اس لیے کسی کو سزا نہ ہوئی۔

لوگوں نے ایک دوسرے کو مارنا، لوٹنا شروع کر دیا۔ جو طاقتور تھا اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ راہ چلتے لوگوں کی پگڑیاں اُچھلنے لگیں۔ عورتوں کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ جس کا جی چاہتا، راہ چلتی عورت کو اُٹھالے جاتا۔ اٹھانے والا ذرا نرم دل ہوتا تو لذت کشی کے بعد زندہ چھوڑ دیتا ورنہ کئی ایسے بھی تھے کہ اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ بچوں کو درس گاہوں کے باہر سے اُٹھالیا جاتا اور اُن سے غلاموں کے سے کام کرائے جاتے۔ کہیں کوئی احتجاج ہوتا تو منصف صلح کر دیتا کیونکہ وہ بھی سوگ میں تھا۔

لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں رہے تھے۔ سیاح جو فقیر کے بھیس میں دراصل داستان گو تھا یہ سب دیکھتا تھا اور کچھ کہنے کی بھی کوشش کرتا تھا لیکن کوئی اس کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

”عجب شہر ہے“ وہ سوچتا --- ”جہاں کے لوگوں میں کوئی اُمنگ ہی نہیں، کوئی خواب ہی نہیں دیکھتا“

ایک شام چائے پیتے ہوئے اُس نے سرائے کے مالک سے کہا: ”یہاں کوئی خواب ہی نہیں دیکھتا“

اُس نے پوچھا۔۔۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

فقیر کے بھیس میں سیاح جو دراصل داستان گو تھا، اس کے سوال پر ذرا بھی حیران نہیں ہوا۔

پھر اُس نے ایک اور بات نوٹ کی کہ شہر کے لوگوں کے چہرے بگڑ رہے ہیں۔ اُن کے چہروں کے اندر سے مختلف جانوروں کے چہرے اُبھر رہے ہیں۔ پھر اُن کی حرکات میں بھی جانور پن نمایاں ہونے لگا ہے، ذرا ذرا سی بات پر وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیتے ہیں، کوئی شنوائی نہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر درباری، منصف، کوٹوال سبھی سوگ میں تھے۔

کسی رشتے کا تقدس قائم نہیں رہا تھا۔ باپ بیٹے اور بیٹے باپ کو مارنے مارنے پر تلے ہوتے تھے۔ آپادھانی کا ایک عجب

عالم تھا کہ ہر شخص صرف اپنا تھا۔

”شاید اپنا بھی نہیں“ داستان گو نے سوچا۔۔۔ ”ان کی داستان لکھی بھی گئی تو ان میں کون سننے کو تیار ہے؟“
اسی شام سرائے میں اس کے کمرے سے اس کی وہ کاپی جس میں وہ سب لکھ رہا تھا، چوری ہو گئی۔ ملازموں سے پوچھا، مالک سے پوچھا
کسی نے کچھ نہ بتایا۔

”تو داستان ہی چوری ہو گئی ہے“ اُس نے سوچا۔۔۔ ”اب یہاں رہنے کا کیا فائدہ؟“
فصیل کے بڑے دروازے سے نکل کر اُس نے مڑ کر دیکھا۔ فصیل میں قید شہر سوگ میں تھا کیونکہ بادشاہ سوگ میں ہے۔



ہور و سکوپ

پاپا وکیل تھے۔۔۔ شام پڑتے ہی رات کے کھانے تک اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے آنے والے مقدمات کی فائلوں اور قانون کی کتابوں میں اُلجھے رہتے۔۔۔ علی الصبح اپنے معمول کے مطابق اٹھتے اور تیار کیس پر ایک نظر ثانی کرنے کے بعد سفید پیٹ سفید شرٹ سفید کالر اور سیاہ کوٹ پہنے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ کر تازہ اخبار کا مطالعہ شروع کر دیتے۔۔۔ یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔۔۔ تاوقتیکہ کسی روز ناسازی طبع کی وجہ سے وہ کورٹ نہ جا رہے ہوں یا پھر کورٹ میں سرکاری تعطیل ہو۔۔۔ ناسازی طبع کا موقع شاذ ہی ہوتا کہ پاپا اپنی صحت کا بطور خاص خیال رکھتے تھے۔۔۔ وقت پر کھانا۔۔۔ تھوڑا اور مناسب مقدار میں کھانا۔۔۔ گھی تیل اور زیادہ نمک کا شوق نہ رکھنا۔۔۔ اور پھر اس سب پر مستزاد صبح شام باقاعدگی کے ساتھ ورزش یا واک کرنا پاپا کی زندگی کا معمول تھا۔ گھر کے کسی فرد نے کبھی انھیں رات کو غیر معمولی طور پر تاخیر سے سوتے یا صبح کو دیر سے اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اور وہ ہم نینوں بہن بھائیوں میں بھی اپنی ان عادات کو منتقل کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔۔۔ پابندی وقت۔۔۔ وعدے کو پورا کرنا۔۔۔ اور کام کی وقت پر تکمیل۔۔۔ پاپا کے فرائض منصبی میں اولیت رکھتے تھے۔۔۔

وکیل ہوتے ہوئے بھی جدلیات اُن کا پسندیدہ مضمون تھا۔۔۔ کارل مارکس۔۔۔ فریڈرک اینجلز۔۔۔ ڈارون۔۔۔ اور فرائد کو وہ بیسویں صدی کا نجات دہندہ گردانتے تھے۔۔۔ مگر ساتھ ہی اپنی تاریخی اور معاشرتی روایات پر بھی فخر کرتے تھے۔۔۔ ابن خلدون اور ابن رشد اُن کے محبوب فلسفیوں میں سے تھے۔۔۔ وہ عہد ماضی اور دور جدید کے منطقی امتزاج کا ایک بے مثال نمونہ تھے۔۔۔ ہم سب بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت انھی کے اصولوں پر ہوئی۔۔۔ جہاں وہ ہمیں عہد جدید کے سائنس دانوں کی گراں قدر خدمات کے بارے میں بچپن سے بتاتے چلے آئے تھے، وہیں وہ ہمیں بوعلی سینا۔۔۔ فارابی اور رازی کی علم طب کے حوالے سے جدید انسانیت کو فراہم کی جانے والی معلومات کے بارے میں بھی سمجھایا کرتے تھے۔

”جوزی بیٹے۔۔۔ یہ جو بوعلی سینا تھے۔۔۔ اپنے عہد کے سب سے بڑے طبیب ہی نہ تھے بلکہ طبابت کے فن کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ۔۔۔ فلسفہ۔۔۔ موسیقی۔۔۔ علم الہیات۔۔۔ اور فقہ پر بھی دسترس رکھتے تھے۔۔۔ ان کی طب کی کتاب جسے ”قانون“ کے نام سے دنیا بھر میں جانا گیا۔۔۔ اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی کے اوائل تک سارے یورپ کی طبی دانہ گاہوں میں ”کینن“ کے نام سے پڑھائی جاتی رہی۔۔۔ یہ ایران کے شمال مغربی صوبے ہمدان میں پیدا ہوئے۔۔۔ لیکن آج کا جدید یورپ انھیں فادر آف میڈیسن کے نام سے یاد کرتا ہے اور صرف یہی نہیں ان کی ایجادات اور طب کے حوالے سے ان کے فراہم کردہ علم پر فخر کرتا ہے۔۔۔ میرا تمہیں یہ سب بتانے کا مطلب یہ ہے۔۔۔ کہ آج کے جدید علوم حاصل کرو لیکن اپنے ماضی کی درخشاں روایات کو یاد رکھو اور ان پر فخر کرو۔۔۔“

”بچو۔۔۔ اسے علم حیاتیات میں۔۔۔ ”میمیکری“۔۔۔ کہتے ہیں۔ یعنی اس طرح یہ چھوٹے حشرات خود کو اپنے ماحول کے رنگ میں ڈھال کر اپنے لیے ایک طرح کا ڈیفنس میکانزم بنا لیتے ہیں۔۔۔ اس طرح جہاں یہ خود کو اسی ڈیفنس کے ذریعے بچاتے ہیں وہیں اسی ڈیفنس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو شکار کر کے اپنی خوراک کا بندوبست کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

یا کبھی باغ سے واپسی پر اپنی کار چلاتے ہوئے وہ مجھے ڈرائیونگ کے بارے میں سمجھایا کرتے۔۔۔

جوزی۔۔۔ بیٹے۔۔۔ جب میں کار چلاتا ہوں تو تمہیں پوری توجہ سے دیکھنا چاہیے کہ کار چلاتے ہوئے کیا کچھ کرنا ضروری ہے۔۔۔

سب سے بڑی بات جو کار چلانے میں اہم ہے۔۔۔ وہ کار چلانے والے کی مسلسل توجہ اور اُس کی حاضر دماغی ہے۔۔۔“

عام دنوں میں می می کو آٹھ بجے کالج پہنچنا ہوتا تھا لیکن پاپا کو کورٹ نو بجے جانا ہوتا تھا۔ لہذا ڈرائیور ناشتے کے فوراً بعد ہی می اور ہم تینوں کو لے کر چلا جاتا۔۔۔ اور جب وہ ساڑھے آٹھ بجے می کو اُن کے کالج اور ہمیں سکول پہنچا کر گھر واپس پہنچتا تو پاپا کے کورٹ جانے کا وقت ہو چکا ہوتا۔ تب می فزکس کی لیکچرار تھیں اور کالج میں ہمہ وقت اپنے شاگردوں کے ہمراہ فزکس کی لیب میں وقت گزارتیں۔ نیوٹن کے حرکت کے قوانین۔۔۔ پربنی تجربات۔ کشش ثقل۔۔۔ اور جدید خلائی موضوعات پر لیکچر اور ان سے متعلق بحثوں میں وقت گزارتا۔۔۔ لیکن کالج سے گھر آ جانے پر وہ بیشتر وقت کیرو کی پامسٹری۔۔۔ علومِ فلکیات۔۔۔ اور ستاروں کے اثرات اور ہورو سکوپ سے متعلق کتابوں اور رسائل کے مطالعے میں گزار دیتیں یا پھر ان کے بارے میں مطالعے میں مجھ پر مہم جو ہا کرتیں۔۔۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ گھر کے کاموں کی نگرانی کرتیں۔۔۔ ہم سب کے لیے ہر دوسرے تیسرے دن نئی ڈشز تیار کرتیں۔۔۔ کبھی

شاہی ٹکڑے بنا رہی ہیں تو کبھی شکر قدی کا حلوہ بنا کر ہم سب کو حیران کر دیتیں۔۔۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ می کا ستارہ۔۔۔ کینسر تھا۔۔۔ جب کہ پاپا کا لیو۔۔۔ یعنی می کا عنصر اگر پانی تھا۔۔۔ تو پاپا کا عنصر آگ۔۔۔ اور بظاہر آگ اور پانی کے اس قدر حیران کن ملاپ کے بارے میں سوچنا بھی عجیب سی بات لگتی تھی۔۔۔ لیکن ہم نے آگ اور پانی کو با آسانی شیرو شکر ہوتے اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔ می جس قدر اپنے گھر سے محبت کرتی تھیں۔۔۔ وہ ناقابل یقین تھا۔۔۔ اور دوسری طرف پاپا بھی اُن سے کچھ بڑھ کر ہی نہ صرف اُن کا خیال رکھتے بلکہ ہمہ وقت ہم تینوں بہن بھائیوں کی آہستہ نہت میں لگے رہتے۔۔۔ جب ہم سو جاتے تو می کبھی میرے کمرے میں آ کر میرے سرہانے کھڑے ہو کر دعائیں پڑھتی رہتیں۔۔۔ تو کبھی ناز و کے کمرے میں جا کر اُس پر پڑھ پڑھ کر دم کرتی اور دعائیں مانگتی نظر آتیں۔۔۔ چھوٹا جی۔۔۔ جو ابھی سکول ہی میں تھا اکثر رات کو خواب میں ڈر جاتا تو کبھی میرے بستر میں آ گھستا۔۔۔ کبھی پاپا کے پاس جا بیٹتا۔۔۔ اور اگلے دن می کا لُج جانے کے بجائے سارا دن جی کے ساتھ لگا دیتیں۔۔۔ میں نے کئی بار انھیں پاپا سے بحث کرتے ہوئے سنا تھا۔۔۔

”دیکھیں میں نہ کہتی تھی۔۔۔ جی کی پیدائش کے وقت زُحل اپنے گھر سے مشتری میں داخل ہو چکا تھا۔۔۔ جس کے اثرات اب تک جی پر نظر آتے ہیں۔۔۔“ اور پاپا جو علم نجوم اور ستاروں کے علم کے بارے میں کوئی مؤقر رائے نہ رکھتے تھے۔۔۔ می سے محبت کرنے کے باعث بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔۔۔

”روبی۔۔۔ تم نے فزکس میں ماسٹر ز خواہ مخواہ میں کیا۔۔۔ اگر تم یہی وقت علم نجوم میں پی ایچ ڈی کرنے میں لگاتیں تو قوم و ملک کے لیے کس قدر بہتر ہوتا۔۔۔“ یا پھر کبھی می کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتے۔۔۔

”یار۔۔۔ تمہارے ابا جان تو ڈاکٹر تھے وہ بھی سول سرجن۔۔۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ہاں کہیں دُور پرے کوئی نجومی یا جوتشی ضرور ہوا ہوگا۔۔۔“ اور می اُن سے روٹھتے ہوئے اپنی بات کو یوں ختم کر دیا کرتیں۔۔۔

”آپ ٹھہرے کریمنیل لائر۔۔۔ ہم چاہے فزکس میں ماسٹر ہوں یا علم نجوم میں پی ایچ ڈی۔۔۔ ظاہر ہے آپ سے جرح کون کر سکتا ہے۔۔۔“

کچھ ہی دن بعد اتفاق سے اگر پاپا کورٹ سے کسی مقدمے کے سلسلے میں پریشان گھر لوٹے تو می ہی اُن کی مشکل یہ کہتے ہوئے آسان کر دیا کرتیں۔۔۔

آپ بالکل نہ گھبرائیں۔۔۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کا یہ کیس ہفتے کے فلاں روز کورٹ میں پیش ہوا تو آپ کے لیے کیس میں مشکلات ہو سکتی ہیں۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی اس کیس کے سلسلے میں تیاری میں کچھ کمی ہے۔۔۔ بلکہ یہ سب کچھ درحقیقت آپ کے ستاروں کے باعث ہے۔۔۔ اب آپ اگر میری بات مانیں تو اس کیس کو اگلے ہفتے منگل کے دن پر رکھوا لیں۔۔۔ اس کے لیے آپ کورٹ میں اپنی صحت کے حوالے سے میڈیکل سرٹیفیکٹ بھیج دیں۔۔۔“ اور پاپا می سے ہنستے ہوئے کہتے۔۔۔

یعنی میں کورٹ میں جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کروں۔۔۔“

بھئی جھوٹا کہاں۔۔۔ اگر آپ بیمار ہیں تو بس بیمار ہیں۔۔۔ اور آرام آپ کو آپ کا ڈاکٹر تجویز کر رہا ہے۔۔۔ اس میں جھوٹ کہاں ہے۔۔۔“

اور بالفرض اُس دن تمہارے علم نجوم کے مطابق جس عدالت میں ہمارا کیس ہے، اُس کے جج صاحب کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔۔۔ تو پھر کیا ہوگا۔۔۔؟ میرا مطلب ہے کہ اُس دن اگر جج نے بھی اسی طرح کا میڈیکل سرٹیفکیٹ کورٹ میں بھیج کے چھٹی مانگ لی تو۔۔۔؟“

اور می پاپا کی بات سچ میں کاٹتے ہوئے مجھ سے بڑے پیار سے کہتیں۔۔۔

جوزی بیٹے۔۔۔ تم پاپا کی بات نہ سنو بلکہ ایسا کرو کہ ڈاکٹر انعام سے ابھی جا کر مل لو۔۔۔ اور انھیں میری طرف سے کہنا کہ پاپا کی کمر میں کل سے اچانک درد ہو گیا ہے اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے پاس آ سکیں۔۔۔ مُمی نے کہا ہے کہ آپ اُن کے لیے ایک میڈیکل۔۔۔“

تب پاپا مُمی کی بات کاٹتے ہوئے کہتے۔۔۔

”اب یہ بچہ میرے لیے ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔۔۔ وہ بھی ایک جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے۔۔۔ معاملہ اتنا بھی نہیں بگڑا۔۔۔ میں خود جا کر ڈاکٹر انعام سے مل لیتا ہوں۔۔۔ بینک وہ میرا عزیز دوست سہی لیکن۔۔۔ اپنے سلسلے میں مجھے خود ان سے بات کرنی چاہیے۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں ایسا ہی کروں گا جیسا تم مشورہ دے رہی ہو۔۔۔“

بات آئی گئی ہو جاتی۔۔۔ نہ پاپا انکل انعام کے پاس جاتے۔۔۔ نہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کی نوبت آتی۔۔۔ اگلی مرتبہ پاپا اسی کیس میں کامیاب ہو جاتے۔۔۔ اور جب وہ گھر واپس آ کر مُمی کو اس کے بارے میں خوش خوش بتاتے۔۔۔ تو مُمی یہ سوچتے ہوئے۔۔۔ کہ پاپا نے اُن کے مشورے پر کام کیا ہے مسکراتے ہوئے کہا کرتیں۔۔۔

اب تو مان لیں مجھے ماہر علم نجوم۔۔۔ آپ جب بھی میرے مشورے پر کام کریں گے۔۔۔ تو ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔۔۔“

پاپا اکثر مُمی سے پوچھا کرتے۔۔۔

تم یہ بتاؤ کہ کیا اپنے لیکچر دینے سے پہلے اپنے علم جوش کا سہارا لیتی ہو۔۔۔ کہ کل مجھے کششِ ثقل پر لیکچر دینا چاہیے یا نہیں۔۔۔ یا پریکٹیکل کراتے ہوئے کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہارے کانوں میں اک غیبی آواز آئی ہو۔۔۔

”تم ہماری اقلیم میں کیسے داخل ہو گئیں۔۔۔ تم نہیں جانتی کہ یہاں قوانینِ حرکت کے بجائے ہمارا قانون چلتا ہے۔۔۔؟“

مُمی اس بات کا جواب ہمیشہ ٹال دیتیں۔۔۔ اور ہنستے ہوئے کہا کرتیں۔۔۔

”یہ آپ کے عدالتی کام نہیں ہیں کہ پیشی اپنی مرضی سے آگے کروالی۔۔۔ بیچارا موکل جانے اور اُس کا خاندان۔۔۔ آپ کے موکل تو سنا ہے اسی عدالتی نظام کے ہاتھوں برسوں عدالتوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔۔۔ کچھ ہی خوش نصیب ہوں گے جنہیں کامیابی ملتی ہو۔۔۔ ورنہ بیشتر تو ان دیوانی معاملات میں سنا ہے کہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔۔۔“

غرض پاپامی کی اسی نوک جھونک پر دن رات گزرتے گئے۔۔۔ وہ ایک کامیاب وکیل اور می ایک اچھی پروفیسر کے طور پر کام میں مصروف کار رہے۔۔۔ لیکن بقول پاپا کے یہ بات اپنی جگہ اک حقیقت تھی کہ می اپنے بیشتر کاموں کو شروع کرنے سے پہلے اپنے علم جوٹش کا سہارا لیا کرتی تھیں۔۔۔ یا ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔۔۔ کم و بیش ساری ہی عورتیں اپنے میاں گھر اور بچوں کے بارے میں بہت زیادہ پزیرتو ہونے کے باعث ضعیف الاعتقاد ہو جاتی ہیں اور قدم قدم پر اپنی ضرورت سے زیادہ محبت کی وجہ سے بات بات پہ وہ وسوسوں کا شکار ہوتی ہیں اور خواہ مخواہ کے وہم اور ڈر میں مبتلا رہتی ہیں۔۔۔

مثلاً میرے بارے میں وہ اس لیے فکر مند رہا کرتیں۔۔۔ کہ جوزی بہت سادہ بچہ ہے۔۔۔ راست ہے۔۔۔ اپنی بات پر اٹل رہتا ہے۔۔۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنا بھی غلط سمجھتا ہے۔۔۔ یہ دنیا کے چھل فریب سے بیگانہ ہے اس کا کیا ہو گا۔۔۔؟

لیکن اُن کے سارے فکر اور پریشانی کے باوجود ایم بی اے کرتے ہی ایک بینک میں ملازم ہو گیا۔۔۔ کچھ ہی سالوں میں ترقی کر کے براچ مینجرجن گیا۔۔۔ خود می ہی نے اپنی ایک عزیز دوست کی بیٹی سے میری شادی کر دی۔۔۔ اور شادی کے دو برس بعد ہی ہماری می دادی بن گئیں۔۔۔ میں آج بھی می کی تمام فکرات اور توہمات کے ہوتے ہوئے بھی اپنی فیلڈ میں خاصا کامیاب ہوں۔۔۔ لیکن می کی پریشانی اس سب کے بعد بھی میرے بارے میں ہمیشہ اسی طرح رہی۔

چھوٹی بہن نازو کے بارے میں وہ یہ سوچ سوچ کر فکر مند رہتیں۔۔۔ کہ اُس کا ستارہ ورگو ہے۔۔۔ اور بقول می کے گو اس ستارے کے زیر اثر پیدا ہونے والے بہت عقلمند، زیرک اور عملی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔۔۔ لیکن اُن کی ازدواجی زندگی میں مسائل کھڑے رہتے ہیں لہذا بقول می کے ورگو والے بچوں کی شادی ذرا تاخیر سے ہونی چاہیے۔۔۔

اب نازو کا معاملہ دیکھیں۔۔۔ ورگو ہونے کے باوجود وہ ابھی یونیورسٹی ہی میں تھی کہ وہاں اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کے ایک لیکچرار سے اُس کا افئیر چل پڑا۔۔۔ اور نازو نے ادھر ماسٹر کیا ادھر اُس کی شادی ہو گئی۔۔۔ آج کل نازو اور اُس کامیاں امریکا کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور وہیں کسی ادارے سے منسلک ملازمت میں مشغول ہیں۔ جمی چونکہ جیمنائی کے برج میں پیدا ہوا تھا۔۔۔ لا اُبالی مزاج کا لڑکا تھا۔ می اُس کے بارے پریشان رہا کرتیں۔۔۔ کہ اُن کے علم کے مطابق یہ کسی ایک لڑکی سے نباہ نہیں کر پائے گا۔

فلٹریشن اس کے مزاج کا حصہ ہے۔۔۔ عملی زندگی میں کامیاب رہے گا لیکن ازدواجی زندگی میں ناکامی اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گی۔۔۔ جمی نے می کے سارے وسوسوں کو اک سرے سے رد کرتے ہوئے اپنی خالہ زاد بہن یعنی می ہی کی چھوٹی بہن کی لڑکی سے

شادی کر کے تمام کر دیا۔۔۔ وہ نہ صرف ایک اچھا بزنس مین بن گیا ہے۔ گارمنٹس کے کاروبار میں ترقی کے ساتھ اب وہ اپنی گارمنٹ فیکٹری لگانے کے بارے میں تیاریاں کر رہا ہے۔۔۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ جی جس کے بارے میں می ساری عمر پریشان رہیں، ہم تینوں بہن بھائیوں میں مالی طور پر سب سے کامیاب ہے۔ میں اب بھی اُسے تنگ کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں۔۔۔

”جی۔۔۔ تیری فلٹیشن کا کیا رنگ ہے۔۔۔؟“

اور وہ جواب میں ہنس کر یہ کہا کرتا ہے۔۔۔

”بھائی پتا نہیں می کو مجھ میں کیا نظر آتا رہا۔۔۔ یہاں تو جب تمھاری بھابی مجھ پر کبھی نظر التفات کرتی ہیں تو میں حیران ہو جاتا ہوں۔۔۔ زندگی میں تو کسی لڑکی نے لفٹ نہیں کرائی۔۔۔ ایک می ہی کی نظر میں۔۔۔ میں دنیا بھر کا سب سے بڑا فلرٹ رہا۔۔۔“

جب کبھی ہم تینوں بہن بھائی اکٹھے ہوا کرتے تو می پاپا کی باتیں ہوتیں اور اس میں ہمیشہ می کے ستاروں کا علم ضرور بحث میں آتا۔۔۔ کس طرح می ہر کام سے پہلے اپنے ستاروں کے علم سے مدد لیا کرتیں اور کس طرح وہ شدت سے اپنے فلسفے میں یقین رکھتی تھیں۔۔۔ کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ ستاروں کی گردش کے تابع ہے۔۔۔

”ناز و تیری شادی کے بارے تو می کہا کرتی تھیں۔۔۔ پتا نہیں میری بچی کا کیا ہوگا۔۔۔؟“

اور ناز و ہنستی ہوئی کہتی۔۔۔

”کوئی شادی کرے گا بھی یا نہیں۔۔۔ جی تمھیں ایک مزے کی بات بتاؤں یونیورسٹی میں شادی کے دو برس کے بعد ایک دن مجھ سے ملنے ایک خاتون چلی آئیں۔۔۔ اور مجھ سے والدین کے بارے میں دریافت کرنے لگیں۔۔۔ مجھے شک ہوا اور میں نے اُنھیں اپنے شوہر سے ملوانے کا کہا تو وہ اک دم بول پڑیں۔۔۔ بیٹی میں تو اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے تمھارے پاس آئی تھی۔۔۔ مجھے علم نہ تھا کہ تم شادی شدہ ہو۔۔۔ اور سخت مایوسی کی حالت میں تقریباً پیر پٹختی ہوئی واپس چلی گئیں۔۔۔“

کچھ بھی ہومی اپنے گھر شوہر اور تینوں بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔۔۔ شاید ستاروں کا علم اُن کے لاشعور میں بے ہوئے کسی پرانے خوف کا حصہ تھا یا پھر وہ اسے اپنے لیے بطور ڈیفنس کے استعمال کیا کرتی تھیں۔۔۔ ہم سب ہی اکثر می اور پاپا دونوں سے پوچھتے:

”اچھا می تو یہ بتائیے کہ اگر آپ ستاروں کے بارے میں اتنے شدمد سے یقین رکھتی ہیں تو اپنی شادی پر ان کا سہارا کیوں

نہیں لیا۔۔۔“

اور اس کے جواب میں وہ بس مسکرا کر رہ جاتیں۔۔۔ بہت ہوا تو یہ کہہ کر چپ ہو جاتیں۔۔۔

”بھئی وہ معاملہ ہمارے بزرگوں کا تھا۔۔۔ اب تمھاری طرح ہم اتنے بے شرم نہیں تھے۔۔۔ کہ ہر بات پر ماں باپ

سے بھی جرح شروع کر دیتے ہو۔۔۔۔۔“

لیکن ہم تینوں بہن بھائیوں کے لیے ہماری ممی اور پاپا مثالی ماں باپ ثابت ہوئے تھے۔۔۔ کیا تھا جو انھوں نے ہمیں نہیں دیا تھا۔۔۔ اچھی تعلیم و تربیت۔۔۔ بھرپور اور اعتماد زندگی گزارنے کا قرینہ۔۔۔ اور اس قدر محبت و شفقت۔۔۔ جس کی چھاؤں نے کبھی زندگی کی تمازت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔۔۔ یہ کمال کی بات ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ممی کے سارے وسوسوں کے باوجود نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ تینوں ہی شادی کے بعد اپنے گھر بچہ و خوبی چلا رہے تھے۔۔۔ ایک ممی تھیں جو اس کے باوجود ہمیشہ کی طرح اب بھی فکر مند نظر آتیں۔۔۔

ہر سال یونیورسٹی کی طرف سے ممی کے ڈیپارٹمنٹ کے ایک دوٹو و ضرور ہوتے تھے۔۔۔ اتفاق ہو گا کہ ممی نہ جائیں۔۔۔ ہم سب مطمئن رہتے کہ ممی ہر ٹو و پر جانے سے پہلے اپنے ستاروں کے علم سے مدد لے لیا کرتی تھیں۔۔۔ مگر اس آخری ٹو و کرنے جس میں فزکس کے سارے ڈیپارٹمنٹ نے جانا تھا سارے گھر کو پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔ ممی ہمیشہ اپنے دیے ہوئے وقت پر واپس لوٹا کرتیں۔۔۔ لیکن اس مرتبہ ٹو و سے واپسی میں تاخیر ہو گئی تھی۔۔۔ ہم سب نہ صرف منتظر تھے بلکہ پریشان تھے کہ سوات کے کالج سے فون پر پاپا کو پیغام ملا کہ یونیورسٹی کی دو بسوں میں سے ایک بس بلندی سے بے قابو ہو کر گہرائی میں بہتے ہوئے دریا میں جا گری ہے۔۔۔ اطلاع کے مطابق بچنے والوں میں سے پانچ طالب علم ایک لیکچرار اور ممی خوش نصیبوں میں سے تھیں۔۔۔ یہ سنتے ہی پاپا ہم سب کو لے کر سوات کی طرف چل پڑے۔۔۔ جب ہسپتال جا کر ممی کی شکل دیکھی تو چین آیا۔۔۔ بیٹوں اور پلاسٹر میں بندھی ہماری ممی اپنے ارد گرد سے غافل تھیں۔۔۔ وہ کئی دن بے ہوش رہیں۔۔۔ ہوش میں آئیں تو ہم سب کو اپنے پاس دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔۔۔ پاپا کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی ہمیں چپ رہنے کو کہتے تھے اور خود سخت اعصابی تناؤ کا شکار تھے۔۔۔ ممی کے سر میں چوٹوں کے علاوہ ایک بازو اور ایک ٹانگ میں پنڈلی کی ہڈی کا فریکچر تھا۔۔۔ ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہم اتنے خوفناک حادثے کے بعد اپنی ماں کو زندہ سلامت دیکھ رہے تھے۔۔۔

اس حادثے میں بائیس افراد بشمول طالب علم ڈرائیور اور دو لیکچرار ہلاک ہوئے تھے۔۔۔ لیکن جن کی لاشیں دریا سے علاقے کی پولیس اور مقامی لوگ نکالنے میں کامیاب ہو سکے وہ سترہ تھیں۔۔۔ سلامت بچ جانے والوں میں ممی کے علاوہ ایک لیکچرار اور پانچ طلبہ تھے۔۔۔ بچ جانے والے زخمیوں میں سے دو کی حالت کو تشویش ناک بتایا گیا تھا۔۔۔ پانچ افراد کی لاشیں انٹھک کوشش کے باوجود نہ مل سکیں۔۔۔ گھر آ جانے پر بھی ممی مسلسل تین ماہ تک صاحب فراش رہیں۔۔۔ خدا خدا کر کے پہلے بیساکھیوں اور پھر اسٹک کے سہارے چلنا شروع کیا۔۔۔ ممی کے صحت یاب ہونے پر ہمیں معلوم ہوا کہ گھر کی اصل رونق تو ممی ہی ہیں۔۔۔ جب تک وہ ٹھیک نہ ہوئیں کسی نے بھی اُن سے ستاروں کے علم کی بات نہ کی۔۔۔ مکمل طور پر صحت یاب ہو جانے کے بعد ایک دن وہ کھانے کی میز پر ہم سے خود ہی مخاطب ہوئیں اور پاپا سے بات کرتے ہوئے کہنے لگیں۔۔۔

”آپ جانتے ہیں۔۔۔ میں تو کوئی قدم بغیر اپنے علم کے باہر نہیں نکالتی۔۔۔ اس بار بھی جب میں کالج کے بچوں کے ٹوڈر انچارج کی حیثیت سے شمالی علاقوں کا دورہ کرنے جا رہی تھی تو میں پوری طرح سے مطمئن تھی کہ سب ٹھیک ہوگا۔ بس ایک رات کے خواب نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔۔۔ جس میں مجھے بار بار اپنے بچوں کو گنتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔۔۔ اور ہر بار کی گنتی کے دوران۔۔۔ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی۔۔۔ جس کی وجہ سے مجھے از سر نو گنتی شروع کرنی پڑ جاتی تھی۔۔۔ جیسے میں گنتی کر چکنے کے باوجود ذہنی طور پہ مطمئن نہ تھی۔۔۔ لیکن اس غیر معمولی احتیاط کو اپنی عادت سمجھتے ہوئے میں نے آپ سے یا بچوں سے اس خواب کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔۔۔ کہ اس وجہ سے آپ سب بلا وجہ پریشان ہو جاتے اور ممکن ہے میرا اس ٹوڈر پر جانا ملتوی ہو جاتا۔۔۔ جب ہوش میں آئی تو آپ سب کو اپنے پاس پا کر کس قدر خدا کا شکر کیا۔۔۔ بس اب میں نے ستاروں کی علم کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔۔۔ وہ جسے چاہتا ہے خوفناک سے خوفناک حادثے میں بھی بچا لیتا ہے۔۔۔ آپ بالکل صحیح کہا کرتے تھے۔۔۔ اس حادثے نے مجھے بدل کے رکھ دیا ہے۔۔۔“

ہم سب اپنی می کو تصویر حیرت بنے دیکھ رہے تھے۔۔۔ واقعی اس حادثے نے می کی سوچ میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔۔۔ اب وہ ستاروں کے علم پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا بیشتر وقت ہم بہن بھائیوں کے ساتھ صرف کرتیں۔ پاپا سے باتیں کرنے میں خوشی محسوس کرتیں۔۔۔ یا پھر اپنے کالج کے لیکچر کی تیاری میں مصروف رہا کرتیں۔۔۔ می اس حادثے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ مثبت رویہ اختیار کر چکی تھیں۔۔۔ اب اگر اتفاق سے کوئی اُن سے جوتش یا ستاروں کے بارے میں کوئی سوال کر دیتا تو می نہایت خوش اسلوبی سے سوال کرنے والے کو ٹال دیا کرتیں۔۔۔ ہم تینوں بہن بھائی ہی نہیں پاپا بھی می کے اس رویے پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھے۔۔۔ اب ان کی فکر اور سوچ کا دائرہ اپنے گھر بار اور بچوں تک مرکوز ہو گیا تھا۔۔۔ یعنی اگر سادہ لفظوں میں یہ کہہ دیا جائے۔۔۔ کہ می اب ایک مکمل طور پر پریکٹیکل انسان کے پیکر میں ڈھل گئی تھیں۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ زندگی میں رونما ہونے والے بعض حادثات مختلف انسانوں پر مختلف تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔ حادثے کے شاید ایک ہی برس بعد می ایک رات ایسی سوئیں کہ صبح ہم سب کو روتا چھوڑ گئیں۔۔۔ قدرت نے اُن کی قسمت میں اپنے میاں اور تینوں بچوں کی موجودگی میں انتہائی سکون سے مرنا لکھا تھا۔۔۔

ورنہ جس حادثے سے بچ کر نکلی تھیں۔۔۔ اُس میں کتنے ہلاک اور کتنے ہی بد نصیبوں کی لاشیں بھی دریا سے برآمد نہ کی جاسکیں۔۔۔ لیکن می کے حادثے اور یوں اچانک موت نے پاپا کی زندگی کو یکسر بدل کے رکھ دیا تھا۔۔۔ پہلے اُنھوں نے

کورٹ جانا چھوڑ دیا۔۔۔ پھر وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے۔۔۔ اور آہستہ آہستہ ہم بہن بھائیوں سے بھی بولنا ختم کر دیا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے پاپا کی شاندار شخصیت ہر وقت خلا میں تکتے رہنے والے ایک پیکر میں بدل کے رہ گئی۔۔۔ نہ اب وہ باقاعدگی سے غسل کرتے تھے۔۔۔ نہ پہلے کی طرح ڈریس اپ ہوتے۔۔۔ ہم اُن کے منہ سے علم و دانش کی باتیں سننے کو ترس گئے تھے۔۔۔ لیکن می کی

موت نے جیسے انھیں دنیا میں رہتے ہوئے ہی تارک الدنیا کر دیا تھا۔۔۔ اب وہ بیشتر وقت اپنے کمرے میں بیٹھے کتابیں پڑھتے رہتے۔۔۔ ایک دن گھر میں سوائے جی اور پاپا کے کوئی اور نہ تھا۔۔۔ جی نے خاموشی سے جا کر دیکھا تو پاپا کی گود میں ممی کی ہور و سکوپ رکھی تھی۔۔۔ ہم سب یہ سمجھتے رہے تھے کہ وہ مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔۔۔ جی کے بتانے پر معلوم ہوا کہ وہ ہر وقت اس ہور و سکوپ کو تکتے رہتے ہیں جو درحقیقت ممی کی کتابوں کے ذخیرے میں انھیں مل گئی تھی۔۔۔ جب جی نے انتہائی پیار سے پاپا سے پوچھا:

”پاپا۔۔۔ آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔۔۔؟“

تو پاپا نے سر اٹھا کر جی کی طرف دیکھا اور ایک مدت کے بعد اُس سے بولے:

”بیٹے۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھاری ممی کا ستارہ کینسر تھا۔۔۔ لیکن وہ انتہائی بلندی سے بس کے دریا میں گرنے کے باوجود بچ گئیں۔۔۔ اور پھر جب موت نے انھیں ہم سب سے جدا کیا تو وہ آرام اور سکون کے ساتھ اپنے بستر میں سو رہی تھیں۔۔۔ میں اس ہور و سکوپ میں یہ دیکھتا رہتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔۔۔۔۔؟“

جس پر جی نے کہا۔۔۔

”پاپا آپ تو ستاروں کے علم میں یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔۔۔ اور نہ اس طرح سوچتے تھے کیا اب آپ کی فکر بدل گئی

ہے۔۔۔۔۔؟“

”بیٹے۔۔۔ اب تک جس پر یقین تھا وہی نہیں رہا۔۔۔ پھر کیا فکر اور کیسی سوچ۔۔۔۔۔؟“

اگلی صبح ناشتے کے لیے سب ہی پاپا کے منتظر تھے لیکن وہ نہ آئے۔۔۔ جب میں اپنی بیوی کے ہمراہ اوپر اُن کے کمرے میں پہنچا تو پاپا کو بیڈ کے نزدیک فرش پر بیہوش پڑے پایا۔۔۔ سب کچھ چھوڑ کر پاپا کو ہسپتال لے گئے۔۔۔ وہ دو روز بیہوشی کی حالت میں پڑے رہے۔۔۔ لگتا تھا رات کو کسی وقت سوتے ہوئے اٹھے تھے لیکن چکر اکر گر پڑے اور وہیں بیہوش ہو گئے۔۔۔ ڈاکٹروں کے بقول اُن کی شوگر کم ہو گئی تھی۔۔۔ ڈیپریشن کے علاج کے لیے ہسپتال میں دو ہفتے داخل رہے۔۔۔ اور جب گھر آئے تو لگتا یوں تھا کہ وہ پہلے کی نسبت خاصے بہتر ہو گئے ہیں۔۔۔ ہسپتال میں سائیکیٹر سٹ کے علاج نے اُن کے ہاں نمایاں تبدیلی پیدا کی تھی۔۔۔

ممی کی برسی کے موقع پر ہم تینوں بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔۔۔ ناز بھی اس بہانے امریکا سے اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی تھی۔۔۔ پاپا سارا دن ہم سب کے ساتھ ایک مدت کے بعد مل کر بیٹھے تھے اور ممی کے حادثے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے انھیں باتیں کرتے اور ناز و کے بچوں سے ہنستے اور کھیلتے دیکھا تھا۔۔۔ ہم تینوں ہی ممی کی کمی کو محسوس کرنے کے باوجود پاپا کے اس مثبت رویے پر خوش تھے۔۔۔ میں تو اس تبدیلی کو ناز و کے اچانک آ جانے پر تعبیر کر رہا تھا۔۔۔ کیا پتا تھا کہ پاپا اُس چراغِ سحری کی مانند لودے رہے ہیں۔۔۔ جسے ہماری زندگی سے اچانک بھڑک کر غائب ہو جانا تھا۔۔۔

اب یوں احساس ہوتا ہے۔۔۔ جیسے وہ واقعی صرف نازو کے آنے کے منتظر تھے۔۔۔ نازو کے آنے پر مجھے اُن کے چہرے میں جو چمک اور شگفتگی کا رنگ جھلکتا دکھائی دیا تھا۔۔۔ وہ برسوں بعد رونما ہوا تھا۔۔۔ جیسے وہ بس نازو سے مل لینے کے خواہاں تھے۔۔۔ اور اُنھوں نے مُمی کی برسی کے دن ہی اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ برسی کے دن چونکہ گھر میں خاصی مہمان داری رہی تھی۔۔۔ اس لیے سب ہی اگلی صبح معمول کے برعکس تاخیر سے اٹھے۔۔۔ ناشتہ کافی دیر سے ہو رہا تھا۔۔۔

”ارے بھئی پاپا کو ناشتہ دیا کسی نے۔۔۔۔“

میں نے باورچی سے معلوم کیا۔۔۔

”سر میں ایک بار گیا تھا لیکن وہ شاید سو رہے ہیں۔۔۔۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔۔۔“

میں یہ سنتے ہی اُن کے بیڈروم کی طرف لپکا۔۔۔ باورچی کے مطابق۔۔۔ واقعی پاپا کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔۔۔ جو خلافِ معمول تھا۔۔۔ جُمی اور میں نے جب دروازے کو دھکے سے کھولا۔۔۔ تو پاپا کو ایک بار پھر اپنے بستر سے نیچے فرش پر پڑے پایا۔۔۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیبل لیپ فرش پر گرا ہوا تھا۔۔۔ اُس کا بلب ٹوٹا ہوا کرچیوں کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے پاپا کے ہاتھ لگنے سے لیپ گرا تھا۔۔۔ یا پھر لیپ سے انھیں الیکٹرک شاک لگا تھا۔۔۔ اور وہ اس حالت میں فرش پر گر پڑے تھے۔۔۔ کچھ پتا نہیں چل سکا۔۔۔ معلوم نہیں وہ کسی وقت اٹھے۔۔۔ اور دروازہ انھوں نے کیوں بند کیا۔۔۔؟

ہم اسی حالت میں انھیں ہسپتال لے کر دوڑے۔۔۔ لیکن سب بے معنی تھا۔۔۔ ڈاکٹروں نے مایوسی سے ہمیں دیکھا۔۔۔ اُن کے مطابق پاپا کی موت کو کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔۔۔ مُمی کی انتقال کو سات برس ہو چکے۔۔۔ اور پاپا کو ہمیں چھوڑے چھ سال ہونے کو آ رہے ہیں۔۔۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں میرے ارد گرد موجود ہیں۔۔۔ جب کبھی میں اپنے بچوں کو کچھ سمجھانے لگتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں نہیں میرے پاپا بول رہے ہیں۔۔۔ جب کبھی تاریخ کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔ تو مجھے جانے کیوں پاپا کے محبوب کردار جلال الدین خوارزم کا نام یاد آتا ہے۔۔۔ جسے پاپا ہمیشہ اُس کی بے مثال جرأت کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔۔۔ کہ اُس نے چنگیز خان کی پیچھا کرتی ہوئی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بجائے پہاڑ کی بلندی سے گھوڑے سمیت نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے دریا میں پھلانگ لگا دی تھی۔۔۔ معلوم نہیں پاپا نے کیوں زندگی سے منہ موڑ کر دریائے عدم کا رخ کر لیا۔۔۔؟

ہم سب بہن بھائی مل کر بیٹھتے ہیں تو مُمی پاپا کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ بات شامل ذکر رہتی ہے کہ مُمی ایک انتہائی خوفناک حادثے سے بچ گئیں لیکن اپنے گھر میں گہری نیند سوتی ہوئی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔ پاپا ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔۔۔ بہتر ہو گئے تھے۔۔۔ اور یوں لگتا تھا جیسے دوبارہ نارمل کی طرف واپس آ رہے ہیں۔۔۔ کہ ایک رات حادثے کی نذر ہو کر چپ چاپ چلے گئے۔۔۔ ستاروں کا علم نہ مُمی کو بچا سکا۔۔۔ نہ ہوروسکوپ پاپا کے کچھ کام آئی۔۔۔۔

کل میں اپنے بینک کے آفس میں بیٹھا کچھ کلائنٹس سے ایک بزنس کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔۔۔ جب میرے سامنے بیٹھی ہوئی

ایک خاتون نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے۔۔ اچانک سوال کر دیا۔۔۔

”جہانزیب صاحب۔۔ کیا آپ ہو روسکوپ میں یقین رکھتے ہیں۔۔۔؟“

اور میں اچانک اس غیر متوقع سوال کو سن کر جیسے گیارہویں منزل سے نیچے آگرا۔۔۔

”میں سمجھ نہیں آپ کا مطلب۔۔۔۔“

اور خاتون کے ساتھ بیٹھے ہوئے اُن کے شوہر نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

”جہانزیب صاحب۔۔۔ ہماری بیگم ہر کام کو شروع کرنے سے پہلے ستاروں کے علم سے ضرور مدد لیتی ہیں۔۔۔ آپ

ٹھہرے ایک مینکر۔۔۔ آپ کو بھلا ستاروں کے علم سے کیا شغف ہو سکتا ہے۔۔۔؟“

میں مزید کچھ کہہ نہ سکا۔۔ اور کہتا بھی کیا۔۔۔ انھیں کیا بتاتا۔۔۔ کہ ہو روسکوپ سے ہمارا کتنا گہرا تعلق رہ چکا تھا۔۔۔



ساتواں دھوون

اب جب بودی بابا اپنے بستر کو الگنی پر پھیلا نے چھت پر جاتے تو دائیں بائیں کم ہی دیکھتے۔ ’شب بخیر‘ والے دُہرے بچھونے کو تو جیسے تیسے اکہرا کرتے ہوئے دھوپ میں ڈال ہی دیتے کہ کاٹوں گھاٹ کے کھائے کو بیس تیس برس بعد بھی جب سریر نتھارنے نچوڑنے لگتا تو دونوں ہاتھ کہنیوں پر یوں تن جاتے جیسے تکبیر کے لیے اٹھے ہوں؛ مگر رات بھر کی حلیف رضائی، دن کے وقت زور آزمائی پر اتر آتی۔ وہ ایک طرف سے رضائی کے دو کناروں کو ملاتے تو یہ دوسری طرف سے ڈھلک جاتی اور اُن کے پیروں تک لڑھکتی آتی۔ روئی کا پانچ سیر وزنی گولاسوا من کا باٹ بنا اُن کے قریب آ کر گرتا تو الگنی کی ایک کھونٹی پر بیٹھی چڑیا اڑ کر برساتی کی چھت پر چلی جاتی اور دوسری کھونٹی سے بندھا ہوا پرانا ازار بند جھونے لگتا جیسے ایک دم بودی بابا سے ہمدردی جاگ اٹھی ہو اور اُس کی یہ ’حق ہو، حق ہو‘ ہی اُس وقت اُن کی مشکل آسان کر سکتی ہو۔ وہ بایاں ہاتھ بڑھا کر گرتی ہوئی رضائی کو بچانے لگتے تو دائیں ہاتھ پر اوپر تلے پڑے ہوئے دو کناروں کا منہ کھلتا ہوا کوٹھے کی مٹی کو چاٹنے لگتا۔ اب الگنی پر جھومتا جھولتا ’شب بخیر‘ والا بچھونا ہی باقی رہ جاتا۔ وہی چڑیا ایک بار پھر اڑتی ہوئی آتی اور کھونٹی کے مڑے ہوئے لوہے پر اپنے پنجے جمالیتی۔ دوسری کھونٹی سے ’جامہ، جامہ، اے صاحب جامہ‘ کی آتی ہوئی آوازیں بھی رکنے لگتیں کہ جیسے صاحب جامہ سے مزید چھیڑ چھاڑ کل تک کے لیے روک دی گئی ہو۔ بودی بابا رضائی پر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے پیٹھروں سے گرد جھاڑنے لگتے۔ اُن کے گلے کی دھونکی میں سے اپنے آپ خرخر کرتی پھونکیں بھاپ بن کر نکلنے لگتیں۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا کہ لعاب کا نم لحاف کے اندر سر پر جا پڑتا، جیسے جھاگ کے بلبے گاڑھے بھورے کاٹن پر ادھر ادھر ابھرا آئے ہوں اور باقاعدہ سانس بھی لے رہے ہوں۔ تب اُن کی مریل پھونکی دم لیتی اور وہ گلے میں پڑے مفکر کے ساتھ اُن سفید موتیوں کا گلا دبانے لگتے۔ جھاگ کے وہ بلبے پھٹ کر پانی کی لکیر میں بدل جاتے تو وہ زیادہ پریشان ہو جاتے۔ سوچتے کہ رات کا گلیا ابھی خشک نہیں ہوا، اُس پر یہ نئی سیلن کہاں سے ٹپک پڑی۔ سردیاں آتیں تو جیسے اُن کی جان بھی سکڑ سمٹ کر آدھی رہ جاتی۔ ہر نماز میں اُن کی یہی دعا ہوتی کہ اس عمر میں بستر اگر گلیا ہو بھی جائے تو بس اتنا کہ دھوپ کے ہوتے ہوتے سوکھ جائے اور اگر اوڑھنا بچھونا دونوں نہیں تو کم از کم بچھونا ہی رات میں کمر ٹکانے کے قابل ہو جائے۔ وہ خدا سے سورج کی بھیک مانگتے تو ایک ہی سانس میں مانگتے چلے جاتے کہ جیسے سانس ٹوٹا تو دعا بھول جائے گی۔ مسجد میں اُن کی دعا کبھی برابر میں بیٹھے ہوئے نمازی کے کان میں پڑتی تو وہ اُنھیں لقمہ دینے لگتا: ”بودی بابا تم اتنے لالچی ہو گئے ہو کہ سارے شہر کا سورج اپنی جھولی میں بھر کر بھی، ’اور مولا اور‘ کرتے رہتے ہو!“ وہ شخص اُن کی چھت کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا: ”تمہارے جیسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں اس شہر میں، جنہیں دھوپ کی ضرورت تم سے زیادہ ہے..... کبھی بس مولا بس کرنا بھی سیکھو!“

مگر اب تو ”اور..... مولا اور“ سے بھی اُن کا کام نہ بنتا تھا اور تنبیہ کا وہ لقمہ اُن کے حلقوم میں ذرا سی کھانس کھنکار پیدا کرتا ہوا گم ہو جاتا۔ بودی بابا دبے لفظوں میں کہتے: ”جا عبد لکریم، تیرا زہر بند ہو جائے، ساری دعا کا ستیاناس کر دیا“، سینے پر پھونک مارتے ہوئے اٹھتے اور الماری کھول کر جز دان والے اور بغیر جز دان والے قرآن مجید دیکھنے لگتے۔

ادھر بودی بابا چھت پر گری ہوئی رضائی کو جھاڑتے ہوئے رکتے، کچھ دیر آسمان کی طرف دیکھتے اور سورج کو آنے جانے کا نیا راستہ بتانے لگتے: ”کیا تو ہر شام مغرب میں ڈوب مرنے کے بجائے میرے بستر میں غرق نہیں ہو سکتا..... اور صبح صبح یہیں سے برآمد ہوا کرے تو کیا بگڑے گا تیرے مشرق کا؟“ اگلا خیال اُن کے ذہن میں یہ آتا کہ اگر مشرق مغرب دریافت ہی نہ ہوئے ہوتے تو کیا تھا: ”تو پھر تم نماز کے لیے کس طرف منہ کرتے اور کس طرف پیٹھ؟“

تب وہ آسمان پر جمی ہوئی نگاہ ہٹا کر گلے کی ہڈی پر لگی ہوئی اوئی مفلک کی گرہ کو ذرا ڈھیلا کرتے اور آنکھوں پر پڑے ہوئے ٹوپی کے پھندنے کو ہٹانے کے لیے گردن کو یوں جھٹکتے کہ اُن کا سدھایا ہوا پھندا جھٹ سے دائیں کان تک سرک جاتا۔ دماغ کے اندر کا گناہ ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ پہنچ جاتا اور وہ سمجھتے کہ دماغ سے نکل چکا ہے۔ پھر وہ ٹوپی کو سر سے ذرا اونچا کر کے دوبارہ سر پر رکھتے تو ایک لمحے کے لیے اُن کے ماتھے کی محراب نمایاں ہو کر غائب ہو جاتی۔ فجر کے وقت کی نکالی ہوئی مانگ سر کے وسط سے ادھر ادھر ہو چکی ہوتی، جس سے وہ بے خبر ہوتے۔ اب بودی بابا رضائی اٹھا کر دوبارہ الگنی پر پھیلائے لگتے۔ حصوں، بخروں میں بیٹھ ہوئی ایک لمبی آہ اُن کی پسلیوں سے نکلتی ہوئی کان کے پردوں پر کہرے کی طرح گرتی اور پھر جیسے برف کی گولیوں میں بدل جاتی۔

عبدالکریم گرم حمام کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا: ”میری باری ہے“۔ بودی بابا بیچ پر بیٹھے رہ جاتے: ”تو اوپر سے لکھوا کر لایا ہے باری..... کس نے لکھ کر دی ہے تجھے باری؟“ حمام کی چٹنی بند ہو جاتی اور گرم پانی کے چھینٹے اُن کے پیروں پر پڑنے لگتے تو وہ ایک پاؤں کی ایڑی سے دوسرے پاؤں کی انگلیوں کو کھجانے لگتے۔ ساتھ ہی بودی بابا اخبار کی آڑ میں منہ چھپائے ’میری باری‘، ’میری باری‘ کرتے رہتے، جیسے اُس دن کی شہ سرنخی ہی ’میری باری‘ ہو۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نظر حمام پر ڈالتے۔ گردن کو ذرا اوڑھ کر ہاتھ کرتے ہوئے سر کو جھکاتے، جس سے بیچ کی لکڑی پر لگی ہوئی اُن کی پیٹھ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتی۔ وہ دروازے کی چٹکی درز سے اندر جھانکتے تو عبدالکریم کے کٹنوں پر نظر جا پڑتی۔ وہ اٹی ایڑی سے دروازے پر ہلکی سی چپت لگاتا اور پانی سے بھرے ہوئے منہ کے ساتھ اونچی آواز میں بولتا: ”زیادہ جلدی ہے تو جا کاٹوں گھاٹ پر چلا جا!“ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے عبدالکریم کو غوطہ لگ جاتا: ”جا..... گ..... ہا..... ٹ..... پر..... چلا..... جا!“ بودی بابا گھاٹ کا گلا کھتے ہوئے دیکھتے تو اُن کے کانوں کی برف ایسی میخ لویں سرخ ہونے لگتیں۔ سینے پر ٹھونگ مارتے، جیسے کہہ رہے ہوں: ”وہ تو میرے اندر ہے“۔ تب وہ کھڑکھڑ کرتے اخبار کو جھولی میں پھیلا کر اندرونی صفحوں کو یوں دیکھنے لگتے جیسے شہ سرنخی کا بقیہ حصہ ڈھونڈ رہے ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ کس قدر اندر ہے!

ہمسایے کی چھت کا بنیر ابنے لگا تو کچھ ہی دنوں میں الگنی پر بھی پردہ پڑ گیا۔ اب ادھر کی پھنکیں پھنکاریں ادھر ہی رہ جاتیں۔ صرف تھاپڑیوں کے شور سے پتا چلتا کہ دوسری طرف کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی بنیرے کی اینٹوں سے کان لگا کر سنتا تو اندازہ ہوتا کہ ہے تو پھونکنی سے نکلتی ہوئی پھوں پھوں، مگر یوں کہ جیسے کوئی وظیفہ گوا اپنی فضا ادا کر رہا ہو اور وقفے وقفے سے کہہ رہا ہو: ”جو پڑھا وہ اُس کو پہنچا دینا..... جو ابھی پڑھنا ہے، اُس کی مہلت دینا!“

ایک ایک دانے کا شمار ہوتا رہتا، پھنکاریوں کے اندر ہی اندر حلقوم سے نکلتی ہوئی یہ دعائیہ خرخر اہٹ ہر تیسرے چوتھے دن بنیرے کے دوسری طرف سے سننے میں آتی رہتی۔ پھر لنگوٹا کیے ہوئے ایک بودی بھاگتا ہوا آتا اور بودی بابا کو اپنی باتوں میں لگا لے جاتا۔ یوں اُن کے سر پر کی سیلن کو بہانال جاتا کہ گلیوں گلیوں سیاہی سفیدی جو چاہے کرتی پھرے۔

”یہ ایک اور یہ دو چادریں شب بخیر والی..... ٹھیک؟ دوسرہا نا پوش..... ٹھیک؟ پیٹیوں، صندوقوں کے اوچھاڑا گلے پھیرے پر..... ٹھیک؟“

چھیم دلہن اپنی کھڑکی سے ایک ایک کر کے دھونے والے کپڑے باہر گلی میں سرکاتی تو اُس کے چاندی کے کنگن آپس میں ٹکرانے لگتے۔ کلائی کوتر چھا کر کے بازو کو سلاخوں سے باہر لے جانے اور پھر واپس اندر کھینچنے میں اُسے مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ پھر کہتی: ”گل ملا کے چار..... گن لو..... اس بار بھی میلے رہ گئے تو آدھے پیسے کاٹ لوں گی..... سن لیا؟“

بودی اپنے پیروں پر گرے ہوئے وہ چاروں کپڑے اٹھاتا، ایک ایک کٹی پر پکی سیاہی سے وہ مار کے بناتا جو اُس نے چھیم دلہن کے لیے مخصوص کر رکھے تھے اور زیر لب چھی م دلہن کہتا ہوا نام کی ایک ایک ریزر برکالطف اٹھاتا، حساب اپنی کاپی پر درج کر لیتا۔ چھیم دلہن قلم کی حرکت سے اندازہ ہو جاتا کہ بودی مار کے کی آڑ میں اُس کا نام لکھ رہا ہے۔ کہتی: ”نام ہی لکھنا ہے تو مالک کا نام لکھو، میرا کیوں لکھتے ہو؟“ تو بودی اُنھیں کنیوں کو ایک بار پھر تھیلی کی اوٹ میں لے کر اُنھیں مارکوں کے برابر میں دو تین لکیریں کھینچ دیتا اور اوپر نیچے ٹمکنے لگتا ہوا کہتا: ”آگیا مالک کا نام بھی!“ چھیم دلہن ڈوپٹے کے ایک کنارے کو منہ میں دبالیٹی اور یوں سرگوشی کرنے لگتی جیسے کوئی راز اگلنا چاہتی ہو: ”نیل کے چٹاخ نکال کر..... استری کچے کونلوں کی نہ ہو!“ وہ چھیم دلہن کا مال اپنی بڑی بچگی میں ٹھونست جاتا اور چھیم دلہن بولتی جاتی: ”سرہانوں پر نئی رالیں نہ ٹکالانا!“

بودی کھسیانا سا ہو جاتا جیسے کوئی چور سر عام اپنی چوری پکڑے جانے پر سزا کے ڈر سے ادھ موہا ہو گیا ہو۔ کہتا: ”سن لیا چھیم دلہن، سن لیا..... بودی رال کے داغ نکالنے والا ہے، ٹکانے والا نہیں، دلہن!“ چھیم دلہن سنتی تو کہتی: ”بودی تم مجھے سیدھے سیدھے شیم النسا کہا کرو، چھیم دلہن کیوں کہتے ہو اور آج تو تم نے حد ہی کر دی ہے چھیم دلہن بھی نہیں، بے شرموں کی طرح دلہن ہی کہہ ڈالا ہے۔ تم باز نہ آئے تو میں بھی تمہیں بودی نہیں بودی بابا کہوں گی اور تمہاری بستی میں مشہور کروادوں گی بودی بابا، بودی بابا۔ پھر کوئی لڑکی تم سے شادی کے لیے تیار نہ ہوگی۔ بولو، کنوارے مرنا پسند کرو گے یا اپنی زبان کو لگام دو گے؟“ اُس وقت چھیم دلہن کے ہونٹوں کے شکنجے میں آیا ہوا ڈوپٹے کا کنارہ آزاد ہو جاتا۔ اُس کی گردن پر سرخ ڈوری سے بنی ہوئی لکیر دکھائی دینے لگتی جیسے ابھی ابھی گلو بند اتار کر آئی ہو۔

بودی اپنی کاپی دائیں جیب میں ڈالتا اور قلم کو کان کے ساتھ ٹکاتے ہوئے یوں ظاہر کرتا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ کہتا: ”اس بار سات پانیوں میں دھوؤں گا تو پچھلی کسریں بھی نکال دوں گا، تو فکر نہ کر..... اب عید پر ہی بچھانا شب بخیر والی چادریں..... مالک کو خوش کر دینا!“

چھیم دلہن کھڑکی بند کر کے سوچنے لگتی: ”عید پر کیوں، چھلے پر کیوں نہیں؟..... مالک زیادہ خوش ہوگا“..... پھر وہ شرماتی ہوئی کمرے میں چلی جاتی اور پانگوں پر پڑے ہوئے گدے جھاڑنے لگتی۔ بودی مارکوں اور ٹمکنوں کو مصری کی ڈلیوں کی طرح زبان پر رکھے کھڑکی کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا: ”چھیم، جیسے پانی کی چھپا چھپ، دلہن، جیسے میرے پٹلوں کی دھپ دھپ..... ام ام چھیم دلہن پوری کی پوری چھپ چھپ، دھپ دھپ..... یہ عورت نہ ہوتی تو گھاٹ ہوتی..... کاٹواں گھاٹ، میلے کچیلوں کو ڈبوتا، نچوڑتا، نتھارتا ہوا، مالک کا گھاٹ..... صاف ہی صاف، پاک ہی پاک!“

اب اُدھر گلی میں بلکرامی بووا کے بین بلند ہونے لگتے: ”ارے میں نے گھاٹ کیوں نہ بدل لیا، یہ مووا جس پانی میں نو بیاہتوں کے بچھونے دھوتا ہے، اُسی میں میلاد کی چاندنیاں بھی ڈال دیتا ہے۔ نتھارے نچوڑے بغیر ہی ایک کا کپڑا تادوسرے پر پھینکتا جاتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا، ہمارے شماروں کے تھیلے دھل رہے ہیں یا سہاگونوں کے سرھانے تیرتے پھرتے اشران کر رہے ہیں۔“ تب بودی زبان پر گھلتی ہوئی شیرینی کو پس انداز کرنے کے چکروں میں ہوتا۔ وہ زبان کو چمکے دے کر سر پر کھڑی رات کے لیے کچھ نہ کچھ میٹھا بچا ہی لیتا۔ اُس وقت غیب سے اگر کوئی ٹھٹھا کرتا ’کنجوس!‘، تو اُسے بہت خوشی ہوتی کہ: ”ہاں میں ہوں کنجوس، تمہیں اس سے کیا؟“ پھر وہ بووا کے قریب آ کر اپنی گھڑی پھینکتا اور کہتا: ”جابدل لے گھاٹ بھی اور کھاٹ بھی، میں تو نہیں بدلوں گا اپنے جدی پشتی طریقے کو۔ چلتے پانی میں دھوتا ہوں، کھڑے میں نہیں، سنا نہیں چلتے پانی پلیدی رکتی نہیں، آگے نکل جاتی ہے اور سترویں قدم پر پاکی میں بدل جاتی ہے!“ وہ گھڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر ’شب بخیر‘ والی چادروں کو تھپتھپاتے ہوئے کہتا ”تیرے پاس ثبوت ہے تو کیس کر دے بودی پر..... تو جیت گئی تو بودی پورے کا پورا کاٹواں گھاٹ کھینچ کر تیرے قدموں میں ڈال دے گا اور خود کہیں منہ کر جائے گا۔“ تب بووا کہتی: ”اور اگر تو جیت گیا تو؟“

”تو تیری باری چھیم دُلھن کے بعد ہی آئے گی، پہلے نہیں!“

”ہونہہ، بڑا آیا باریاں بانٹنے والا!“

وہ اپنی گھڑی کو کھولتے ہوئے کہتا: ”بودی کو سارے مسئلے آتے ہیں بووا، ایسے ہی کوہ ہمالیہ نہیں کا ندھے پراٹھائے پھرتا۔“ پھر وہ گھڑی کو بانہوں کے گھیرے میں لے کر کہتا: ”یہ ہمالیہ..... بووا تو نہیں مانتی تو اپنا گھاٹ بدل لے!“

سب سے اوپر ’شب بخیر‘ والی چادر میں دکھائی دے جاتیں۔

بووا سینے پر ہلکا سا دھتھر مارتے ہوئے کہتی: ”ہائے ہائے گھاٹ بدلنے کہاں نکل جاؤں اس عمر میں..... واپس لنگا جل میں ڈوب مروں؟..... تم تو کہتے ہو بووا دفع دفان ہو اور میری لائن سیدھی ہو!“

”ہاں تو چلی جا، لنگا کون سا دور ہے راج گڑھ سے، راوی کے اُس پار ہی تو ہے، کسی کشتی میں بیٹھ جا، لے جائے گی تجھے نانی کے گھر!“

”میں چلی جاؤں اُس پار اور تم اس پار بیٹھے جیسے چاہو سیاہی کرو، سفیدی کرو!“

بووا کی آواز رندہ جاتی اور بودی موقع غنیمت جانتے ہوئے سیاہی سفیدی کا مطلب سمجھنے چھیم دُلھن کے تعاقب میں ’شب بخیر‘ والی چادروں پر اوڑھم مچانے نکل جاتا۔ موتی ٹانگا کی کڑھائی والا سرخ چوکتا، ایک ’شب بخیر‘ دوسرے ’شب بخیر‘ سے جڑی ہوئی، تکیوں پر آمنے سامنے تکیوں بنیلیں اور وہ دونوں چادروں پر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے، آگے آگے چھیم دُلھن، پیچھے پیچھے بودی۔ اُس کے بالوں کی سیاہ لٹ بھی ساتھ ساتھ اچھلتی جاتی۔ بودی چھیم دُلھن کو تھاپ لگاتا تو وہ دہری ہو کر تکیے پر گرتی اور ہانپتے ہوئے کہتی: ”تکیہ بیچ میں نہ آتا تو میں بھلا پکڑی جاتی۔ شکر ہے پاؤں نہیں آیا تکیے پر۔ اب تُو جا، وہ آتے ہوں گے!“ بودی تھاپ لگا کر واپس آتا تو اُس کے سفید رنگ میں پیشانی سے پیروں تک لالی کھل چکی ہوتی اور بھنوں پر رُکے ہوئے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ کرتی الگنی کے مانند آنکھوں پر گر نے لگتے۔ بووا اپنی چاندنیاں اُس کی گھڑی پر رکھتے ہوئے کہتی ”لے پکڑ، ہمالیہ کو اور اونچا کر لے!“ بودی گھڑی پر دونوں ہاتھوں سے پورا وزن ڈالتے ہوئے کہتا: ”کر لیا اونچا..... آسمان تک اونچا۔“ بووا تاکید کرتی: ”احتیاط سے لے جانا، گلیوں گلیوں جھاڑو نہ پھیرتے

جانا!“بودی کان سے قلم اتار کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا: ”دیکھ بودا میں تو مذاق کر رہا تھا، اپنی گاہکی پرکون لات مارتا ہے..... جاسارے کا سارا راوی تیرے نام کیا، بس تو میرے کاٹوں گھاٹ پر نظر نہ رکھا کر، اکلوتا ہے بے چارہ، یہ ہے تو تیرے ہاتھ پاؤں چلتے پھرتے ہیں؛ ورنہ سرکاری ٹوٹیوں سے کپڑوں کی پنڈ دھونا پڑ گئی تو مونڈھے رہ جائیں گے تیرے!“

”توبہ اللہ معاف کرے۔ راج گڑھ کا بے اعتبار اپانی تو سبزی ترکاری کو پورا نہیں پڑتا، غنسل اور وضو کرتے دعا دے جاتا ہے، میلی لچلیوں کے منہ کیسے کھول دیں اس خالی خالی خرخر کے نیچے؟“

بودا سرکاری پانی کا رونا رونے لگتی۔ اپنی ساڑھی کے پلو کو سر پر اوڑھتے ہوئے بودی کی طرف دیکھتی جو اُس وقت دل ہی دل میں کچھ مانگ رہا ہوتا: ”یا اللہ راج گڑھ کی ٹوٹیوں اور نلکوں میں اتنا پانی نہ اتار دینا کہ میرا گھاٹ ہی بند ہو جائے!“ پھر وہ گلی میں کھڑے کھڑے اپنے مشہور دھوبی پٹلوں کا مظاہرہ کرنے لگتا اور کہتا: ”بودا، ایسی طاقت ہے کسی کے پٹھوں میں؟“ ہوائی پٹلوں کی آوازیں سن کر چھیم ڈھن ایک بار پھر کھڑکی میں آتی اور پوچھتی: ”ہائے اللہ یہ تیر کہاں چل رہے ہیں؟“۔ بودی اُس کی طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ جماتے ہوئے کہتا: ”یہاں چھیم ڈھن، یہاں! وہ آہستہ سے جواب دیتی: ”کہاں بودی بابا، کہاں؟“ اور کھڑکی بند کر لیتی۔

بودا بند ہوتی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھتی اور پھر بودی کی کھڑکی پر نظر ڈالتی۔ کہتی: ”دھون اُدھر کا اُدھر کیے بنا چارہ نہیں تو دل میں کلمہ ہی پڑھ لیا کر!“ پھر وہ ایک بڑا تھیلا اُسے پکڑاتے ہوئے کہتی: ”یہ جلدی واپس کر دینا۔ شمارے چار پائی پر کھلے پڑے ہیں، اُدھر اُدھر نہ ہو جائیں، پہلے ہی مشکل سے گنتی پوری کی ہے..... اب تیری بودا محلے کے سوئم ساتے بھگتے کے لیے ہی تو زندہ ہے..... جلدی کرنا!“

بودی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگتا۔ بودا اپنے آپ میں مگن ہونٹ ہلاتی جاتی: ”مالک نے مجھے چننا تھا اس کام کے لیے، چن لیا۔ جی تو وہ مجھے ہندوستان سے پاکستان لے آیا۔ اور تو چاہتا ہے بودا پھر سے لنگا کی راہ لے۔ تو کر لے گا یہ کام جو میں کرتی ہوں؟“

بودی کو اُس لمحے بودا کی آنکھوں میں لنگا جل کہیں نظر نہ آتا، تاحہ نظر صرف راوی بہتا ہوا دکھائی دیتا۔ بودا کہتی: ”بس خیال کیا کر، داغ داغ میں بھی فرق ہوتا ہے، تیرا گھاٹ کوئی جل تھوڑی ہے جسے پتا ہو کون سا داغ کیا ہے، کس کا ہے، کہاں کا ہے؟“ پھر وہ ذرا رک کر بولتی: ”گھاٹ کو تو بتانا پڑتا ہے داغ کا، اس کی آنکھیں ہوتیں تو ایسے ہی پڑا رہتا تیری مار پیٹ سہنے کے لیے؟“

بودی سنتا جاتا اور کھڑکی پر گھٹنوں کے بل بیٹھا بیٹھا پکی سیاہی سے بودا کی چاندنیوں اور تھیلوں پر نشان لگاتا جاتا۔ کہتا: ”بودا، تیرے مال پر تو یہی مار کہہ بنتا ہے!“ بودا بودی کی بچکی میں سے کپڑے نکال نکال کے کئی، کنارے اور کالر دیکھنے لگتی۔ اُسے لگتا سارے مار کے ایک جیسے ہیں۔ پھر وہ اپنے پلو کے ایک کنارے کو دائیں پسلی کی طرف بلاؤز کے اندر ڈالتے ہوئے جھک کر بودی کو دیکھنے لگتی اور کہتی: ”بھلے ہی مرضی کا مار کا لگا، مگر کسی دوسرے مار کے سے نہ ملا دینا کہ کل کلاں کو اُدھر اُدھر سے کوئی چاندنی اٹھا کر لے آؤ اور کہو کہ بودا، دیکھ تو بودی کے نیل اور لیکو کا کمال!“ بودی لکھتا جاتا اور بودا اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اُسے پوچھتی جاتی: ”دھوبیوں کی بستی میں کلمہ تو اترا ہوگا، پڑھ لیا کر، اچھا ہوتا ہے!“

بودی کھڑکی کو پشت پر لا دے چل پڑتا تو بودا کی آواز اُس کا تعاقب کرتی رہتی:

”سنئے ہو لوگو! گھاٹ کے سات پانی! گھاٹ نہ ہوا آسمان ہوا، ایک سے سات تک!“ وہ یہ بات سناتی تو بودی کو، مگر اُس کا منہ چھیم

دُھن کے دروازے کی طرف ہوتا جو اُس وقت سنگار میز کے سامنے کھڑی گردن کے گرد کھنچی ہوئی لہو کی لکیر پر اپنی انگلیاں پھیر رہی ہوتی: ”ارے یہ تو میلاد پر سیپارہ بھی پورا نہیں پڑھتی، بس آدھا پڑھ کر مجھے پکڑا دیتی ہے..... لے بودا، تیرا بڑا محاورہ ہے، یہ بھی پڑھ دے، میرا لفافہ بھی آدھا لے لینا اور ثواب بھی..... پڑھ دے ناپیاری بودا، میرے پاؤں سوچ رہے ہیں، ٹھنڈے فرش پر بیٹھا نہیں جا رہا“..... پھر چھیم دُھن برآمدے میں پڑے موڑھے پر بیٹھ جاتی اور اپنے کنگنوں کو دائیں ہاتھ سے اتار کر بائیں میں چڑھانے لگتی۔ اُسے بائیں کلائی دائیں کی نسبت کچھ ہلکی محسوس ہوتی تو کنگن چھکا کر کہتی: ”اب اسی ہاتھ پر ٹھیک ہیں“۔ وہ اپنی دائیں کلائی کو خالی دیکھ کر اٹھتی اور انگلیٹھی پر پڑی ہوئی گھڑی اٹھا کر پہننے لگتی۔ بازو کو اپنی گود میں رکھے سنہری سٹریپ کے کبھی ایک سوراخ میں پن ڈالتی اور کبھی دوسرے میں۔ پھر دونوں کہنیاں اپنی جھولی میں ٹکا کر دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی: ”اب ٹھیک ہے!“

جیسے جیسے چھیم دُھن کا جسم بھرتا جا رہا تھا، اُسے اپنی کھڑکی سے سودا سلف پکڑنے پکڑانے میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔ اُس کے کنگن بازو کے گوشت میں جیسے پیوست ہوتے جا رہے تھے اور چاندی سے چاندی ٹکرانے کی کھنک بھی کم ہو چلی تھی۔ بودی اُسے کھڑکی کی سلاخوں سے بھڑتے ہوئے دیکھتا تو کہتا: ”تو ڈیوڑھی میں رکھ دیا کر، میں خود ہی اٹھا لیا کروں گا“۔ بودی یہ بات یوں کرتا جیسے چھیم دُھن کے ڈیل ڈول میں آئے دن کی تبدیلیوں کا ذمہ دار وہ خود ہو۔

وہ فیصلے کا دن تھا جب چھیم دُھن کی گردن پر کھنچا سرخ دائرہ بودی کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ بودی کاٹوس گھاٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بودا کی چاندنیاں پہلے پانی میں ڈالے یا چھیم دُھن کی ’شب بخیر‘ والی چادریں؟ اسی گولگو میں گھڑی کے اندر ہاتھ ڈالا تو پہلا نمبر بودا کا نکلا۔ اُس نے ایک چاندنی نکالی اور اُسے سورج کے سامنے تان کر دیکھنے لگا۔ سیدھے رُخ سے دیکھا تو اُس پار تک دکھائی دیا۔ اُلٹے رُخ پر جا کر دیکھا تو اس پار گھاٹ کے سرے پر بنی سینٹ کی اونچی تھڑی کو دیکھ لیا۔ پھر وہ چاندنی کے ایک کنارے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: ”میلاد پر چھیم دُھن یہیں بیٹھ کر آدھا سیپارہ پڑھتی ہوگی“۔ وہ اُس چاندنی کو بالشتوں سے ماسپتے ہوئے ہاتھ دوسرے کنارے تک لے گیا، پھر ایک دوسری چاندنی کو پہلی کے ساتھ جوڑا اور اُس پر بالشتوں کا فیتہ پھیرتے ہوئے ایک جگہ پر پہنچ کر ہاتھ روک دیا۔ کہنے لگا: ”گلتا ہے دلییر آگئی ہے۔ یہ چھیم دُھن کے آنے جانے کا راستہ ہوگا۔ میلاد میں آتی ہوگی تو اتنے ہی قدم اٹھاتی ہوگی جتنے میں نے ماپ لیے۔ اور جب بوندی بدانے سے بھرالفا ہاتھ میں لٹکائے گھر جاتی ہوگی تو اسی فیتے پر پاؤں رکھتی ہوئی باہر نکل جاتی ہوگی“۔ کہنے لگا: ”پھر تو بودا کی چاندنیاں صاف ہی ہوئیں، مگر میں تو اپنا بھاڑا کھرا کر کے رہوں گا، ایک ٹیڈی بھی نہ چھوڑوں گا“۔ اُس نے چاندنیوں کی تہ بنا کر ایک طرف رکھ لی اور سوچا: ”استری کر کے واپس کر دوں گا، جھوٹ موٹ کہہ دوں گا کہ سات پانیوں میں دھو کر لایا ہوں۔ اُسے کیا پتا چلے گا، اُس نے گنگا دیکھا ہے یا رواہی، یا سرکاری پانی، سات دیکھے ہوں گے تو جرح کرے گی“۔ اب اُس نے چھیم دُھن کی دو چادریں اور دو تکیہ پوش اپنے سامنے پھیلا لیے اور کچے پکے داغوں کو گننے لگا۔ ایک آواز چھیم دُھن کی آئی: ”میرے مالک کا نام پتا لکھا کرو“۔ پھر وہ آواز کنگنوں کی طرح کھلتے ہوئے سارے گھاٹ میں گھل گئی۔ بودی کا پی کھول کر صفحہ الٹا ہوا چھیم دُھن کے کھاتے پر پہنچ کر رُکا اور اپنا ہی لکھا ہوا منہ میں آہستہ آہستہ پڑھنے لگا: ”پہلی دھلائی چار کپڑے..... ’شب بخیر‘ والی دو چادریں اور دو تکیہ پوش۔ وصولی مورخہ یکم دسمبر ۱۹۷۰ء، واپسی طے پائی پندرہ دسمبر ۱۹۷۰ء“۔ ایک سطر خالی چھوڑ کر لکھا تھا: ”مالکن کی تاکید: نئی چادریں ہیں، احتیاط سے دھونی ہیں، کڑھائی پر ڈنڈے نہیں لگانے، نچوڑتے ہوئے زیادہ بل نہیں دینے اور دھوپ میں لٹا کر ڈالنی ہیں

“ایک اور ورق پر لکھا تھا: ”وصولی ایک روپیہ، بقایا ستر روپے“۔ بودی پڑھتا چلا گیا اور پھر پوری کاپی کی ورق گردانی کرتے ہوئے اُس نے کاپی جیب میں ڈال لی اور منہ میں کچھ کہا، جس کا مطلب تھا: ”پچھلی چھٹی تھی یا یہ چھٹی ہے؟“ وہ چھیم دُھسن کے چاروں کپڑوں کو پانی کی سطح پر پھیلا کر خود بھی پانی کو دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پکڑن پکڑائی میں پڑنے والے نشان چلنے پھرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ایک ایک نشان چادروں سے الگ ہوتا ہوا اپنی اپنی رو میں بہ نکلتا تھا۔ ستر قدم پر کسی نے پانی کو اوک میں لے کر گھٹی کی، اگلے ستر قدم پر ایک مسافر نے مشکیزہ بھرا اور سب قافلے والے پیاس بجھانے اُس کی طرف لپکے۔

بودی بابا تیس سال بعد بھی جب شب بخیر والے بستر پر لیٹتے تو پکڑن پکڑائی کھیلنے ہوئے کہیں کہیں جانتے۔ سامنے تھاپ لگا کر کروٹ بدل لیتے جیسے کھیل سے واپس آگئے ہوں۔ وہاں سے اپنا ہمالیہ کاندھے پر اٹھائے گھاٹ پر جا پہنچتے۔ وہ اسی منہ سے رہتے کہ بودا کو پہلے پنپائیں یا چھیم دُھسن کو یا ان دونوں سے پہلے کسی اور کو؟ رضائی اُن کے منہ پر ہوتی اور گلے میں سے بہتے ہوئے پانی کی اداس کردینے والی آوازیں نکلتی رہتیں۔

سات دن بعد بودی اپنی گٹھڑی اٹھائے چھیم دُھسن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ایک درز سے اندر جھانکا تو بودا کی خمیدہ کمر پر نظر پڑی۔ پھر جیسے درز، دروازہ بن گئی اور رنگ رنگ کے کنیاں کنارے اُس کی آنکھوں میں بھرنے لگے۔ بودا صحن میں دو زانو بیٹھی خواتین کے سامنے شماروں کی ڈھیریاں لگانے میں مصروف تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے کمر کو سیدھا کرتی اور کولھوں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے جھک کر شمارے تقسیم کرنے لگتی۔ وہ صحن میں بچھی ہوئی دریوں پر اکیلی چل پھر رہی تھی جیسے اپنے شماروں کی نگرانی کر رہی ہو۔ بودا شمارے تقسیم کر چکی تو بولی: ”ساری بیبیاں اپنی گنتی خود یاد رکھیں۔ جو پہلے ختم کر لے، وہ پھر شروع ہو جائے اور مجھے بتا دے، دعا اُسی حساب سے ہوگی کہ سو الاکھ کے اوپر جتنا پڑھا گیا، وہ سب بھی اُسی کو پہنچے، کسی اور کو نہیں“۔ پھر اُس نے اگر بتی جلا کر ایک دروازے کی درز میں ٹکا دی اور ساڑھی کے پلو سے چشمہ صاف کرتے ہوئے اُن بیبیوں کے درمیان جا بیٹھی۔ شمارے پر شمارہ گرنے کی بے ترتیب آوازیں اور بلند ہونے لگیں۔ بودی کے ٹین جیسے دماغ پر رُک رُک کر گرتے ہوئے بارش کے قطرے اب ایک مستقل سازی کی طرح بجنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ایک خاتون اٹھ کر بودا کے پاس جاتی اور اپنا اپنا شمار بتانے لگتی۔ بودا اپنی انگلیوں پر حساب کرتی جاتی اور خوش ہوتی جاتی۔

بودی نے یہ سب دیکھا تو اُس کا ہاتھ اپنی سر بند پچی پر جا پڑا۔ سب سے اوپر بودا کی چاندنیوں کی تہ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے تازہ استری کی ہوئی چاندنیوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور اپنے سات دن پرانے جھوٹ کو یاد کرتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ کاٹواں گھاٹ اُس کے قدموں میں بچھا تھا اور سترویں قدم تک تعاقب پر مامور لمبی قطاروں میں لوگ اکیلے آدمی کے پیچھے چل رہے تھے۔

گرد

یہ ایک بہت کھلا احاطہ تھا، جس کے چاروں طرف تین منزلہ مکان اور مکانون کی دیواریں نگی اینٹوں سے اوپر تک اٹھی ہوئی اتنی بھدی تھیں کہ دیکھنے سے طبیعت پر بوجھ پڑتا۔ احاطے کے ایک کونے میں کاٹھ کباڑ کے ڈھیر، دوسری طرف پرانے ٹائر اور جلے ہوئے کونے کی راکھ جمی تھی۔ ان سے کافی دور ویلڈنگ کا پلانٹ تھا، جس کے ارد گرد لوہے کے ٹکڑے اور ٹیڑھی میڑھی سلاخیں بکھرے ہوئے کونے سے مل کر عجیب کرختگی کا احساس پیدا کرتیں۔ اسی احاطے میں سب سے الگ بائیں جانب وہ فیکٹری تھی، جس میں کام کرتے مجھے دس دن ہو گئے۔ یہاں میں خادم علی کے توسط سے پہنچا تھا۔ اُسے بس اتنا جانتا ہوں کہ لاہور کی کسی گمنام گلی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں پندرہ دن تک اکبری منڈی کے قریب گتا ڈھوتے رہے۔ اسی عرصے میں اُس سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چھوڑ گیا۔ ایک دن دوبارہ آیا اور مجھے یہ کہہ کر ساتھ لے گیا کہ ایک جگہ دُگنی مزدوری پہ کام مل رہا ہے، وہاں چلتے ہیں۔

یہ جگہ بادامی باغ کے چھلی طرف نہایت گندے علاقے یعنی کاٹھ کباڑ اور کچرے کے ڈھیروں میں تھی۔ میرے اور خادم علی کے علاوہ یہاں سات مزدور اور تھے۔ آپ اسے چھوٹا سا کارخانہ کہہ لیں، جو تیس مربع فٹ کمرے میں نصب تین عدد چکیوں پر مشتمل تھا۔ کمرے کے آگے چالیس مربع فٹ کا مزید صحن تھا۔ صحن میں خام مال پڑا ہوتا، جسے ہم چکیوں کے ذریعے اصل مال کی شکل دیتے۔ یہ خام مال کیا تھا؟ اس بارے میں زیادہ نہیں بتا سکوں گا مگر ان میں سے دو چیزوں کو جانتا ہوں۔ ایک ناکارہ سیلوں کے درمیان سے نکلا ہوا سیاہ سکہ اور دوسرا بجھا ہوا چونا۔ یہ سکہ کس چیز سے بنتا ہے؟ اس کی مجھے خبر نہیں مگر وہ سیل جن کے درمیان یہ پایا جاتا ہے، ریڈیو اور اس جیسی دوسری الیکٹریک چیزیں چلانے کے کام آتا ہے۔ یہ کالے رنگ کا سکہ یا کونلہ کہہ لیں، ہمیں چکیوں کے ذریعے پینا پڑتا۔ سکہ پیسنے والی بڑی چکی پانچ ہارس پاور کی موٹر کے ساتھ ایک چیختا ہوا بھوت تھی، جو سیکے کے ساتھ سماعت اور عقل بھی سلب کر لیتی۔ باقی دو چکیاں چونا اور ایک اور چیز پیسنے کے کام آتیں۔ جس وقت تینوں چکیاں چلتیں تو ان کا شور احاطے کے در و دیوار میں گونجتا۔ پسے ہوئے سیکے کی گرد سانس کے ذریعے نھنوں سے ہو کر گردوں اور تلی تک پہنچ جاتی۔ گرد اتنی بد ذائقہ تھی کہ کام کے پہلے دو دن میں نے کئی بار قے کی اور خادم علی کی جان کو کوسا۔ کالا سیاہ اور گرد آلود کمرہ اور اس میں موجود چکیاں ایسی چڑیلیں تھیں، جس میں کام کرنے والے آکسیجن کی بجائے کالی گرد پھانکتے۔ ہم سارا دن سکوں اور چونے کو پیس کر سیاہ میدے کی شکل میں تیار کرتے، پھر اس میں دو تین قسم کے مزید پاؤڈر ملاتے، جن کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ ایک پاؤڈر تو ایسا کہ پیکٹ کھلتے ہی بدبو کے بھبھوکے اٹھتے اور ناک بند کرنے کے باوجود سانس کو پھاڑ کر سینے میں اتر جاتی۔ ہمیں بالکل نہیں پتا تھا، ہم کیا بنا رہے ہیں؟ صبح چھ بجے کام پر کھڑے ہوتے اور شام چھ بجے تک لگے رہتے۔ سکہ پیستے ہوئے منہ، سر اور جسم پر کالے رنگ کی ایسی تھیں چڑھ گئیں گویا سیاہ بھٹیوں سے نکالے ہوں۔ نہ

صرف یہ کہ ہم مطلق کالے ہو چکے تھے بلکہ درودیوار میں ایک ڈرا دینے والی سیاہی جذب ہو گئی، جیسے یہ کمرہ کبھی ہوئی دوزخ ہو۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بات، جو فیکٹری کی نحوست میں اضافہ کرتی، وہ سیکے کا وزنی پن تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر چیز بھاری بھاری ہو گئی۔ سالم سکے جب پس کر میدہ ہو جاتا تو وزن میں مزید اضافہ کر دیتا۔ یوں سیاہی اور وزن نے مل کر یہاں کے ماحول میں اتنا ڈپریشن پیدا کر دیا کہ سب مزدور بلاوجہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کیفیت میں رہتے۔ میں ان میں نیا تھا اور چھوٹا بھی چنانچہ خادم علی کے علاوہ ہر ایک اپنا ڈپریشن مجھ پر اتارتا۔ ایسے لگتا ان سب بڑے جانوروں میں واحد ایک میں چوہا ہوں۔ اس دباؤ کے اثر میں میری ذات سمٹ کر چھوٹی ہوتی گئی، جس سے آزاد ہونے کی طاقت مسلسل سلب ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، جتنی جلدی ہو سکے اس جہنم سے نکل بھاگوں۔ اگرچہ عام معاوضے کی نسبت یہاں معاوضہ دگنا تھا مگر ایسی کالی اور بھاری چیزوں کے درمیان کام کرنا آسان نہ تھا۔

سوائے ہماری فیکٹری کے اس احاطے میں ہر چیز واضح تھی یعنی ایک طرف چیتھرٹائروں کا کام، ایک طرف ویلڈنگ اور کونکے کی ٹال مگر ہماری فیکٹری محض ابہام تھی۔ ایسا ابہام جس کے اندر سیاہی پھیلتی جائے اور جیسے آگے بڑھیں، اندھیرے کا اثر دھانگنے لگے۔ سیٹروں بار پوچھنے کے باوجود نہ بتایا گیا کہ ہم کیا بنا رہے ہیں اور کیوں بنا رہے ہیں؟

احاطے میں پانی کا ایک نکا بھی تھا، جو گھنٹوں کے حساب سے ایک بالٹی بھرتا۔ اتنا کم پانی فقط ہاتھ منہ دھونے کے کام آتا۔ سیاہ سیکے کی تہیں جسم پر چڑھنے کے سبب خارش اور قریب سوئے منحوس مزدوروں کے خراٹے ایک ناختم ہونے والی اذیت میں مبتلا رکھتے اور میں خادم علی کو گالیاں دیتے رات کاٹ دیتا۔ مزدوروں کی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ فقط ان میں خادم علی ذرا بہتر آدمی تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام پنپنا کر اکثر میری مدد کر دیتا۔ خاص کر اُس وقت جب سیکے کی بھری ہوئی بوریاں گاڑی سے نیچے اتارنا ہوتیں۔ خادم علی کی ہلکی داڑھی کے ساتھ سر پر بھاری بال تھے۔ میں کام چھوڑ دیتا مگر پچھلے پانچ دن کی مزدوری فیکٹری مالک سیٹھ اسلم کے پاس تھی، جو اچانک کام چھوڑنے پر دباہالی جاتی چنانچہ مجبوراً لگا رہا۔

فیکٹری مالک سیٹھ اسلم چھٹ قد کا ایک طاقتور آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوتا۔ اُسے وہ ڈیوڈ کے نام سے بلاتا۔ ڈیوڈ کے گلے میں صلیب لٹکی رہتی اور ہیئت کے اعتبار سے بھی کرخت لگتا۔ مذاق میں پھکڑ پن اور شوخی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ہر وقت بازو کی مچھلیاں اور سینے کے اُبھار دکھانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اُسے کبھی سنجیدہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ سیٹھ اسلم نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے اور کلین شیو بنائے رکھتا مگر بات کرتا تو گنوار پن نہ چھپتا۔ مزدوروں کے ساتھ اکثر ان کی بیویوں کے متعلق گھٹیا جملے کستا، جنہیں مزدور ہنس کر سنتے۔ میرے ساتھ نرمی سے پیش آتا مگر مجھے اُس کے پاس کھڑے ہوئے گھن آتی۔ اُس کے پاس ایک سفید رنگ کی اٹھاسی ماڈل کروا تھی، جسے احاطے کے گیٹ سے اندر کر کے دُور ہی کھڑی کر دیتا تاکہ سیکے کی گرد سے بچی رہے۔ کار جو نبی گیٹ کے اندر داخل ہوتی، اُسی لمحے دو مزدور بھاگے ہوئے جاتے اور کار کی ڈکی سے پاؤڈر کے پیکٹ کارخانے لے آتے، جہاں ہم کام کر رہے ہوتے۔ فیکٹری مالک سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ دو گھنٹے کے لیے آتا اور اپنی موجودگی میں پے ہوئے سکے میں یہ مختلف قسم کے

پاؤ رُکس کراتا۔ مکسنگ ہم مزدور ہاتھوں سے مل مل کے ایسی احتیاط سے کرتے کہ پاؤ رُکس کے ساتھ یک جان ہو جاتے۔ سیٹھ اسلم اس مال کو چھوٹے تھیلوں میں بھر کر ایک پک اپ میں رکھواتا، جو ہمارے پاؤ رُکس کرنے کے عرصے میں وہاں پہنچ جاتی۔ پک اپ میں خام سکہ بھرا ہوتا، جسے وہ جانے کہاں سے اکٹھا کر کے لاتی۔ ہم میں سے کچھ مزدور اُس سے سکہ اُتار کر خالی کرتے اور تیار شدہ مال لوڈ کر دیتے۔

سر کے بالوں میں پھنسی گرد اور چکیوں کے بے تحاشا شور کی وجہ سے دماغ پر ایک بوجھ سا تھا۔ جن چار پائیوں پر ہم سوتے، اُن کے کالے بان میں سکے کی گرد اور اُس گرد میں ریگتے ہوئے کالے کھٹل کی آبادی برسوں ہوئے، اپنی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ بان پر چڑھی تہہ در تہہ چکنی میل سے رُوں رُوں کانپ اُٹھتا اور میں اُس کے قریب جانے سے ڈرتا مگر احاطے میں کچرا کباز اور گھانس پھونس کی بہتات نے میسوں سانپ پیدا کر دیے، جو سکے اور کھٹلوں سے بہر حال زیادہ خطرناک تھے۔ مجھے ہر حالت میں یہاں سے نکلنا تھا مگر میرے اور خادم علی کے بار بار اصرار پر بھی ہم سیٹھ اسلم سے پیسے لینے میں ناکام ہو گئے۔ مجھ سے زیادہ فکر خادم علی کو تھی، جس کی گردن پر میری مزدوری کا وزن بھی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مزدوری دہالی جائے گی۔

سہ پہر کے وقت سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ احاطے میں داخل ہوا، اُس نے گاڑی معمول کے مطابق دُور ہی کھڑی کر دی۔ اُن کے آتے ہی چکی بند کر دی گئی۔ احاطے میں ہر طرف گرد کی سیاہ چادر چڑھ چکی تھی۔ سیٹھ اسلم کو نے میں رکھی گئی کرسی پر بیٹھ گیا، جسے وہ گاڑی کی ڈکی سے نکال کر لایا تھا اور قہقہے لگا کر کام کرتے مزدوروں کو جگتیں مارنے لگا۔ میرا کام کو بالکل جی نہیں لگ رہا تھا چنانچہ ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر میرے کان کے نیچے ہلکی سی چپت لگائی اور کہا، کیوں بیٹی تیرے ہاتھوں پہ ہندی لگی ہے؟ سیٹھ اسلم نے اس بات پر ڈیوڈ کو جھڑکا۔ میں نے سیٹھ اسلم کے اس رویے سے حوصلہ لے کر کہا! سیٹھ میں واپس جانا چاہتا ہوں، میرا حساب کر دیں۔

خادم علی نے فوری تائید کی اور بولا، ہاں سیٹھ پانچ دن سے مزدوری نہیں ملی، آج حساب کر دو۔

خادم علی تمہیں کس نے وکالت دے دی؟ سیٹھ نے تمسخر اُڑایا۔

سیٹھ اسے کام پر نہیں لایا تھا، خادم علی کام کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ایک اور بات سن لے، میں خود بھی جانا چاہتا ہوں۔ خادم علی کا جواب سن کر سیٹھ اسلم ٹھنڈا ہو گیا اور بولا! خادم علی تم تو ناراض ہو گئے، کل شام تک آپ کو اجرت مل جائے گی اور پرسوں کام پر نہ آنا۔

فیکٹری مالک کے اس جواب سے میں نے سوچا ایک دن اور اس جہنم میں سہی۔ مغرب کے قریب وہ چلا گیا تو میں نے

ایک مزدور سے پوچھا، سیٹھ کل پیسے دے دے گا؟

بڈھے مزدور نے جواب دیا، لڑکے، سیٹھ کو پتا چل گیا ہے کہ تم کام نہیں کرنا چاہتے۔ جب نئے مزدور ملیں گے، تب آپ کو

پیسے دے گا اور اس کام پر آسانی سے کوئی نہیں آتا۔ اس کالی دنیا میں جو آتا ہے دوسرے دن بھاگ جاتا ہے۔

رات آٹھ بجے خادم علی نے مجھے اشارہ کیا، میں اُس کے پیچھے چل پڑا، گیٹ پر پہنچ کر اُس نے چاروں طرف دیکھا اور نزدیک ہو کر بولا! علی فکر نہ کر، میں شوکت پہلوان کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر کل تجھے پیسے لے کر نہ دیے تو پیشاب سے داڑھی منڈالوں گا۔ شوکت پہلوان یہاں کا مشہور دادا ہے، دو موری گیٹ کے پاس رہتا ہے۔ تُو نچت ہو کر سو جا، میں اُس سے بات کر کے آتا ہوں۔ یہ کہہ کر خادم علی باہر نکل گیا اور میں واپس اپنی چار پائی پر لوٹ آیا۔ اس کے بعد میرا دھیان فلموں میں موجود اُن پہلوانوں کی طرف چلا گیا جو غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ میں خیالوں میں پہلوان کو فلمی ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگا۔ انھی فکروں میں جانے کب نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو خادم علی نے مجھے بتایا کہ شوکت پہلوان سے بات ہو گئی ہے، اُس نے رات ہی سیٹھ اسلم کی طرف بندہ بھیج دیا تھا۔ آج اُس کے بندے یہاں بھی آئیں گے۔

کام شروع ہوا تو ہم بھی پیسے ملنے کی آس میں کام پر جُت گئے۔ دن کا پہلا حصہ پہاڑ کی طرح کٹا۔ جسم کے راووں راووں پہ جمی میل اور کا لک سے خارش پہلے سے بھی سواتھی اور بال تو کب ایک دوسرے سے جُور کر یورپی سادھوؤں کی طرح غلیظ ہو چکے تھے۔ ساڑھے تین بجے سیٹھ اسلم فیکٹری میں آیا تو معمول کے خلاف آج اُس کے ساتھ ڈیوڈ کے علاوہ دو آدمی اور تھے، جو دیکھنے میں ہی وحشی لگے لیکن وہ دُور ہی ویلڈنگ والے کے پاس بیٹھ گئے۔ ڈیوڈ معمول کے مطابق کام کروانے لگا۔ وہ بار بار مجھے اور خادم کو طنز یہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ہماری نظریں احاطے کے دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ چھ بج گئے مگر پہلوان کے آدمی نہ آئے۔ میری طرح خادم علی کی بے قراری بھی دیدنی تھی۔ اس اضطراب میں خارش کچھ زیادہ تیز ہو گئی۔ سر کے بالوں میں سیکے کی اتنی تہیں چڑھ گئیں کہ ناخن جلد تک پہنچنا ناممکن ہو گئے۔ کام مکمل ہو چکا تو سیٹھ اسلم نے سوائے میرے اور خادم علی کے تمام مزدوروں کو اجرت دے دی۔ ہم دونوں سیٹھ کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر خادم علی نے کہا، سیٹھ جی ہمارا حساب؟

سیٹھ اسلم ڈیوڈ کی طرف منہ کر کے مسکرایا اور خادم علی سے مخاطب ہو کر بولا، بھئی خادم تم دونوں کا حساب تو شوکت پہلوان نے کرنا ہے؟ جا کر اُس سے پیسے لے لو۔

خادم علی ایک دم جھینپ گیا، جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو، پھر سٹ پٹا کر بولا، سیٹھ یہ ٹھیک بات نہیں، ہم اتنے گند میں کام کر رہے ہیں۔ جب تُو پیسے نہیں دے گا تو کسی کے پاس تو جانا پڑے گا۔ پھر ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا یہ دھندا کون سا ہے؟ دھندا تیری بیوی کرتی ہوگی بے شرم، سیٹھ اسلم غصے سے بولا، ڈیوڈ یہ رات شوکت پہلوان کو بھی یہی کچھ کہتا رہا ہے۔ ابھی اس کو یہ تو بتا دیں یہ دھندا کون سا ہے؟ اس کے دل میں ارمان نہ رہے، بلا ذرا چھکوا اور دارے کو۔

سیٹھ کی آواز سننے ہی ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھے دونوں آدمی دوڑ کر آ گئے۔ ادھر ڈیوڈ نے ایک تھپڑ کھینچ کر خادم علی کے کان پر جمایا۔ جواباً خادم علی نے پے ہوئے سیکے کی مٹھی بھر کر ڈیوڈ کے منہ پر دے ماری۔ سیکے کی گرد سے ڈیوڈ بادلا سا ہو گیا، زور زور سے کھانسنے لگا اور آنکھیں اُبل پڑیں۔ اس کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دوسرے دونوں نے بڑھ کر ڈیوڈ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میں جوابی

تک تذبذب میں تھا، فوراً دونوں ہاتھوں سے ڈیوڈ کو کئے مارنے لگا۔ اس جرات پر ایک نے مجھے دبوچ لیا۔ مزدور دیوار کے ساتھ چپکے لگے کھڑے تھے، جیسے فلم دیکھ رہے ہوں۔ ڈیوڈ اور اُس کے ساتھی نے خادم علی کو اپنے گھٹنوں کے نیچے دبایا۔

رسی پکڑو، سیٹھ اسلم نے ایک مزدور سے کہا، دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دو ان رسیوں سے اور پانی کی بالٹی لے کر آؤ۔ ایک مزدور نے بھاگ کر رسی پکڑ لی اور دوسرا پانی لینے چلا گیا۔ آن کی آن میں ڈیوڈ نے ساتھیوں سے مل کر ہم دونوں کو رسیوں سے باندھ دیا۔ کسی مزدور نے اس تمام کاروائی میں ہماری ذرا مدد نہ کی۔

ڈیوڈ نے ہمارے سر پر ایک ایک لوٹا پانی انڈیل دیا اور پاؤں، جو ہم نے مکس کیا تھا، اٹھا کر میرے سر پر اور خادم علی کے سر، داڑھی اور مونچھوں پر مل دیا۔ تمام مزدور چپ سادھے کھڑے تھے۔ ہم اُس پاؤں کی بدبو میں ایسے ڈوبے کہ حواس باختہ ہو گئے۔ میں دل میں پہلوان کو گالیاں دے رہا تھا اور خادم علی کو کوس رہا تھا کہ خواہ مخواہ مدد لینے چلا گیا۔ اب میرے لیے مسئلہ اجرت کی وصولی نہیں بلکہ اس مصیبت سے نکلنے کا تھا۔ آٹھ دس منٹ یونہی بیٹھے رہے۔ میں رونے لگا تو ڈیوڈ نے دوبارہ سروں پر پانی ڈال دیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سر کے سارے بال پانی کے ساتھ میری جھولی میں آپڑے، میں یہ کھیل دیکھ کر حیران رہ گیا اور خادم علی کی طرف دیکھا۔ اُس کے سر، مونچھوں اور داڑھی سمیت ہر شے گنجی ہو چکی تھی اور خادم علی انسان سے زیادہ ایک ٹینڈا لگ رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ سیٹھ اسلم بولا، لے بیٹا دیکھ لے، اچھی طرح سے میرا کاروبار؟ یہ پاؤں عورتوں کے نیچے کے بال صاف کرتا ہے اور تیرے جیسے مردوں کے اوپر کے بال۔ اتنا کہہ کر اُس نے جیب سے کچھ پیسے نکالے اور ایک مزدور کو دے کر بولا، شریف میرے جانے کے بعد انھیں کھول دینا اور یہ دونوں کی مزدوری دے کر لات مار کے احاطے سے باہر نکال دینا، آخر شوکت پہلوان ہمارا یار ہے کچھ اُس کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ ڈیوڈ اور دو نئے ساتھیوں سمیت اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شریف نے ہمارے ہاتھ کھول دیے اور پیسے جھولی میں رکھ دیے، ہم کچھ دیر اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر حیرانی سے دیکھتے رہے۔ خادم علی وقفے وقفے سے گالیاں دے رہا تھا۔ آخر پیسے پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ گئے تو پورے تھے۔ رہ رہ کر میرا ہاتھ اپنی تازہ ٹنڈ کی طرف جاتا، جہاں صاف میدان تھا اور محسوس ہوتا جیسے ہماری گھڑی اُتر گئی ہو۔ رات نو بجے ہم دونوں احاطے سے نکلے۔ خادم علی سے آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ اچانک خادم علی رُکا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا، وہاں سے تانگے ریلوے اسٹیشن پر جاتے ہیں، اتنا کہہ کر ہاتھ ملائے بغیر دوسری طرف چل دیا۔ میں کچھ دیروہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک اندھیری اور تنگ سی گلی میں غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اپنی ٹنڈ پر دوبارہ ہاتھ پھیرا اور ہلکے پھلکے سر کے ساتھ ٹانگے کی طرف چل دیا۔

چار جہتی کہانی

دُکھتے دنوں میں سے ایک دن چڑھا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بیچ چوراہے میں ایک شخص آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے کھڑا ہے اور اس پر جلالی کیفیت طاری ہے۔ چوراہے میں لوگوں کا ہجوم جمع ہوتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے تعداد اتنی بڑھی کہ حد نظر کی دوری تک بس سر ہی سر تھے۔ عجیب کشش تھی کہ جو بھی ہجوم میں شامل ہو جاتا اس کے لیے باہر نکلنا ممکن نہ رہتا۔ اور جب ہر طرف سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تو بیچ چوراہے میں کھڑا مسکرایا، آسمان کی طرف بلند ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے آئے اور لوگوں کے سروں پر چھا گئے۔ جلالی کیفیت کم ہوتے ہوتے ایک ہمدردانہ تبسم بنی اور لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پہ جنبش ہوئی۔ اُس نے کہا اور لوگوں نے سنا اور سمجھا اور یقین کیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے، لفظ بہ لفظ سچائی ہے۔ سننے والوں نے نہ سننے والوں کو بتایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم کے آخری سرے تک سب کے سب جان گئے جو اس نے کہا، اور یقین کیا اور گواہی دی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ اس کی شخصیت کا اثر تھا یا کلام کی تاثیر یا کچھ اور کہ لوگ اس کے لیے رکے، اسے سنا اور اس کے ہو گئے۔

اور پھر ایسا ہوا کہ ہر چڑھتے دن کے ساتھ وہ چوراہے میں آن کھڑا ہوتا اور جب ہجوم بڑھتے بڑھتے سروں کے سمندر میں بدلتا تو وہ آسمان کی طرف بلند ہاتھ لوگوں کے سروں پر پھیلا دیتا اور اس کے ہونٹوں کی جنبش لوگوں کے کانوں سے دلوں میں اترتی اور تصدیق کی صدائیں بلند ہوتیں۔ سننے والے نہ سننے والوں کو بتاتے اور نہ سمجھنے والے بھی سمجھ کا اقرار کرتے ہوئے گواہی دیتے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ طاقت کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور اس کی تفہیم کے لیے کسی گہری کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن بغاوت کی زبان، طاقت کی زبان ہی کا ایک اگلا روپ ہے اور اس کا اثر بھی گہرا، خوب گہرا ہوتا ہے۔ پس بغاوت کی سرگوشیوں نے چوراہے میں پڑاؤ ڈالا اور تفہیم اتنی تیزی سے پھیلی کہ ہجوم کے آخری سرے پر کھڑے شخص کو بھی کچھ نہ سننے سمجھنے کے باوجود یقین تھا کہ چوراہے میں کھڑا شخص جو کہہ رہا ہے، سچ ہے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ ہجوم میں سے بہت سوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانا اور چوراہے میں کھڑے ہو کر ارشاد کرنا سیکھ لیا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شہر شہر چوراہوں میں ہجوم جمع ہونے لگا اور تفہیم دلوں میں اتری اور جاننے والوں نے نہ جاننے والوں کو بتایا اور خروش بڑھتا گیا۔

○

دُکھتے دنوں میں کہانی نے ایک اور سمت سے نزول کیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک پر شکوہ عمارت کے

آثار ہویدا ہوئے۔ عمارت کے ایک بڑے کمرے میں سنجیدہ بارعب چہروں والے کچھ ادھیڑ عمر اور بوڑھے، بڑی میز کے گرد گرد اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ اور ان سب کی نظریں آسمان کے بجائے میز پر پڑے نقشوں اور اعداد و شمار سے بھری فائلوں پر ہیں۔ بولتے ہوئے کا غذا ایک ایک کر کے پیش ہوتے اور سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے رہے۔۔۔ لکھت بتاتی رہی کہ چوراہوں میں کھڑے ہونے والوں کو کھڑا کیا گیا ہے۔ اور وہ اپنے اپنے پیشوں کے ناکام لوگ ہیں لیکن مجمع لگانے کے فن سے واقف ہیں۔ پس وہ مجمع لگاتے ہیں اور اس کام کی اجرت سے اپنا گھر چلاتے ہیں۔ اور وہ کہ جو ان کو دیکھ دیکھ کر مجمع لگانے لگے ہیں وہ جو شیلے جذباتی نقال ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو راتوں رات شہرت کی لت بیچ چوراہے میں لے آئی ہے۔ کوئی منصوبہ نہ پہلے والوں کے پاس ہے نہ بعد والوں کے پاس۔ ہجوم سادہ لوح اور ان پڑھ ہے۔ ان کے بھولپن کا یہ عالم ہے کہ گھنٹوں اپنے کام کاج چھوڑ چوراہے میں بیٹھ رہتے ہیں اور کچھ سمجھ آئے نہ آئے، یقین کرتے رہتے ہیں کہ جو کہا جا رہا ہے، سچ ہے۔۔۔ کا غذا باری باری بولتے رہے اور خوب غور و حوض کے بعد یہ طے ہوا کہ مجموعوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہجوم کو نعرے دیے جائیں اور نعرے لگانے والے بھی نعرے کہ جو خون گرمائیں اور اتنا گرمائیں کہ گلی گلی خون بہہ نکلے۔ بغاوت کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے لیکن یہ طاقت کی طفیلی زبان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اور طے ہوا کہ ہجوم کی جہالت کو ان کا فخر بنایا جائے تاکہ صرف وہ ہی نہیں ان کی نسلیں بھی اسی خمار میں رہیں۔ اور طے ہوا کہ ہجوم کو ایک دوسرے پر فتح پانے کے مواقع دیے جائیں اور جب ان میں سے کوئی فتح یاب ہو تو ان کے جشن پر جشن منایا جائے۔ سنجیدہ بارعب چہروں والوں نے فرمان لکھے اور مسکراتے ہوئے ایک دوسرے پر نظر کی۔۔۔ شہروں شہر ہجوم میں خروش بڑھا۔ نعرے لگے؛ بٹ کے رہے گا، بن کے رہے گا۔ کٹ مریں گے۔ اور آسمان دیکھتا رہا کہ خون کے چھینٹوں سے اس کی اجلی قبا تر بتر ہوتی گئی۔

○

دُکھتے دن بیتے مگر دکھ کہانی چلتی رہی۔ مدتوں بعد کا ایک منظر، ایک بھولا باتونی سڑک پر لگے ایک بڑے پوسٹر کے سامنے کھڑا بڑا بڑا چلا جا رہا ہے۔ پوسٹر پر عظیم چہروں کو نمایاں کر کے نیچے چلی حروف میں کچھ نعرے اور شکریہ شکر یہ لکھا ہے۔ سب سے اوپر ٹوپی اور شیروانی والی تصویر ہے۔ ایسی ٹوپی باتونی نے کبھی پہنی اور نہ اس کے باپ دادا نے۔ پس وہ اپنے جسم کے کسی مستور حصے کو کھجلاتے ہوئے مسلسل اس ٹوپی کو دیکھے چلا جا رہا ہے اور دائیں بائیں گزرتے لوگ اُس کے قصیدے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ پوسٹر پر نمایاں دوسری تصویر سر کو ایک طرف جھکائے کسی گہری سوچ میں مگن ایک صاحب کی ہے۔ ان دو کے نیچے آدھ درجن تصویروں کی ایک قطار ہے جن میں کچھ بغیر ٹوپی کے، کچھ عینک و بغیر عینک کے۔ اور کچھ بالوں اور بغیر بالوں کے۔ لیکن سب کے چہرے گوشت بھرے، آنکھیں خوشی سے معمور اور

آسودہ۔ کوئی درجن بھر تصویریں مزید بھی ہیں لیکن ان سب پر بھاری، وہ مکے والی تصویر ہے جس میں صاحبِ مکہ تاریخ کے حاضر امین کی حیثیت سے پورے پوسٹر پر حاوی ہے۔ باتونی کچھ دیر تو ایک سنبھلی ہوئی روانی کے ساتھ بڑا تارہا لیکن پھر طیش میں آکر چیخا۔۔ اوئے تم سب کی ایسی تہیسی۔ آؤ میرے گلے میں بھی پھندا ڈالو اور میرے خاندان کو راتوں رات اٹھا کر کہیں غائب کر دو۔ تم خدا کے نام پر معصوموں کو بھڑکاتے لڑاتے اور اپنی توندیں بھرتے رہے ہو۔ تم بٹے کٹے مزے سے جیے اور مرے لیکن تمہیں کیا پتہ کہ مجموعوں میں بیٹھنے والوں پر کیا ہتی۔ اوئے طاقت کے مدار یوں کے چھوٹے چھوٹے بغل بچو! دوسروں کو کٹ مرنے کا کہہ کر تم کہاں جا چھپتے ہو۔ ملکوں کے نقشے بنانے والو، تم نے تو فقط گورستانوں کے نقشے بنائے ہیں اور وہ بھی ایسے بے ڈھنگے کہ ایک بھی قبر قبہ رخ نہیں۔۔۔ سکول جاتے ہوئے کچھ بچے باتونی کے قریب چپکے سے رکے ہوئے تھے۔ اُس کی باتوں کا لطف لیتے ہوئے انھوں نے تالیاں بجائیں اور پوسٹر اتار کر تصویروں میں تصرف کرتے چلے گئے۔ بغیر مونچھوں والے چہروں پر مونچھیں لگائیں۔ مونچھوں والے چہروں پر داڑھی۔ ٹوپی کی جگہ گھڑا رکھا، شیروانی کو برقعہ بنایا، مکے کو کدو کی شکل دی اور پھر سب کو ایک زنجیر میں پرو کر ایک کھمبا بنایا اور اس سے باندھ دیا۔ بچوں نے پرانے نعرے کاٹے اور نئے نعرے لکھنے کے بجائے اپنے اپنے نام لکھے اور آخر میں باتونی زندہ باد لکھ کر سکول کی جانب چل دیے۔ طاقت اور اس کے طفیلی بچے، بغاوت کی اپنی زبان ہوتی ہے لیکن علم کی زبان کی ترنگ اور ہی اور ہے، اور اس کی تفہیم کے زاویے بھی الگ۔ باتونی نے بدلے ہوئے پوسٹر پر نظر کی اور مسکرایا۔ گھڑا، برقعہ اور کدو اور کھمبے سے بندھی طاقت۔

○

معلوم نہیں یہ خواب ہے یا حقیقت کہ دُکھتے دن ایک بار پھر سے سامنے ہیں۔ مدتوں پہلے کا ایک منظر۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بیچ چوراہے میں ایک شخص آسمان کی طرف ہاتھ بلند کیے کھڑا ہے اور اُس پر جلالی کیفیت طاری ہے۔ اور اس سے پہلے کہ امڈتے ہجوم پر وہ اپنا سحر پھونکتا، کہانی وقت کے دائروں کو توڑتی ہوئی اس کے عین مقابل آن اتری اور لٹکارتے ہوئے بولی: اوئے طاقت کے مدار یوں کے بغل بچے! تُو اور تیرے کام دھندے کی ایسی تہیسی۔ چل بھاگ ادھر سے اور آسمان کے نام پر ہمیں اپنے گھرے ہوئے فرمان نہ سنا اور ان بھولے لوگوں کو گمراہ نہ کر اور اگر تو ایسا کرنے پر بضد ہے تو پہلے اپنی جان پیش کر، دیکھتے ہیں تُو کتنا سچا ہے۔ اور اے سادہ لوح بے خبر تماشا بینو! تم جاؤ اپنے کام دھندے کی فکر کرو۔ آسمان اور آسمان والے کے نام پر تمہیں صرف مرنا سیکھایا گیا ہے۔ اب جینا سیکھو۔ اُس نے تمہیں جینے کے لیے بھیجا ہے۔۔۔ ہجوم نے سنا، سمجھا اور تصدیق کی کہ سچ تو یہی ہے۔ پس انھوں نے آنا فنا چوراہے کے بیچ کھڑے ہوئے کو پکڑا، اُسے برقعہ پہنا کر سر پر گھڑا رکھا اور تالیاں بجائیں اور رخصت ہوئے۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں

چوراہا خالی تھا۔۔۔ پُر شکوہ عمارت کے بڑے کمرے میں بیٹھے سنجیدہ بارعب چہروں والے، کاغذوں پر جھکے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے لیکن کاغذوں کی عبارت غائب تھی۔ مایوسی ٹپکتے ٹپکتے ان کی کرسیوں کے نیچے تک جا پہنچی اور باوجود کوشش کے وہ کچھ بھی طے نہ کر سکے۔ اُن کے سرکد کی طرح جسم کی نیل سے لٹکے نظر آ رہے تھے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پُر شکوہ عمارت کے باہر باتونی پہنچ چکا ہے اور سکول جاتے بچے چپکے سے اُس کے قریب، کھمبا اور زنجیر بنانے کے لیے بے تاب کھڑے ہیں۔



خاور چودھری

داغ

گہرے نیلے قالین کے بالکل وسط میں کہکشاں کا عکس اُتارا گیا تھا۔ دیواروں پر بنفشی رنگوں کی دھاریں سُرخ زمین کے بچوں بیچ یوں اُبھری تھیں، جیسے دھنک میں سے کئی رنگ ایک ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ آتش دان میں سلگتی لکڑیوں سے اب دھواں اُٹھنے لگا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب الاؤ پوری طرح روشن تھا، اُس نے جو رجینا کے چہرے کو بہت کرب و الم سہتے ہوئے دیکھا تھا۔ بچوں سے چھدے ہوئے زخساریوں نظر آئے جیسے دیوار پر بنفشی رنگ سُرخ رنگ کے بیچ سے نکلتا ہوا آنکھوں میں اُترتا تھا۔ اُس نے یاد کے آتش دان میں ایک ایک کر کے سارے خیالات جلانے کی کوشش کی مگر ہر بار سلگتے خیالوں سے بدبو کا ایک بھکا اُٹھتا، جو اُس کے نتھنوں کو چیرتا ہوا اُس کی سانس میں پھانس کی طرح اٹک جاتا۔ اس عمل سے وہ کئی بار گزرا اور ہر بار اُس نے زخمی آنکھوں کو جو رجینا کی دل شکن صورت میں کاشت کر دینا چاہا لیکن وہ تاب بھی تو نہیں رکھتا تھا۔ تب نہیں معلوم کب اُس نے شکست تسلیم کرتے ہوئے اپنے ہی سینے میں آنکھیں اُتار لیں۔

یہ جسموں کو چیرتی ہوئی سخت برفانی ہواؤں کا موسم تھا۔ پولینڈ کے شہر ویلونا گورا میں جب پہلی بار اُس نے گیونٹھ کے ساتھ لوشیا کو ایک جھلک دیکھا تھا تو صدیوں کا فیصلہ ایک آن میں کر لیا۔ اُس نے اپنی بہن گیونٹھ سے کہا تھا: ”پیاری! تو جانتی ہے نا مجھے برفیلی پہاڑیوں پر ایسا تودہ دودھیائی خیموں میں رات گزارنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ پانچ سال اُدھر کے دسمبر میں جب میں اور بریڈ پٹ زاکوپانا میں ایک کیمپنگ کے دوران برفانی خیموں میں بیٹھے رات کی سرگوشیاں سن رہے تھے تو آتش دان میں صندلی لکڑیوں کی لپٹ نے ہمیں ایک خاص سحر میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتا کیا ایسا خاص طلسم تھا لیکن ہم دونوں کسی جادوئی احساس میں گھرے ہوئے تھے۔ یا شاید میں تھا۔۔۔۔۔۔ بریڈ پٹ تو بہت ہی زیادہ مسرور تھا۔۔۔۔۔۔ اور شاید اس کے انبساط کو لوہزے کی بے پناہ محبت اور گرم جوش ساتھ نے مزید بڑھا دیا تھا۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں بتاؤں وہ رات مجھ پر پھر بہت بھاری ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ ہاں گیونٹھ! اُن برفیلے فلک بوس پہاڑوں سے بھی زیادہ بھاری۔ میرا احساس بُری طرح کچل چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس وسیع و بسیط کائنات میں میری ہستی ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں اور بریڈ پٹ ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جب وہ اور لوہزے اُٹھ کر اپنے خیمے میں شب ب سری کے لیے چلے گئے تو باہر کی تمام برفیلی رُت نے میرے اعصاب جکڑ لیے تھے۔ الاؤ پوری طرح روشن تھا مگر میرا وجود برف اوڑھ چکا تھا اور دماغ میں کوئلے سلگنا شروع ہو گئے تھے۔ گیونٹھ! تمہیں کیسے بتاؤں میری پیاری۔۔۔۔۔۔ کیسے بتاؤں؟ آہ! میرا داغ دار سینہ!“

گیونٹھ نے محسوس کیا جیسے اُس کا بھائی کوئی نفسیاتی گتھی سلجھانے کی کوشش میں ہے یا پھر کسی نا آسودگی کا جان لیوا احساس اُس کے اعصاب پر طاری ہو رہا ہے۔ اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

”اسٹالر! ٹھیک تو ہونا میرے پیارے بھائی! _____ میں متحس ہوں اور سچ کہوں تو حیرت آمیز دُکھ محسوس کرتی ہوں۔ تم جلدی سے کہو جو بھی کہنا ہے۔“

”گیونٹھ! یہ دیکھ _____ ہاں دیکھ یہ خنجر کا نشان _____ یہ اُسی رات کا تھنہ ہے _____ میں نے وہ پہاڑ ایسی ٹھنڈی رات اپنے خون سے گرم کی تھی۔ میری چیخیں سُن کر بریڈ پٹ اور لوئزے دیوانہ وار بھاگتے چلے آئے تھے _____ تب میں بے ہوش ہو چکا تھا اور جب ہوش آیا تو زاکو پانا کی منج بستہ پہاڑیوں سے پانچ میل دُور ایک چھوٹے سے طبی مرکز میں تھا۔“

”میرے بھائی! تم نے تو ماں کو بتایا تھا کہ کیمپنگ کے دوران خیمہ تانتے ہوئے تمہیں زخم آیا۔“

”ہاں _____! یہی بتایا تھا _____ پیاری گیونٹھ! ہماری ماں کتنی حساس تھیں، کیا تم نہیں سمجھتی ہو میں اُنہیں سچ بتا دیتا تو وہ میرے دُکھ میں بہت تیزی سے گھل جاتیں۔ کیا بھول گئی ہو اُبانے جب کسی اور میں دلچسپی لینا شروع کی تھی، تب ماں نے بغیر انتظار کیے اُن سے علاحدگی اختیار کر لی تھی اور پھر اپنی ساری جوانی ہماری خواہشوں پر قربان کر دی _____ میں کیسے اُنہیں مزید دُکھ دے سکتا تھا _____ کیسے گیونٹھ! تم کہو _____“

باہر تیز ہواؤں کا شور درختوں کی ٹہنیوں کو رونے اور گر لانے پر اُکسا رہا تھا _____ کہیں کہیں پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ اور چیخ چانچ بھی سماعتوں میں اُترتی جاتی تھی۔ یہ اکتوبر کی شام تھی۔ ہلکی سردی مگر دونوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ غالباً دونوں کو تنہائی کے منج بستہ موسموں نے چاٹ لیا تھا _____ یا پھر _____ واقعی باہر کے منظر نے برفیلی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کی دیواروں میں کھدی ہوئی کھڑکی پر گہری سبز رنگت کے پردوں کے ارتعاش نے دونوں کو باہر پھیلنے والے منظر کی جانب متوجہ کیا۔ دفعتاً گیونٹھ نے لپک کر پردہ ہٹایا تو اُن کے چھوٹے سے صحن میں زمانوں سے ایستادہ درخت زمین کا منہ چوم رہا تھا۔ شاید بادِ صصر نے اُس کے پتوں اور ٹہنیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی جڑیں بھی اکھاڑ دی تھیں _____ ایک لمحے کے لیے گیونٹھ کو خیال آیا:

”شاید اس کی بے شرمی نے اسے ندامت سے مار دیا ہے _____“ پھر دوسرا خیال آیا: ”تو کیا بانجھ درختوں کو جینے کا کوئی حق نہیں؟“

پھر خود کلامی کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی تو اسٹالر کو عجیب سا احساس ہوا _____ بالکل عجیب _____ وہ نہیں سمجھ سکا کہ اُس کی بہن نے کیا کہا _____ اسٹالر نے سوچوں کا انبار جھٹک کر اپنے دماغ سے ہٹا دیا _____ اُس نے برادرانہ محبت سے اپنی بہن کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے _____ اُس کے ماتھے پر بوسہ ثبت کیا اور پھر کھڑکی سے ہٹا کر واپس کرسی پر لے آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب دوبارہ اس موضوع کو اُستوار کرنا مشکل ہے، کیوں کہ گیونٹھ ایسے حالات میں ہیجان کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔ خود اسٹالر کا بھی یہی حال تھا۔ شاید والدین کی جدائی اور پھر ماں کی اچانک موت نے دونوں کو خوف زدہ کر دیا تھا _____ یا پھر ضرورت سے زیادہ

مخاطب _____ من کی من میں رہی _____ اور _____

اگلی صبح بڑی گرم جوشی سے گیونٹھ نے ناشتے کی میز پر اپنے بھائی کو بتایا کہ ان کے پڑوس میں ایک ہندوستانی خاندان آکر آباد ہوا ہے۔ ان لوگوں نے کدو کا حلو بھیجا ہے۔ یہ خاص سوغات ہے۔ ہمارے یہاں تو کدو کا ایسا استعمال کبھی نہیں ہوا _____

لیکن اسٹالر بات وہیں سے شروع کرنا چاہتا تھا، جہاں سے رات منقطع ہوئی۔ اُس نے اپنی بھنوں کو ایک خاص انداز سے سیڑتے ہوئے تجسس ظاہر کیا۔ بہن نے پلیٹ اُس کی جانب بڑھائی۔ چچ بھر حلو اُس نے اپنی پلیٹ میں ڈالا اور دوبارہ بات شروع کی:

”تو میں تمہیں بتا رہا تھا مجھے بریلے پہاڑوں پر وقت گزارنا کتنا اچھا لگتا ہے _____ اُس سانچے کے بعد ہمت ہی نہیں ہوئی _____ اب جولو شیا کو دیکھا ہے تو _____“

اُس نے ملتی جلتی نظروں سے بہن کی جانب دیکھا تو وہ ایک خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ طوفانی ہواؤں نے ہر جانب ادا سیاں پھیلا دی تھیں۔ اُن کے صحن میں قدموں سے اُکھڑا ہوا درخت کسی بے موت مرنے والے کی مانند بے طرح پڑا تھا۔ دفعتاً گیونٹھ نے کہا:

”اسٹالر! میں سوچتی ہوں ہمیں فوراً یہ درخت یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔ زخموں اور داغوں کا جس قدر ممکن ہو علاج ہو جانا چاہیے۔“

”ہاں! شاید _____ تم ٹھیک کہتی ہو _____ میں آرا اور کلکھاڑی نکالتا ہوں _____ آج اندازہ ہوا اماں نے یہ آواز کیوں گھر میں رکھے تھے _____ وہ جانتی تھیں کہ زخموں اور داغوں کو خود ہی سنبھالنا پڑتا ہے _____ گیونٹھ میں کہ رہا تھا _____ لوشیا _____“

”اسٹالر! کل شام آندھی آنے سے پہلے یہاں پرندوں کی چچہاہٹ کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بار آوری کا زمانہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بعض پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دیکھو، یہ ٹوٹی شاخ ابھی تک آشیانے کا لمس محسوس کرتی ہے _____ بالکل اسی جگہ _____ ہاں اسٹالر اسی جگہ پرندوں کا گھونسلہ تھا _____ تم جانتے ہونا! پرندے مضبوط اور خم دار ٹہنی پر گھونسلہ بناتے ہیں۔ ایسے مقام کا انتخاب کرتے ہیں، جہاں ہوا کا دباؤ کم ہو جائے _____ جہاں _____“

”پیاری گیونٹھ! تم کیا پہیلیاں بکھو رہی ہو _____؟ میں نہیں سمجھتا کہ میری اتنی اہم بات کو تم ایسی باتوں میں کیوں اڑا رہی ہو۔ میں کہ رہا تھا لوشیا بہت پیاری ہے _____ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”شاید _____ اسٹالر! گھونسلے ٹوٹنے کے لیے ہی بنتے ہیں _____ ہر بار تباہ کن ہوائیں پرندوں کو بے گھر کر جاتی ہیں _____ پرندے آشیانے بنانے سے نہیں رکتے اور ہوائیں تباہی پھیلانے سے _____ یہ آفاقی سچ ہے لیکن اپنے بانجھ درخت پر ٹوٹنے والے گھونسلے نے بہت دکھی کر دیا ہے۔ میں رات بھر نہیں سوئی میرے بھائی! بالکل ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ میں سوچتی رہی کہ موسم کس طرح اپنا غصہ کم زوروں پر اتارتے ہیں _____ کس طرح شاخیں ٹوٹی اور درخت جڑوں سے اُکھڑتے

ہیں _____ کس طرح زمین کا سینہ چھلنی ہو کر داغ بن جاتا ہے۔“
 ”میری بہن! تو لوشیا کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہی؟ تمھاری سہیلی ہے _____ تم اُسے اچھی طرح جانتی ہو _____
 بتاؤ نا کیسی ہے وہ؟“

”یہ دیکھو! ظالم ہوانے میری نئی پیٹنگ کا بھی ناس مار دیا _____ کل ہی تو آخری ٹچ دیا تھا اسے _____ صورتیں بھی تو
 بگڑنے کے لیے ہی بنتی ہیں _____ اچھا چھوڑو _____ جینا ہے، تو مرنا ہے _____ بننا ہے، تو بگڑنا ہے _____ تم
 لوشیا کا پوچھ رہے ہو؟“

”ہاں ہاں _____ ہاں _____ میری پیاری گیونٹھ جلد بتاؤ نا کیسی ہے وہ _____؟“
 ”اسٹالر! کیا تم نہیں چاہو گے کہ تمھیں ایک تازہ دم بلکہ تروتازہ پھول اپنے کالر میں سجانے کو ملے _____؟“
 ”مائی لو! کیوں نہیں _____ میں ہمیشہ سے یہی سوچتا آیا ہوں _____ لوئزے کی طرح بے پناہ اور گرم جوش محبت کرنے
 والا ساتھی۔“

”لیکن لوشیا غچہ نو بہا نہیں۔ اُس کا بوائے فرینڈ اُسے چھوڑ چکا ہے۔ اُس کی گود میں مغنی اساریہ بھی ہے۔“
 زا کو پانا پر پھیلی ہوئی برف کی تہیں اب براہ راست اسٹالر کو اپنے سینے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے سوچا شاید گیونٹھ اسی
 لیے اُس کی بات کو ٹالتی رہی۔ نہ سہی غچہ نو بہا _____ ابا نے بھی تو چھ بچوں کی ماں کے لیے ہماری اماں کو چھوڑ
 دیا تھا _____ شاید لوشیا، لوئزے کی طرح گرم جوش ہو اور اُس کا ساتھی زا کو پانا کی منہ بستہ چٹانوں کی مانند _____ لیکن میں
 ایسا نہیں ہوں _____ میری ساتھ وہ خوش جیے گی۔ اسٹالر نے نہایت تیزی سے اپنی سیاہ شرٹ کا بٹن چھاتی کے پاس سے کھولا
 اور سینہ ننگا کر کے اپنے بہن کو دکھایا:

”پیاری گیونٹھ! تم چاہتی ہو میرے سینے پر ایک اور داغ کا اضافہ ہو جائے _____؟“
 ”ہرگز نہیں _____ ہرگز بھی نہیں _____ تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو _____ ہر کوئی اپنے فیصلوں میں آزاد
 ہے _____ پرندے گھونسلہ بنانے میں اور ہوائیں تباہی مچانے میں آزاد ہیں۔“

لوشیا اور اسٹالر کا ساتھ چار سال سے کچھ دن زیادہ رہا۔ اُس نے بہت چاہا کہ کسی طرح ایک رات کے لیے ہی سہی، وہ اُس
 کے ساتھ زا کو پانا کی اُس چوٹی پر شب ب سری کے لیے چلی چلے، جہاں اُس نے بریڈ پٹ اور لوئزے کو گرمی محبت میں
 سرشار دیکھا تھا _____ جہاں اُسے پہلی بار احساس ہوا تھا، کہ عورت کا وجود ایک مرد کے لیے کتنا ضروری ہے _____ جہاں
 اُسے لگا تھا کہ کائنات کے تمام رنگوں میں پختہ رنگ عورت کا ہے۔ تمام ذائقوں میں سب سے رسیلا ذائقہ عورت کا ہے۔ تمام خوشبوؤں
 میں سب سے مسرور کن اور سحر آمیز خوشبو زلفوں کی ہے۔ اب مگر وقت جوں جوں گزر رہا تھا، اُس کے محسوسات میں اُداسی بڑھتی جاتی

تھی۔ اسٹالر کو بارہا یہ گمان گزرا کہ یا تو وہ زاکوپانا کے برقیلے تو دوں کی مانند ہو گیا ہے یا پھر لوشیا _____ پھر اساریہ کے چوکڑی بھرتے قدموں کو پکڑنے والا بھی تو کوئی نہیں آسکا تھا۔ اسٹالر نہیں سمجھ سکا تھا آخر چار سال میں ایک بار بھی شاخوں پر یورکیوں نہیں آیا؟ اُس کا تنومند، تروتازہ، گرم جوش اور جذبول سے بھرا ہوا جسم بے نمو ہوگا _____ وہ ایسا نہیں سوچتا تھا _____ پھر لوشیا کی گود میں تو اساریہ _____ یہ خیال اُس کی جان لینے کو بہت تھا۔ تب تیز طوفانی ہواؤں نے شاخوں سے گھونسلہ جھٹک دیا۔

زمانوں تک وہ اپنے ریزہ ریزہ وجود کے تنکے چنتا رہا _____ چنتا گیا _____ یہاں تک کہ اُس نے اپنی قوت مجتمع کر لی۔ یہ ایسٹر کی رات تھی۔ اُس نے سوچا:

”نئی رُتوں سے ہم کلامی نہ سہی، کسی کو ہم کلام ہوتے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ _____ میں ضرور کلب جاؤں گا _____ جی ہر کے رقص کروں گا _____ جام چھلکاؤں گا _____ نڈھال ہو جاؤں گا _____ تو نہال ہو جاؤں گا۔“

رات بہت گہری اور پُراسرار تھی اور اُس کے محلّے کی بے چراغ گلیوں میں زمانوں بعد ققموں کی بہاریں اُترتی تھیں۔ اُس نے دودھیائی رنگت کا ٹوپس سوٹ زیب تن کیا اور اُس پر نہایت سُرخ رنگ کی ٹائی یوں لگائی جیسے ابھی کسی بندھن میں بندھنے جا رہا ہو۔ کوٹ کی جیب میں سُرخ ادھ کھلا گلاب ایک خاص وضع سے لٹکایا اور پھر ایل یو پر فیوم سے اپنا سراپا معطر کر لیا۔ یہ معمول کے خلاف تھا، اس لیے کہ اُس کا پسندیدہ پر فیوم تو پلے بوائے تھا۔ اتنا پسندیدہ کہ کبھی تو اُسے لگتا تھا کہ پلے بوائے کمپنی نے یہ پر فیوم اسی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ اب مگر ایل یو کی پلٹیں اُس کے آس پاس کے وسیع رقبے کو مہر کا رہی تھیں۔ اُس نے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ ٹائی کی گرہ دُرست کی۔ بھنویں ہموار کیں۔ اُلگیوں سے بال سنوارے اور پھر کندھے اُچکا کر بہ غور اپنا جائزہ لیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اُس نے کوٹ کے دونوں کندھے دُرست کیے۔

ایک مخصوص میز پر اُس کا دوست ایگر سن پہلے سے موجود تھا۔ اسٹالر کی تروتازگی موجب حیرت تھی تو باعث خوشی بھی۔ کچھ کچھ تو وہ دیکھتے ہی بھانپ گیا _____ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اسٹالر خود بتائے زمانوں بعد اسے کلب آنے کا خیال کیوں کر آیا _____ آخر کیوں _____؟

”ایگر سن! تم نے مچلتے تاروں کو اندھیری شب میں کبھی دیکھا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں _____ تمہیں کیا لگا؟“

”بس یوں سمجھ لو میں جینے کی آرزو میں ہوں اور شبِ تاب میں اپنا حصہ تلاش کرنے نکلا ہوں _____ ہاں اپنا حصہ _____“

”تو گویا چاند کو گرہ لگانے کی خواہش میں ہو۔“

”کہہ سکتے ہو _____ تم سناؤ۔“

مینو کارڈ پیش کرتے ہوئے ایک اُپسرا اُس کے سامنے یوں کھڑی تھی، جیسے دیودار کا فلک بوس درخت کہساروں

میں ایستادہ۔ کھلتی ہوئی آواز میں لفظ کیا تھے، سُروں کا جلتی رنگ تھا، گویا بادِ نسیم کی مانند سانسوں میں گھل گئے ہوں۔ اسٹالر عالمِ محویت میں یہ سوچ بھی نہ سکا کہ کہاں بیٹھا ہے۔ تب ایگرسن نے سکوت کی دیوار کاٹتے ہوئے کہا:

”یہ جو رہینا ہے۔ کلب کی نئی مینجر _____ نئے آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے خود آتی ہے۔ یہ اس کا انداز ہے اور مہمان نوازی کا جذبہ بھی۔“

”ہوں۔ _____ اچھا اچھا۔ _____ اچھا لگا انھیں دیکھ کر۔“

وہ تو مسکراہٹیں بکھیر، آڈر لے چلی گئی لیکن اسٹالر کی آنکھوں میں مجسمِ منظر چھوڑ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اُس نے ایگرسن کو مخاطب کر کے کہا: ”پیاری ہے نا _____؟“

”بہت پیاری _____ لیکن مچھلی ہے _____ تیرے ہاتھ نہیں آنے کی۔“

”آہا _____!! _____ دیکھتے ہیں _____ تم نے ورڈز ور تھ کو تو پڑھا ہوگا _____ میں اس کا ایک سانیٹ سُناتا ہوں۔ ایسی ہی کسی کیفیت میں اُس نے کہا ہوگا، جس کا میں شکار ہوا _____ سُنو تو:

حسن میں ڈوبی ہوئی یہ شامِ آزاد و خموش
اور یہ درمندانہ سورج ، یہ غروبِ بے صدا
یوں فضاؤں میں مقدّس وقت ہے ٹھہکا ہوا
جیسے کوئی رہبرِ محوِ دعائے بے خروش
لے رہا ہے چرخ ، سطحِ آب پر انگڑائیاں
جاگتا ہے چرخ پر یزدانِ توانا و غنی
سرمدی حرکت میں ہے اس طرحِ محوِ سرخوشی
گوئی ہو جس طرحِ پیہم کوئی برقِ تپاں
تو مرے ہمراہ ہے اس وقت مری جانِ جاں
تجھ پہ گو فکرِ گراں کا یہ فسوں طاری نہیں
فطرتِ احساس الوہیت سے تو عاری نہیں
خُلد کی آغوش میں دیتی ہے تجھ کو لوریاں
بارگاہِ ایزدی میں سرنگوں تیری جبیں
تو خدا سے ہم نوا ، ہم کو خبر کچھ بھی نہیں

O

”جورجینا! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری گرم رومجبت کی تمنا میں تمہیں کانٹوں میں گھسیٹ آیا۔ درندوں کے سامنے ڈال آیا۔“

وہاں لفظ مگر مر چکے تھے _____ جذبے راکھ ہو چکے تھے _____ خواہشیں مٹی اوڑھ چکی تھیں _____ وہ کیا کہتی _____ !!

بوٹوں والے اُسے لینے آئے تھے مگر اس کس پرسی میں دیکھ کر شاید انھیں رحم آگیا _____ یا شاید اُن کا جی اس سے بھر گیا تھا _____ کچھ بھی تھا، لیکن انہونی تھی _____ اب ایک اور نادیدہ منزل اُن کے سامنے تھی _____ کھیون اور ایوز خاک میں چوڑیاں بھرتے تھے۔ انھوں نے ماں کو داغ دار ہوتے محسوس کیا تھا _____ دیکھا تھا، برتا تھا _____ اب ایک طرف وہی داغ دار وجود تھا _____ تو دوسری جانب اسٹالر کا بے بس جسم _____ ایک گہری اور تصور کو قتل کر دینے والی خاموشی کا راج تھا، ایسے میں اسٹالر کو ایک بھیانک خیال نے آدبوچا _____ ایسا خیال جو اُس کی روح کو زخمی کیے جا رہا تھا _____ اُس نے سوچا:

”جور جینا کی روح پر داغ کس کا ہے _____؟ میرا _____ مائیکل ڈی سوزا کا _____ پالی کمہار کا _____ رانا کل دیپ کا _____ یا پھر ابونصیر کا _____ اگر طے ہو جائے تو بچوں کو اُن کی درست نسبت کے ساتھ یاد کرنے کا انتظام ہو سکتا ہے۔“

شکیل انجم راجا

انسان مرتا بھی ہے!!

وہ بھی بدن سے مغلوب ہو گیا تھا۔۔۔ بات بس اتنی سی ہے کہ سردی ان دنوں زوروں پر تھی اور وہ شباب کی گرمی سینکتا، صف در صف احرام بندھے کھڑے پہاڑوں کی طرف نکلتا چلا گیا تھا۔

جب کوئی بلند یوں سے گرتا ہے یا بلند یوں کو چھوتا ہے تو کہانیاں بنتی ہیں قصے جنم لیتے ہیں۔ ان دنوں اس مردم بے زار کی تخیلی دنیا میں کوئی بھی جیتا نہ تھا، وہ ہر نگاہ کا مرکز تھا مگر اس کی سوچوں کا محور کوئی نہ تھا، وہ بولتا کم کم تھا یہ اس کا کوئی نفسیاتی حربہ نہ تھا بل کہ وجود کے تیز زار میں متحیر وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو چلا تھا۔۔۔ چال جیسے پل صراط پر چلتا ہوا اور گفتگو۔۔۔ لفظوں کا ضیاع جیسے گناہ ہو۔ الغرض اس کے وجود میں کوئی شے کم تھی نہ زیادہ۔ اس احساس نے بھی شاید اسے فتح و شکست کے کھیل پر اکسایا ہو۔ بات کچھ بھی رہی ہو وہ لگتا بڑا ہی محترم تھا۔

حسن کی قدر شناسی انسانی فطرت کا خاصا ہے۔ اس کا ذوق جمال بھی حد کمال کو چھوتا تھا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ وہ شرم و حیا کا پیکر بھی لطیف چاندنی کا پجاری تھا۔۔۔ دولت کی ریل پیل ہوئی تو سب کچھ تلپٹ ہو گیا، خوشبو ہواؤں میں بھگ گئی، کاغذی پھولوں کا چلن عام ہوا اور وہ گھر کی تلاش میں بے گھر ہو گیا۔ وہ گھر سے نکلا تو اکیلا تھا پر خالی سڑک کے اطراف و جوانب میں ایستادہ چھتتار درخت بانہیں پھیلائے اسے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ کبھی وہ لہلہاتی کھیتوں سے جا کھلتا تو کبھی پہاڑوں کا بے انت پیار اس کی آنکھوں میں اتر آتا۔۔۔ پھر اوور ٹیکنگ کرتی کسی گاڑی کا بجتا ہارن اچانک اسے اپنی کار میں کھینچ لاتا اور اسی کھینچ تان میں وہ مری جا پہنچا۔

اس نے ہوٹل میں کمرہ بک کروایا، کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سیر کو نکل پڑا۔ برف باری جاری تھی اور وہ بہت دور نکل آیا تھا جہاں آبادی کا نشان تک نہ تھا یلخت ہوا چیخنے لگی، جاگ اٹھی اور سفاک شام نے جھکے ہوئے سورج کا سر قلم کر دیا۔ وہ اس چیخ دھاڑ میں گھر اشہر کی طرف پلٹ پڑا محتاط رفتار۔۔۔ وہ آگے کو بڑھ جانا چاہتا تھا کہ برف سا اک مجسمہ ہیڈ لائٹس کی ضو میں نہا گیا، جس کے بدن کا ہر ہر عضو اپنی اک الگ شخصیت رکھتا تھا، وہ کھوسا گیا۔۔۔ اسی اثنا میں گیٹ کھلا اور فرنٹ سیٹ روشن آباد ہو گئی۔ اس نے کار آگے بڑھادی۔ لڑکیوں سے گفتگو کا ڈھنگ اسے آتا نہ تھا اور وہ جو کوئی بھی تھی اس کے ہونٹ بھی یا قونی یا پھر پھری سردی نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ اسی خاموش فضا میں کار ہوٹل کے لان میں آ رکی۔ ہوٹل کے اندر پہنچنے تک سردی کے کئی شدید جھونکے ان دونوں کے بیچ میں سے گزر گئے۔ اس نے گاؤنٹر سے چابی لی اور ایک ہی سان میں تمام سیڑھیاں چڑھ گیا، پیچھے مڑ کے دیکھا تک نہیں، تالا کھولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اٹیچ باٹھ میں جا گھسا۔۔۔ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ برف کا وہی مجسمہ جس کے بدن کا ہر ہر عضو اپنی اک الگ شخصیت رکھتا تھا اور جس کے ہونٹ بھی یا قونی تھے، اس کے لباس میں گھسا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ اس بے تکلفی پر ٹھنکا ضرور مگر جلد ہی سنبھل گیا، ہیئر آن تھا، سردی کا احساس کم ہوا تو دونوں اپنے اپنے پیٹ میں اتر گئے۔

باہر نکلے تو مکمل سکوت تھا اور تمام کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ پھر طوفان آ گیا اور کھڑکیاں دروازے کھڑکھڑانے لگے۔ باہر برف کا شدید طوفان اور اندر آگ کے اندر آگ عجب طرح کی بے چارگی تھی۔ شرم کی دیواریں اٹھتی گرتی رہیں تھکن اس کے انگ انگ پر سوار تھی، وہ جلتے ہیٹر کے پاس کارپٹ ہی پردراز ہو گیا اور نیند کی آنچ پر کوس بنتا چلا گیا ادھر کمرے میں بھری حدت سے مجسمہ پکھلتا رہا، کارپٹ بھیگتا رہا۔ ادھر لگی آگ میں سلگتا بدن رفتہ رفتہ کوندہ ہو گیا۔ برف بہہ نکلی اور آگ بجھ گئی، دھواں منظر، جس اور گھٹن۔۔۔ جسم جسم میں تحلیل ہو گیا اور بدن کے بوجھ تلے اس رات اس نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں گئیں۔





کچھ اور تو ہم بے ہنروں سے نہ بن آئی
جب زخم لگا ، زخم سے بُوئے سُخُن آئی

دروازہ ہوا بند تو ، لَو دینے لگا دل
کوئی نہ رہا جب تو پھر اک انجمن آئی

اک درد بہ اسلوبِ تنزّل مہک اُٹھا
اک یاد بہ اندازِ غزالِ خُتن آئی

وہ جلوہ گری ہے کہ نظر کچھ نہیں آتا
تم آئے کہ آئینے کے اندر کرن آئی

کیا دردِ نہاں حرف و بیاں میں سمٹ آیا
کیا روح پہ بھی راست قبائے بدن آئی



O

میانِ عرصہ موت و حیات رقص میں ہے
 اکیلا میں نہیں کل کائنات رقص میں ہے
 ہر ایک ذرہ ہر اک پارہ زمین و زمان
 کسی کے حکم پہ دن ہو کہ رات رقص میں ہے
 اتاقِ کنگرہ عرش کے چراغ کی لو
 مری گلی کے فقیروں کے ساتھ رقص میں ہے
 سنائی ہوں کہ وہ عطار ہوں کہ رومی ہوں
 ہر اک مقام پہ اک خوش صفات رقص میں ہے
 یہ جذب و شوق یہ وارفتگی یہ وجد و وفور
 میں رقص میں ہوں کہ کل کائنات رقص میں ہے
 مجال ہے ، کوئی جنبش کرے رضا کے بغیر
 جو رقص میں ہے اجازت کے ساتھ رقص میں ہے
 میں اپنے شمس کی آمد کا منتظر تھا ، سواب
 مرے وجود میں رومی کی ذات رقص میں ہے





محافظِ روشِ رفتگاں کوئی نہیں ہے
جہاں کا میں ہوں مرا اب وہاں کوئی نہیں ہے

گزشتگانِ محبت کے خواب لکھنے کو
ابھی تو میں ہوں مگر بعد ازاں کوئی نہیں ہے

ستارگاں سے جو پوچھا کہ اس طرف کیا ہے؟
جواب آیا کہ اے جانِ جاں! کوئی نہیں ہے

نگاہِ یار، نہ آب و ہوا، نہ دوست، نہ دل
یہ ملکِ عشق ہے یاں مہرباں کوئی نہیں ہے

فلک پہ چاند ستارے زمیں پہ سبزہ و گل
بس ایک میں ہوں کہ میرا نشان کوئی نہیں ہے





سواری نہ خیمہ نہ پانی یہاں
 جہی کی ہے نقل مکانی یہاں
 شکستہ سی قبر اس کے پہلو میں تھی
 وہ بستی کہ تھی جو پُرانی یہاں
 اگر چرخ اُترا زمیں پر کبھی
 بدل دوں گا اس کے معانی یہاں
 چمن جھاڑ جھنکار سے اٹ گئے
 عجب تُو نے کی باغبانی یہاں
 ہیں اندھے ترے دور میں کوتوال
 کریں تو تلے قصہ خوانی یہاں
 ترے عہد میں غرق سارے ہوئے
 دُخانی تھے یا بادبانی یہاں
 بہت دیر تک روئے گا بادشہ
 سُنّاؤں گا ایسی کہانی یہاں
 یہ کوٹھی ہے صاحب ! ترے عشق کی
 ملازم ہیں ہم خاندانی یہاں



O

خلوت ہے، وصال ہے، طرب ہے
 آغاز کا بالکلین غضب ہے
 فردوس بریں ہے یا جہنم
 مخلوقِ مجاز لب بہ لب ہے
 ہے جن کو گزارنا سحر تک
 دو زندگیاں ہیں ایک شب ہے
 حد سے جو نکلنے دوں نہ ٹھجھ کو
 تو میرے حصارِ دل میں کب ہے
 اب میں بھی نہیں ہوں پاس اپنے
 سو تیری بہت ضرورت اب ہے
 عشاق کے نقشِ پا ہیں آگے
 رُک جاؤ کہ یہ رہِ ادب ہے
 مجنوں سے نہیں ظفر سے پوچھو
 کیا عشق کا شجرہ نسب ہے



(۱)

ہو گی نہ مجھ فقیر سے تعبیر ہست و بود
 یعنی رہوں گا آج بھی نخبیر ہست و بود
 کیا رُک سکے گا میری ہزیمت کا سلسلہ
 کیا ٹوٹ پائے گی کبھی زنجیر ہست و بود
 میں کھو گیا صباحتِ فردا کے کھوج میں
 پائی مرے وجود نے تنویر ہست و بود
 کیوں کر مجھے پسند نہ آئے گی چاند رات
 بڑھتی ہے اس چراغ سے تنویر ہست و بود
 کوئی نہیں ہے نجمِ صداقت سے ماورا
 ہر آدمی پہ فرض ہے توقیر ہست و بود
 کیا مل سکیں گے صبحِ درخشاں سے میرے خواب
 کیا کر سکوں گا میں کوئی تدبیر ہست و بود
 ساجد کھڑا ہوں شمعِ بصارت کے روبرو
 رکھی ہے طاقِ صبر پہ شمشیر ہست و بود

(۲)

کیا کر سکیں گے خاطرِ تقدیم ہست و بود
 کیا ہو سکے گی آپ سے تنظیم ہست و بود
 مٹ جائے گا لطافتِ دوراں کا نام بھی
 گرا ب بھی کی نہ جائے گی ترمیم ہست و بود

کیا جمع ہو سکیں گی مرے گھر میں راحتیں
 جب میرا کام صرف ہے تقسیمِ ہست و بود
 گر ہو سکے تو معبدِ اسرار کھولے
 ہوگی نہ شرحِ خواب سے تقسیمِ ہست و بود
 جب تک جُڑا ہے صبحِ ارادت سے میرا نام
 لازم ہے میری ذات پہ تعظیمِ ہست و بود
 ساگر اُچھالے ، کبھی آنکھیں اُچھالے
 ہوگی اسی خمار میں تقویمِ ہست و بود
 کوئی دکھائی دے گیا ، کوئی نہیں دکھا
 طاری ہے میرے ذہن پہ تنویمِ ہست و بود
 شاید کہیں سلوک کی منزل دکھائی دے
 بے کار اگر ہوئی کہیں ترقیمِ ہست و بود
 ساجد میں اُس چراغ کا احسان مند ہوں
 کرتی ہے جس کی روشنی تعمیمِ ہست و بود

(۳)

پارینہ ہے صباحتِ انجیلِ ہست و بود
 یعنی رہوں گا آج بھی نخبیرِ ہست و بود
 بے شک مجھے وجود سے کوئی غرض نہیں
 لکھی ہے پھر بھی روح پہ تفصیلِ ہست و بود
 ہر چند میری کیمیا فردا نژاد ہے
 میں کر رہا ہوں آج بھی تعمیلِ ہست و بود

شب بھر اسی نواح میں پھیلے گی روشنی
 ہوگی مرے چراغ سے ترسیلِ ہست و بود
 تبدیل ہو سکا نہ مرے شہر کا مزاج
 میں بھی وہی ہوں اور وہی تمثیلِ ہست و بود
 سوؤں گا دیر سے کبھی جاگوں گا دیر سے
 کم ہوگی جب بھی راحتِ تجھیلِ ہست و بود
 ساجد کتابِ لذتِ دیروز کھولے
 کرنے لگے ہیں آئے ترتیلِ ہست و بود

(۴)

کم پڑ رہی ہے راحتِ امکانِ ہست و بود
 ظاہر ہوا ہے غیب سے عنوانِ ہست و بود
 خود پر نگاہ کی ، کبھی اُس پر نگاہ کی
 لکھا تھا ہر کتاب میں فرمانِ ہست و بود
 شاید اُسے بھی شوق ہے تعبیرِ ذات کا
 کچھ دن سے میرا خواب ہے مہمانِ ہست و بود
 میں بھی نثار ہوں گا کسی گلِ عذار پر
 آیا جو میری راہ میں بُتانِ ہست و بود
 آئیں ذرا سی دیر کو نکلیں گے اُس طرف
 کل سے بہت اداس ہے لبنانِ ہست و بود
 لکھی ہیں ہر مقام پہ فردا کی راحتیں
 پڑھیے ذرا سا غور سے دیوانِ ہست و بود

ساجد زمیں، شعر سنبھالی نہ جائے گی
کمزور پڑ گیا اگر ایمانِ ہست و بود

(۵)

دیکھا جو میں نے پھاند کے دیوارِ ہست و بود
پیشِ نظر تھے پھر وہی آثارِ ہست و بود
ہر چند رخسِ عمر کو مہمیز بھی کیا
کم ہو سکی نہ بڑھ سکی رفتارِ ہست و بود
جب رزق ہو چکے ہیں مرے خاکِ داں کا آپ
اب وضع کیجیے کوئی معیارِ ہست و بود
اک عمر سے ہوں راحتِ فردا کا ہم قدم
اس بار سر پہ آ پڑا ادبارِ ہست و بود
اُس نے کنارہ کر لیا تقویمِ ذات سے
لکھ کر مرے نصیب میں اثمارِ ہست و بود
آزاد ہو نہ پاؤں گا میں اپنی قید سے
میں کر سکوں گا کیا کبھی انکارِ ہست و بود
خوش ہے نہ خوش رہے گا یہاں کوئی مشتری
روزِ ازل سے تیز ہے بازارِ ہست و بود
کل کو کسی طرح مری دُنیا بدل بھی جائے
پھر بھی بدل نہ پائیں گے اطوارِ ہست و بود
ساجد کسی سے کوئی شکایت نہیں کہ اب
ہے ناخدا کے ہاتھ میں پتوارِ ہست و بود





رابطوں کے درمیاں سے اک کڑی گم ہو گئی
 یوں لگا جیسے اچانک زندگی گم ہو گئی
 گھر سے نکلے تو بس اک ماں کی دعا تھی جیب میں
 وقت کے میلے میں پہنچے تو وہی گم ہو گئی
 یارِ کم آمیز کے گھر کا نشان کیا ڈھونڈتے
 ہم سے تو خود اپنے ہی گھر کی گلی گم ہو گئی
 صبح کی پہلی کرن میں جگمگانا تھا جسے
 رات کے پچھلے پہر وہ روشنی گم ہو گئی
 عشق کی خاطر تو یہ آوارگی اپنائی تھی
 اور اس آوارگی میں عاشقی گم ہو گئی
 کون تھے، کس بات پر روٹھے، پتا کیسے چلے
 جس میں یادیں درج تھیں، وہ ڈائری گم ہو گئی
 جس میں اپنی خواہشوں کی ناؤ بہتی تھی حسن
 دکھ کے کالے پانیوں میں وہ ندی گم ہو گئی



(۱)

جب بھی اس کی یاد سے پوچھوں تب حیرانی ہو
 تم بھی اک دن مر جاؤ گی؟ تم بھی فانی ہو؟
 اک دوجے کے پاس کھڑے ہم اب یہ سوچتے ہیں
 دیکھیں کس دانا سے اب پہلی نادانی ہو
 ویسے تو میں خاموشی بھی سنتا رہتا ہوں
 لیکن مجھ سے باتیں کرنا جب آسانی ہو
 دیکھو اس بھوبھل میں مجھ کو زندہ رہنا ہے
 بے شک آگ نئی ہو لیکن راکھ پرانی ہو
 رات گئے جب سناٹے میں درد الپ کرے
 ٹھنڈی نرم ہوا ہو اور دیپک کلیانی ہو
 یہ سیارہ تم سے زندہ اور تابندہ ہے
 تم تو میری مٹی پر ہو جیسے پانی ہو
 مشعل والو! اچھا جاؤ اپنا کام کرو
 میرے ساتھ وہ آئے جس نے آگ بجھانی ہو
 نخلستانو! سبز رہو تم، اب میں چلتا ہوں
 دیکھو تم میرے رستے کی ایک نشانی ہو
 دور کہیں اک شیشہ ٹوٹا اور میں چونک پڑا
 یہ آواز ہی بس جیسے جانی پہچانی ہو
 کم روشن کونہ مجھ کو اچھا لگتا ہے سعود
 جیسے تھوڑا باغ ہو اور تھوڑی ویرانی ہو

(۲)

دوغزلہ

دنیا سب آزمائی ہوئی ہے فقیر کی
 دیکھی ہوئی، دکھائی ہوئی ہے فقیر کی

یہ زندگی ہے رات کی روٹی کا ذائقہ
 روٹی بھی وہ جو کھائی ہوئی ہے فقیر کی
 درویش خوش لباس و غنی دست سے بھی مل
 گدڑی میں کب رسائی ہوئی ہے فقیر کی
 بہروپے ! فقیر سے کیا تیرا واسطہ
 یہ شکل کیوں بنائی ہوئی ہے فقیر کی
 پیارے ! سمندروں سے بھی یہ تشنگی نہ جائے
 یہ پیاس تو پلائی ہوئی ہے فقیر کی
 حجرے کا یہ چراغ بھڑکتا ہے بار بار
 اچھا تو آج آئی ہوئی ہے فقیر کی
 گوزے میں آبِ تازہ، چنگیری میں نانِ خشک
 دنیا سے کیا رہائی ہوئی ہے فقیر کی



خود تک بھی کب رسائی ہوئی ہے فقیر کی
 اور عمر دو تہائی ہوئی ہے فقیر کی
 جو لقمہء حرام ہے اس پر حرام ہے
 بلی بھی تو سدھائی ہوئی ہے فقیر کی
 آتش کدہ نہیں یہ کسی بادشاہ کا
 یہ آگ تو لگائی ہوئی ہے فقیر کی
 تو نے فقیر کو بہت آزار-----، خیر چھوڑ
 تو بھی بہت ستائی ہوئی ہے فقیر کی
 دل رکھ گیا ہے کوئی کفِ دست پر سعود
 دیکھو تو کیا کمائی ہوئی ہے فقیر کی





آنسوؤں میں بہایا جاتا ہے
 اس طرح غم مٹایا جاتا ہے
 راستہ خود کبھی نہیں بنتا
 راستہ خود بنایا جاتا ہے
 اُس جگہ سے عذاب ہٹتا نہیں
 جس جگہ خون بہایا جاتا ہے
 بے گھروں کا مذاق اُڑاتے ہو
 بے گھروں کو بسایا جاتا ہے
 پیڑ وہ بھی گرانا چاہتے ہو
 دُور تک جن کا سایا جاتا ہے
 تم جو پانی پلانے آئے ہو
 اس میں تو زہر پایا جاتا ہے



(۱)

اُڑاتے آئے ہو تم اپنے خواب زار کی خاک
یہ اور خاک ہے، اک دشتِ بے کنار کی خاک
ہمیں بھی ایک ہی صحرا دیا گیا تھا مگر
اُڑا کے آئے ہیں وحشت میں تین چار کی خاک
ڈرا رہے ہو سفر کی صعوبتوں سے ہمیں
تمہارے منہ میں بھی خاک! اور رہ گزار کی خاک!
یہ میں نہیں ہوں تو پھر کس کی آمد آمد ہے
خوشی سے ناچتی پھرتی ہے ریگ زار کی خاک
ہمیں مقیم ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن
سروں سے اب بھی نکلتی ہے رہ گزار کی خاک
سُنا ہے ڈھونڈتے پھرتے ہیں کب سے کوزہ گراں
ہماری آنکھ کا پانی، ترے دیار کی خاک
یہ حال ہے کہ ابھی سے کھنک رہے ہیں ظروف
ابھی گندھی نہیں جن میں سے بے شمار کی خاک
عجب نہیں کہ مجھے زندہ گاڑنے والے
کل آ کے پھانک رہے ہوں مرے مزار کی خاک

(۲)

متن و سند سے اور نہ تسطیر سے اُٹھے
جھگڑے تمام حلقہٴ تعبیر سے اُٹھے

اک جبر کا فریم چڑاتا ہے میرا منہ
 پردہ جب اختیار کی تصویر سے اُٹھے
 فکرِ سخن میں یوں بھی ہوا ہے کبھی کہ ہم
 بیٹھے بٹھائے بارگہ میر سے اُٹھے
 اس دل میں اک چراغ تھا سو وہ بھی گل ہوا
 ممکن ہے اب دھواں مری تحریر سے اُٹھے
 پلکوں پہ یہ ڈھلکتے ہوئے اشک مت بنا
 ممکن ہے اتنا بوجھ نہ تصویر سے اُٹھے
 ہم سوچتے ہیں گرد بنیں پھر پئے وصال
 اک عمر ہو چکی تری تصویر سے اُٹھے



(۱)

شبِ حیات کا حسرت کدہ سنوارا گیا
 چراغِ دے کے زمیں پر مجھے اُتارا گیا
 سکوتِ بحر سے محفوظ ہو رہی تھی خرد
 کہ ایک موجِ تلاطم اُٹھی ، کنارہ گیا
 زمین چاہنے والوں سے خوب واقف ہے
 غضب کا معرکہ تھا ، سو ہمیں پُکارا گیا
 مدارِ خواب سے نکلے تو پھر خلاؤں میں
 تلاش کرنے ہمیں دُور تک ستارا گیا
 ہزار پھول ہیں شاخِ یقین پر آصف
 بدن کی آگ سے سو مرتبہ گزارا گیا

(۲)

رونقِ بازار مٹی ، حسنِ زر مٹی کا ہے
 آئے کی آنکھ میں رقصاں شر مٹی کا ہے
 دیکھیے سیلِ حوادث میں کہاں تک چل سکے
 دشت و دریا کے سفر میں ہم سفر مٹی کا ہے
 اپنے جوہر سے چمکتا ہے ستارے کی طرح
 گرچہ ظاہر میں یہ پیکر ، مشیت بھر مٹی کا ہے
 داستانِ حسن میں اُس کا بھی نام آنے لگا
 کس قدر احسانِ آصف چاک پر مٹی کا ہے

(۳)

زخمِ احساس کی گہرائیاں کب دیکھتا ہے
ہم سخنِ آئینہٴ حرف کی چھب دیکھتا ہے

ہر کوئی گریہ و ماتم کی روایت کا امیں
کون بستی کے اُجڑنے کا سبب دیکھتا ہے

جب ادھر سے میں گزرتا ہوں لیے دل کا چراغ
کتنی حسرت سے مجھے قریہٴ شب دیکھتا ہے

لو صداقت بھی خدوخال سے محروم ہوئی
شہرِ منصور بھی اب نام و نسب دیکھتا ہے

دولتِ شعر کہاں اور کہاں میں آصف
دینے والا بھی فقط حسنِ طلب دیکھتا ہے



(۱)

خواب کی راہ دیکھتا دریا
آنکھوں آنکھوں چھلک پڑا دریا
سوچتا ہوں بہم کروں کیسے
ایک صحرا ہے دوسرا دریا
آسمان پر ٹھہر گیا سورج
چل پڑا ہے رکا ہوا دریا
اتنا پایاب اتنا کم آمیز
کیسا دریا ہے دھوپ کا دریا
روکتے رہ گئے کنارے مگر
ناؤ کے ساتھ چل پڑا دریا
اُس کی آنکھیں ہیں اس طرح جیسے
ایک دریا میں دوسرا دریا
میں درختوں کی اوٹ سے دیکھا
دھوپ رم جھم میں کھیلتا دریا

(۲)

کوئی پوچھے اگر اداسی کا
آئے میں ہے گھر اداسی کا
راستے نے کہا مسافر سے
زندگی ہے سفر اداسی کا

نور افشاں ہوئی تمھاری یاد
چمک اٹھا گھر اداسی کا
یہ جو خوشبو بھری ہے لفظوں میں
یہ ہے زخمِ ہنر اداسی کا
دل درپے میں پھول رکھتا ہے
کس کی خاطر شجر اداسی کا
ریزہ ریزہ ہوا دلِ وحشی
دیکھ کر سنگِ درنگر اداسی کا
ہو رہے گا تمہارے دل پر بھی
رفتہ رفتہ اثر اداسی کا
پھول بن کر مہک اٹھا خورشید
آنے میں شرر اداسی کا



(۱)

کوئی سلسلہ باریابی کا ہو
 تو اک جیسے خدشہ خرابی کا ہو
 ہر اس رہ سے بچ بچ کے چلتا ہے دل
 شبہ جس پہ کچھ کامیابی کا ہو
 رکیں پگھلی چاندی کے چشمے کے پاس
 ارادہ اگر فیضیابی کا ہو
 چکاچوند درشن کے چھینٹے اڑیں
 کرشمہ کوئی بے حجابی کا ہو
 کریں جاگتی آنکھ سے سیرِ حسن
 تاثر مگر نیم خوابی کا ہو
 افق تا افق تیرتا جائے دل
 سفینہ رخ ماہتابی کا ہو
 وہ پھرتا رہے پاگریزی پہ خوش
 ہمیں واہمہ ہمرکابی کا ہو

(۲)

کس کو سودا تھا بھٹک جائے ، یہاں تک آئے
 ایک ترغیب کے بہکائے یہاں تک آئے

اک بلاوا تھا مقیموں کو مسافر کرتا
 ایک آواز کے اکسائے یہاں تک آئے
 خواب شاداب کھلا آنکھ میں اک آنچل کا
 جس سے لپٹے، جسے لپٹائے، یہاں تک آئے
 لمسِ نایافتہ تخلیق کرے اک خوشبو
 اور وہ خوشبو کسی پیرائے یہاں تک آئے
 سرخ بلور کے کنگن سے کلائی کی جھلک
 وقت کی نبض کو ٹھہرائے، یہاں تک آئے
 وہ نہیں، اُن کی محبت تو پہنچتی ہے یہاں
 پیڑ اُس پار سہی، سائے یہاں تک آئے



(۱)

عمر بھر جیسے کسی خواب سے دوچار رہے
 اُس کی آنکھوں کے جو ہم لوگ پرستار رہے
 رات سرگوشیاں کچھ کرتی رہی سرد ہوا
 دیر تک شبِ نیمی اُس صبح کے رخسار رہے
 اتنا اونچا نہ زمانے کی ہواؤں میں اُڑا
 یہ نہ ہو خاک میں ملنا ہمیں دشوار رہے
 چند برسوں کا سفر صدیوں پہ محمول ہوا
 کس قدر سُست مرے قافلہ سالار رہے
 دل کے صحراؤں میں اُڑتا رہا یادوں کا غبار
 اس قدر گرد اُڑی قافلے ناچار رہے
 لوگ چہروں کو چھپائے ہوئے نکلے گھر سے
 شہر میں جب تک ہم آئندہ بردار رہے
 افق شہر پہ چھائے رہے بادل شیراز
 گو کہ برسے نہیں، پانی سے گراں بار رہے

(۲)

بنیاد کون رکھتا ہے گھر کی حباب پر
 ہر موج ہنس رہی ہے مرے انتخاب پر
 جاتے سے کی چاپ نے چونکا دیا مجھے
 بیٹھا تھا میں سکون سے دیوارِ خواب پر

امیدِ نو بہار جہاں ٹوٹنے لگی
 کوئیل کوئی کھلی ملی شاخِ گلاب پر
 تھا بھی تو اک صحیفہ متروک کی طرح
 ہے گرد سی جمی ہوئی دل کی کتاب پر
 پھیلی ہے اک اداسی سمندر میں دُور تک
 جیسے لکھا ہو نامِ مرا سطحِ آب پر
 یہ انفرادیت کا بھی نقشہ عجیب ہے
 ٹھہرا ہوں پانیوں سے گزر کر سراب پر
 شیرازِ سُرخ کیوں ہے حیا سے سحر کا رنگ
 چٹکی بھری ہے کس نے رخِ آفتاب پر



(۱)

بلا کی وضع داری چاہتی ہے
 محبت خاکساری چاہتی ہے
 کئی دن سے نگاہِ ناز اُس کی
 عجب آئینہ داری چاہتی ہے
 وہ آنچل کی بجائے اپنے سر پر
 کوئی ابرِ غباری چاہتی ہے
 کسی دیوِ روایت سے رہائی
 وہ بلقیسِ حصارِ چاہتی ہے
 سدا بے اختیارانہ رہوں میں
 یہی بے اختیارِ چاہتی ہے
 یہ دُنیا ئے دُنی ہے اور ہمیشہ
 تعلق کاروباری چاہتی ہے
 کوئی خوشبو پُرا لائی ہے ساحر
 یہ کیا بادِ بہاری چاہتی ہے

(۲)

تماش گر بھی ، تماشائی بھی ، تماشا ہے
 کہ اس تماشے میں ہر آدمی تماشا ہے
 میں خود کو آگ لگا کر تڑپنے والا ہوں
 کہ رقص گاہ میں یہ آخری تماشا ہے

بس اک نفس کی بدولت ہے رابطہ قائم
 یہ جسم و روح کی ہم رشتگی تماشا ہے
 فرشتگاں بھی اُسے دیکھتے ہیں حیرت سے
 تو کیا وجودِ بشر واقعی تماشا ہے
 ہے اُس کا کام فقط وحشیوں کو خوش کرنا
 جو سچ کہوں تو ہر اک لختی تماشا ہے
 میں اپنے آپ سے بھی ہو چکا ہوں اب بیزار
 مرے لیے مری خود آگہی تماشا ہے
 اک اہل دشت نے سائر مجھے یہ طعنہ دیا:
 تمہارے شہر کی بے رونقی تماشا ہے

(۳)

موجوں کی طغیانی بڑھتی جاتی ہے
 اور مری حیرانی بڑھتی جاتی ہے
 جوں جوں ہوتا جاتا ہے آباد یہ شہر
 اندر کی ویرانی بڑھتی جاتی ہے
 سارے کردار اس میں مرتے جاتے ہیں
 لیکن_____زیست کہانی بڑھتی جاتی ہے
 کوئی تبدیلی نہیں آئی سوچوں میں
 سوچوں کی یکسانی بڑھتی جاتی ہے
 ٹیلے بھی اب ہجرت کرتے جاتے ہیں
 دُشِق میں نقل مکانی بڑھتی جاتی ہے

جتنا علم بڑھا جاتا ہے دُنیا میں
 قدرِ لفظ و معانی بڑھتی جاتی ہے
 جتنی جس کی مشکل بڑھتی ہے ساحر
 اتنی ہی آسانی بڑھتی جاتی ہے

(۴)

جب تک اس کرۂ خاک میں رہنا ہے مجھے
 سحرِ نیلابی افلاک میں رہنا ہے مجھے
 یوں ہی رہنے ہیں پسِ چشمِ مرے اشک تیار
 گرمیِ شعلۂ نم ناک میں رہنا ہے مجھے
 اک دُعا سر پہ سدا سایہ فگن رُنی ہے
 سائبانِ نگہِ پاک میں رہنا ہے مجھے
 اب کوئی سوزِ مژگاں نہیں کام آنے کی
 فکرِ سینۂ صد چاک میں رہنا ہے مجھے
 میں کہ زنجیرِ غمِ عشق میں پا بستہ ہوں
 حلقۂ گیسوئے پیچاک میں رہنا ہے مجھے
 اپنی نظروں سے بھی پوشیدہ یونہی مثلِ شرر
 اک غبارِ خس و خاشاک میں رہنا ہے مجھے
 کیوں پہن لوں میں کوئی اور لبادہ ساحر!
 ہاں ، اسی پیرہنِ خاک میں رہنا ہے مجھے

(۵)

وحشاں __ کیوں نہ ہمیں دیکھ کے حیرت کیے جائیں
 ہم تو اُن سے بھی زیادہ رم و وحشت کیے جائیں

کائناتوں میں کہیں اس کا بدل کوئی نہیں
 جس قدر ہو سکے انساں سے محبت کیے جائیں
 باغ ویران ہوا جاتا ہے رفتہ رفتہ
 ایک اک کر کے پرندے سبھی ہجرت کیے جائیں
 اس طرح دل میں حسیں چہرے اُترنے لگے ہیں
 جس طرح ریت میں بوندیں سی سرایت کیے جائیں
 ظلم کو ظلم نہ کہنا تو ہے خود ظلمِ عظیم
 اور کچھ کر نہیں سکتے تو مذمت کیے جائیں
 منصبِ میر تقی میر نہیں ملنے کا
 آپ جتنی بھی محافل کی صدارت کیے جائیں
 یہ سعادت بھی کوئی کم تو نہیں ہے ساحر
 مصحفِ روئے نگاریں کی تلاوت کیے جائیں



(۱)

کہی کے رنگ میں ہوں ان کہی کا آدمی ہوں
 میں شور کرتی ہوئی خامشی کا آدمی ہوں
 میں ایک شعر ہوں سینہ بہ سینہ چلتا ہوا
 کسی کے دل میں ہوں لیکن کسی کا آدمی ہوں
 یہ دین و دنیا مرے راستے میں پڑتے ہیں
 یہ جانتے ہیں مجھے کس گلی کا آدمی ہوں
 کسی زمانے میں موسیٰ کے ساتھ دیکھا گیا
 اور ان دنوں میں کسی سامری کا آدمی ہوں
 میں انتظار ہوں گلیوں میں خوار ہوتا ہوا
 میں ایک بھول ہوں یادآوری کا آدمی ہوں
 فرشتے دیکھ کے حیران ہو رہے ہیں مجھے
 خدا کے ساتھ ہوں اور آدمی کا آدمی ہوں
 کسی پہ کھلتا ہوں لیکن کسی پہ کھلتا نہیں
 میں ایک بھید ہوں جادوگری کا آدمی ہوں
 کسی کو توڑنا کیسے ہے جوڑنا کیسے
 میں سب سمجھتا ہوں کوزہ گری کا آدمی ہوں
 یہ قبل و بعد کے قصے ، فضول قصے ہیں
 ہر ایک عہد میں تھا ، ہر صدی کا آدمی ہوں

یقین دلاتا پھروں کس لیے تجھے دُنیا!
ترے گمان میں جو ہے اُسی کا آدمی ہوں

(۲)

اب اور کتنی بتا ہم تجھے صفائی دیں
تُو اپنے زعم سے نکلے تو ہم دکھائی دیں
تمہیں تو ٹھیک سے دل مانگنا نہیں آتا
تمہارے ہاتھ میں کیا کاسہ گدائی دیں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ ذرا سی خاموشی
اب اتنے شور میں ہم کیا تمہیں سنائی دیں
یہ لوگ بسترِ حرص و ہوس سے جا لگے ہیں
انہیں دعا نہیں لگتی ، انہیں دوائی دیں
خدا گواہ تم اتنے حسین ہو کہ تمہیں
ہمارے بس میں اگر ہو تو ہم خدائی دیں
ہمارا لکھا غلط پڑھ رہے ہیں لوگ ابھی
کہاں سے لا کے انہیں حرفِ آشنائی دیں
یہ ٹھیک ہے کہ کریں وقفِ عیشِ دُنیا بھی
مگر خدا کے لیے گھر میں کچھ کمائی دیں
ہمارے دل کے در و بام تک تو آ گئے ہو
تمھی کہو کہ تمہیں اور کیا رسائی دیں
وہ جا چکا ہے اگر شہر چھوڑ کر عامی
تو کیا ضروری ہے اب ہر جگہ دُہائی دیں



O

تم نہیں ہو تو گماں ہے کہ نہیں تھے ہم بھی
ورنہ من جملہ ارباب یقین تھے ہم بھی

قصہ گو! تو نے فراموش کیا ہے لیکن
اس کہانی میں ترے ساتھ کہیں تھے ہم بھی

یہ الگ بات کہ تجھ حسن کو منظور نہ تھا
ورنہ خوش فہم تو خود اپنے تئیں تھے ہم بھی

اب جو لوٹے ہیں تو حیران کھڑے سوچتے ہیں
یہ مکاں وہ تو نہیں جس کے مکین تھے ہم بھی

دل پہ لکھی تھی جو تحریر مٹاتے کیسے
لاکھ کم فہم سہی آئینہ ہیں تھے ہم بھی

☆

انارکلی

[نو تصنیف ناول کے چند ابواب]

○

اُس وقت خانپور میں صبح کے آٹھ بج رہے تھے، جب برآمدے سے تام چینی کے تھال پر چچ کے بجنے کی آواز سنائی دی۔
شہر یار مرزا گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
نچلے بیڈ پر ہڈ نے اپنے چہرے پر سے مکمل سرکایا۔ عین اُسی لمحے راجا رسا لوکندھے پر تولیہ ڈالے باہر کی سمت گھلنے والے دروازے کے بیچ اسپنج کی طرح اُچھلتے دکھائی دیے۔
”اکھڑے تے لڑائی جا چُپ کر کے۔“
راجا صاحب جھوم جھوم کر گنگنا رہے تھے۔ پھر انھوں نے آگے کو جست بھری اور ہڈ پر سے مکمل کھینچتے ہوئے، رازداری سے اپنی ایک آنکھ میچ لی۔

”شہزادے، سنا نہیں؟ فرسٹ کال فار بریک فاسٹ۔“

ہڈ اٹھ کر بیٹھ گیا اور مغلیٰ آنکھوں والا، راجا صاحب کے کندھے سے تولیہ اُچک کر غسل خانے کی طرف نکل لیا۔
اس وقت اکثر بنے سنورے ٹیکنیشنز، برآمدے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، خوش گپیوں میں مصروف تھے اور غسل خانے میں گرم پانی کی دستیابی ایک نعمت سے کم نہ تھی۔
شہر یار مرزا جب کنگھی سے بال سنوارتے ہوئے پلٹا تو اُس نے دیکھا کہ اُس وقت بھی چند ایک مندوبین اوندھے مونہہ پڑے بے خبر سو رہے تھے اور ہڈ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تو تھا، پراس کی آنکھیں مُندھی ہوئی تھیں۔
شہر یار مرزا نے آگے بڑھ کر ہڈ کی ننھی سی توند سہلائی اور اس کے پھولے ہوئے گالوں پر بھیج کر دوطرفہ پیار لیا تو اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔

”پیارے ہڈ ہڈ،“

”یار بکواس نہیں۔ باہر سب کھڑے سُن رہے ہیں۔“ ہڈ جھنجھلا کر بولا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔ نہیں کہتے ہڈ کو ہڈ ہڈ۔ سب کے سامنے مسعود صاحب کہیں گے۔ لیکن یار اس وقت ہم دونوں کو ضرورت ہے ایک سیفی ریزر کی۔ وہ سالی وہیں رہ گئی۔ تم نے مال روڈ سے مجھے اُچک لیا۔ یہ بندوبست تو کرنا ہوگا۔ بہ صورتِ دیگر ہم دونوں کے تھوڑے مندوبین کو دکھانے کے قابل ہرگز نہیں۔ یہ بندوبست کہاں سے ہوگا؟“

اس وقت شہر یار مرزا نے ہڈ کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ رکھا تھا۔
 ”خیر مجھے تو کوئی خاص ضرورت نہیں، پر تمہیں دیکھنے کے لیے تو اتنی ساری ہیں..... اوہ، ہاں یاد آیا۔ وہ کم بخت شاید ساری رات سوئی نہیں۔“

ہڈ نے مغلیٰ آنکھوں والے کے بازوؤں میں کسماتے ہوئے اطلاع دی۔
 ”کون؟ کون نہیں سوئی ساری رات؟“

شہر یار مرزا اپنے بھینچے ہوئے بازو ڈھیلے چھوڑ، ہڈ کے گلے میں جھول گیا۔
 ”وہی..... جس کی خاطر تم نے رات کھانا نہیں کھایا۔“ ہڈ نے بے ہنگم سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔
 ”کیا مطلب؟ وہ انار کی کلی؟“

”ہاں وہی۔ رات کو جب تم سو گئے اور راجا صاحب نے اپنے خراٹوں سے مجھ سمیت اس ہال کے دیگر باسیوں کو ساری رات جگائے رکھنے کی ٹھان لی تو میں نیند نہ آنے کے سبب باہر، نیم تاریک برآمدے کی طرف نکل گیا۔“
 ”پھر؟“

”بتا تو رہا ہوں۔ برآمدے میں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خواتین والے حصے میں روشنی ہے۔ کھڑکی سے لگ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میڈم سرجیت کور اور میر صاحب جاگ رہے ہیں۔ شاید پی رہے تھے اور سُدھ ہڈ کھوئے ہوئے تھے۔ میں اندر تو گیا نہیں۔ ان دونوں کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”تم پھر بکواسیات میں پڑ گئے۔ تمہاری Continuity Book جانے کہاں کھو جاتی ہے۔ ہم نے کیا نکالنا ہے۔ میڈم اور میر صاحب کے معاملے میں سے بھلا۔“
 شہر یار مرزا تلملا اٹھا۔

”ہاں، تو میں بتا رہا تھا۔ اس وقت رات گئے لان کے آخری سرے پر ڈاکٹر لو باغ کا موسیقار بیٹا رابرٹ اس قہر کی سردی میں بیٹھا گٹار بجا رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر میڈم نجمہ اور وہ چنچل سی لمبے بالوں والی.....“

”جہاں آنا نام ہے اُس کا۔ تم کراچی میں بنی فلمیں سرے سے دیکھتے نہیں شاید۔ مشہور اداکارہ ہے یار۔“
 ”ہاں۔ وہی اور میڈم نجمہ کی بیٹی آصفہ رات کے آخری پہر گٹار بجاتے ہوئے رابرٹ کے قدموں میں بیٹھی داد دے رہی تھیں۔“
 ”ہڈ ہڈ، تم صرف ہڈ ہی نہیں۔ حرام خور بھی ہو، میں اس کا پوچھ رہا ہوں۔ اس سرمی شال والی کا۔“
 ”ہاں، وہی تو بتا رہا ہوں۔ اسے اور سنی کو میں نے چرچ کی دہنی دیوار سے لگ کر کھڑے دیکھا۔“
 ”تم نے اور کیا دیکھا؟“

”دیکھنا کیا تھا۔ میں تو اس طرف یونہی نکل گیا تھا کہ ان دونوں پر اتفاقاً نظر پڑ گئی۔ وہ، دنیا و مافیہا سے بے خبر دیوار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ میں بے خیالی میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی سرمئی شال سے آنسو پونچھتی، ہچکیاں لے کر رو رہی ہے اور سنی اسے تسلی دیتے اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے قسمیں کھا رہا ہے کہ اس کا آصفہ کے ساتھ کوئی چکر نہیں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو انھیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی سنی تو جھٹ پٹ وہاں سے سگ گیا، لیکن وہ کچھ دیر یونہی چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے بعد ہچکیاں لے کر روتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی بلاک کی طرف چل دی۔ میں نے دیکھا، سنی اس وقت برآمدے ہی میں کھڑا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ بڑھا کر روکنا بھی چاہا، لیکن وہ رکی نہیں۔“

”پھر؟“ شہر یار مرزا کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

”میں نے سنی سے پوچھا بھی کہ کیا ہو گیا بھی، لڑکی رو رہی ہے، تو جواب میں اس نے کندھے اچکائے اور کہنے لگا: تاریکی میں باہر نکلتی تھی، کانٹے دار جھاڑیوں میں گر گئی بے چاری..... اب یار مرزا، تو ہی بتا، میں ناک میں نوا لے ڈالتا ہوں؟ وہ حرامی مجھے ٹچا دے گیا۔“

یہ سن کر مغلیٰ آنکھوں والا کچھ دیر سر جھکائے بٹھا رہا، پھر بولا: ”آج یا کل میں فیصلہ ہو جائے گا۔ زیادہ گزر گئی اور تھوڑی رہ گئی۔ اس فیصلے کی گھڑی میں دائیں بائیں نہ ہو جانا کہیں۔ مجھے تیری ضرورت پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔“ یہ کہتے ہوئے ہندو غسل خانے کی طرف نکل لیا اور شہر یار مرزا، راجا صاحب کے سفری تھیلے میں سے شیونگ کٹ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے میں راجا صاحب نے کمرے کے اندر جھانکا۔

”ویرجی، مرن بڑت کا ارادہ ہے کیا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم دونوں کی خاطر ناشتے کی میز سے گرم گرم پراٹھے اور فرائی کردہ انڈے چراتے ہوئے پکڑا جاؤں۔ میرے جان، جگر ناشتہ کر لیں۔ اس وقت سب لوگ ناشتہ کر چکنے کے بعد ہال میں جمع ہیں۔ کہاں ہے تمھارا یار؟“

”غسل خانے میں بس چلتے ہیں راجا صاحب۔ آپ کے گنڈ ریزر سے چہرہ چھیل کر دو سیکنڈ لگاؤں گا نہانے میں۔ آخری گیت محبت کا سنالوں تو چلوں۔“

پیار یو! خفیہ کے ایک حوالدار کے ریزر میں نیا بلیڈ کہاں سے آئے گا بھلا۔“

”کوئی نہیں راجا صاحب۔ آج کر لیتے ہیں بندوبست۔ ایوبیہ میں دو ایک دوکانیں تو ہوں گی ہی۔ نیا بلیڈ لگا دیتے ہیں، آپ کے اس گنڈ بلیڈ کی جگہ۔“

”اللہ بھاگ لگائے رکھے۔ اپنا کیا ہے، نہ پہلے کبھی کسی کو مونہہ دکھانے لائق تھے، نہ اب ہیں۔“ راجا صاحب نے اپنے چہرے کی جھاڑ جھنکار پر دونوں ہاتھ پھیرے۔

”ارے نہیں راجا صاحب، ان پلاسٹک کے چہروں میں سے ایک آپ ہی تو بھائے ہیں ہمیں۔“
 ”بھاگ لگے رہیں، ایک نامی گرامی سکرپٹ رائٹر کو خفیہ کا حوالہ دے رہی تو اس ویر نے ہی بنایا ہے۔ اک ذرا توجہ مطلوب ہے شہزادے کی۔“

راجا صاحب نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر شہر یا مرزا کو دعوتِ نظارہ دی۔ باہر، ترائی کے سرے پر تاڑ کے جھنڈ میں وہ کھڑی تھی۔ تن تنہا، گرم سُرمئی شال میں لپٹی، بید مجنوں کی لچکتی ہوئی ڈال..... اور اس کی نظریں اسی کھڑکی پر جمی تھیں یا شاید ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

”راجا صاحب! وہ ادھر ہی دیکھ رہی ہے یا نظر کا دھوکہ ہے؟“
 ”پیارو! ابھی مل کر آ رہا ہوں تیری چند جاناں سے۔ بے شک ادھر ہی دیکھ رہی ہے، لیکن وہ روشنی میں ہے اور ہم نیم تاریکی میں۔ ہم دکھائی نہیں دے رہے اسے۔“

”آپ اُس سے مل کر آئے ہیں، وہ کیسے؟ آپ کی گپ شپ ہے اس سے؟ پہلے تو نہیں بتایا آپ نے۔“ شہر یا مرزا نے شیو بنالینے کے بعد تولیے سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے پوچھا۔

”گپ شپ کیا ہونی ہے جگر۔ میں سنا جی کامدراج ہوں اور یہ اُس کی بیٹی ہے۔ چھوٹی سی تھی، جب میں اُن کے گھر آیا جاکر تھا، ناماں جی کو سلام کرنے۔ جب سے فلم لائین میں مصروفیت بڑھی تو اُن کے گھر آنا جانا موقوف ہو گیا۔ آج ناشتے کی میز پر میرے برابر آن بیٹھی۔ باتوں ہی باتوں میں مجھے ایک کی بجائے تین پراٹھے کھلا دیے اس نے۔ پوچھ رہی تھی تیرا۔ کہنے لگی یہ آپ کے دوست کھائے پیے بغیر کیسے زندہ ہیں؟ میں انجان بنا رہا۔ پھر کہنے لگی، وہ ناشتہ کرنے نہیں آئے ڈائننگ ہال میں۔ میں نے کہا، کس کا پوچھ رہی ہے شہزادی؟ سنی کا پوچھ رہی ہو تو وہ میری بلی ہے۔ کھائے کی بھی، پیئے گی بھی، لیکن جب ہم کھلائیں گے۔ تب میں نے یہ بات ذرا بلند آواز میں کہی تھی، جسے سن کر سب ہنس دیے۔ اس وقت سنی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا ہی تھا، جب ہتھ پڑا۔“

”یہ تو آپ نے کمال کر دیا راجا صاحب۔“ شہر یا مرزا کھل اٹھا۔
 ”سنی کا گڈا تو بندھا ہی، وہ بھی اکھڑ گئی ایک بار۔ بُرا سا مونہہ بنایا اُس نے اور سرگوشی کے انداز میں بولی، میں تو آپ کے کوہ مری والے دوست کا پوچھ رہی تھی۔ رات، کھانا نہیں کھایا انھوں نے اور اب تک ناشتہ کرنے بھی نہیں آئے۔“
 اب ہڈ غسل خانے سے باہر نکل آیا تھا۔ سر پر الٹی سیدھی کنگھی پھیرتے ہوئے بولا۔ ”چلیں؟“
 ”نہا کر کیا پراٹھے جیسا چہرہ نکل آیا ہے، میرے ویر کا۔“ راجا صاحب نے ہڈ سے چھل کی۔
 باہر، تاڑ کے جھنڈ میں وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

دوسرے سیشن کے اختتام پر عصر کا وقت ہو چلا تھا۔

مغلّی آنکھوں والے کے اشارے پر راجا رسالو نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اپنے قریب کھڑے ہوئے ہڈ ہڈ کے کندھے زور سے تھپتھپائے، پھر بہ آواز بلند بولے:

”جس طرح شہزادہ سلیم کا دماغ باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بنتا چلا گیا، وہی حال ہمارا ہے..... یلغار ہو!“

قریب کھڑے یونٹ کے افراد کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دیے۔

یہ سن کر ہڈ ہڈ نے دھیرج سے راجا رسالو کا بازو تھاما اور انھیں ہجوم میں سے باہر نکال لے گیا۔

”راجا صاحب، اس پر رحم کھائیں۔ مر جائے گا سالہ کل بیڈمنٹن کورٹ میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، ابھی تک سنبھل نہیں پایا۔ آج سارا دن جھینپ مٹانے کی کوشش کرتا رہا اور لڑکیاں ہنسی ٹھٹھا کرنے سے باز نہیں آئیں۔ بہت ہو گئی اس کے ساتھ پلیز، اب اُسے معاف کر دیں۔“ ہڈ ہڈ، منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

”نہیں..... اب میں اس کے پیر نہیں لگنے دوں گا۔ کیا کوہ مری میں ہی طے نہیں پا گیا تھا اس کا جھٹکا؟ میں دو لیٹر بارود اپنے ساتھ لایا۔ کیا وہ سب واٹسن اینڈ کو، والوں کو لوٹا دوں، یہ کہہ کر کہ ہم بیجڑے ہیں جناب۔ ہم سے ہوتا ہوا تا کچھ نہیں۔“ مغلّی آنکھوں والے نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

”اگر ایسا ہی ہے تو مان سٹھ، یلغار ہو۔“ راجا صاحب نے بازو لہرا کر نعرہ لگایا تو چائے کا گگ تھا مے ادا کارہ جہاں آرا اور سرخ بالوں والے محقق کے قریب کھڑے ڈاکٹر لو باخ خوش دلی سے مسکرائے۔

نجمہ بیگم بیڈمنٹن کورٹ میں پیش آنے والے واقعہ پر حد درجہ رنجور تھیں۔ انھوں نے لان میں بچھی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے چونک کر خوش گپیوں میں مصروف ٹیکنیشنز اور چائے کی ٹیبل پر نگاہ کی۔

اس وقت ان کی نظریں سنی اور آصفہ کو اکٹھا دیکھنا چاہ رہی تھیں، لیکن وہاں ایسا کچھ تھا نہیں۔

سنی سب سے الگ تھلگ چائے کا ڈسپوز ایبل گلاس تھا مے، لان کے آخری سرے پر تاڑ کے درخت سے ٹیک لگائے اکیلا بیٹھا تھا اور آصفہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

جانے کہاں چلی گئی..... سنی کل کا سُپر سٹار ہے..... لیکن بخت ماری کو اپنی کچھ فکر ہو، تب نا۔ نجمہ بیگم نے سوچا۔

زندگی کی لمبی دوڑ میں ہانپتی ہوئی نجمہ بیگم کے سامنے تپا ہوا صحرا تھا اور حد نگاہ تک ریت اڑ رہی تھی۔

نجمہ بیگم افسردہ تھیں۔ قریب سے جہاں آرا گزری تو بولیں: ”رب نہ مارے تے شریکاں دے وں داروگ نہیں۔ پر اتھے

تے شریک جت گئے۔“

ڈاکٹر لو باخ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پروفیسر نیرنگ کی طرف دیکھا اور بولے:

" Please translate what did she just say?"

نیرنگ صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کر کے بتایا تو مسکراتے ہوئے بولے:

" A strong person is not the one who does,nt cry. A strong person is the one who cries and sheds tears for a moment, then gets up and fights again."

نجمہ بیگم نے ان کے کہے دو آخری الفاظ تو سمجھ ہی لیے تھے لہذا وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے تک لے آئیں۔ شازی، برآمدے کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی، خالی خالی نظروں سے سب کو تکتے جارہی تھی۔ قریب کھڑی صفیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو شازی جیسے نیند سے جاگی اور بولی: گھوڑے بھی سوچتے ہیں کیا؟“

صفیہ ٹھٹک کر رہ گئی: ”کیا کہا؟“

شازی بڑبڑائی: ”رات کی تاریکی میں مالوہ کے شاہی کمپ سے شاہسوار کو اپنی پیٹھ پر لادے، لاہور کے شاہی قلعے کی جانب سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے نے کیا سوچا ہوگا؟“

”کیا!“ صفیہ نے اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔

”صفیہ، کیا گھوڑے نے صرف یہی سوچا ہوگا کہ سوار کو جلد پہنچنا ہے؟ یا گھوڑے اپنی کنپٹیوں اور نتھنوں سے پسینہ بہاتے ہوئے بوجھ لیتے ہیں کہ وہ کسی جرم میں شریک ہیں؟ مسجدی دروازے سے گزر کر مشعل کی دھندلی روشنی میں قلعے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گھوڑے نے کچھ تو سوچا ہوگا.....“

صفیہ نے جھک کر اسے گلے سے لگا لیا۔

○

سورج کی زردی مائل نکیہ مغربی سمت کی پہاڑیوں میں اتر گئی۔ ڈاکٹر ستنام کورا اور میر صاحب تیار ہو کر لان کی جانب نکلنے لگے تو ڈاکٹر نذیر برلاس غائب تھے۔ جہاں آرا، نجمہ بیگم اور نیرنگ صاحب کی معیت میں کچھ دیر پہلے تو یہیں تھے جانے کدھر نکل گئے۔

ڈاکٹر ستنام نے سوچا۔

اس وقت وہاں ڈاکٹر ستنام اور میر صاحب کے علاوہ کوئی اور نہ تھا اور کمرے میں اپرن مور کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ستنام نے گوشہ خواتین کی بغلی دیوار کے ساتھ کرسیاں بچھوانے کا ابھی سوچا ہی تھا کہ انھیں ڈاکٹر نذیر کا دوبارہ خیال

آیا۔

”کچھ بتا کر گئے تھے؟“ ڈاکٹر ستنام نے پوچھا۔

”بھئی بہیں کہیں ہوں گے۔ آجائیں گے۔“ میر صاحب نے پاپ کا گہرا کش لیا۔

”شاید بتا کر نکلے ہوں۔ شازی سے پتا کروں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اوپچی ایڑی کے سینڈل پاؤں میں اڑتے اور ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔

انہوں نے دیکھا کہ شازی نیم روشن برآمدے کے آخری سرے پر بینگ سے کرسی جوڑے شانت بیٹھی تھی اور سامنے لان میں دن بھر کے بحث مباحثے کے تھکے ہارے، کچھ لیٹے اور کچھ بیٹھے ہوئے ٹیکنیشنز گھاس کے تختوں پر رات کا کھانے لگنے کے منتظر تھے۔ اس وقت معمول سے ہٹ کر کچھ بھی تو نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ راجا رسالو کی معیت میں ڈاکٹر نذیر پراس مغلنی آنکھوں والے کے کندھے کا سہارا لیے پتھروں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ریٹ ہاؤس کے سامنے والی پہاڑی چڑھ آئے تھے اور ہڈ ہڈ نے غم غلط کرنے کا کہہ کر سنی کو غروب آفتاب سے پہلے وہاں پہنچا دیا تھا۔

سنی نے شہر یار مرزا کو آتے دیکھا تو ناگواری سے مونہہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”نہیں بھئی، یوں نہیں۔ چلو، تلخی بھلا کر اچھے بچوں کی طرح گلے ملو۔ دیکھو، ان دوستوں نے آپس میں مل بیٹھنے کا کیسا اہتمام کیا ہے۔“ ڈاکٹر نذیر نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ شہر یار مرزا اور سنی کو دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے کر آپس میں گلے ملو دیا۔

”میرا اٹھنا بیٹھنا بڑے بڑے بلا نوشوں کے ساتھ رہا لیکن میں نے ساری زندگی چکھی تک نہیں۔ نہ آج پیوں گا۔ صرف تم لوگوں کی دیکھ ریکھ کے لیے یہاں چلا آیا..... ادھر ڈاکٹر ستنام اور میر صاحب مجھے کوس رہے ہوں گے کہ کہاں چلا گیا.....

ارے تھک گئے یار۔“ ڈاکٹر نذیر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

راجا رسالو نے ریٹ ہاؤس کے وارڈروب سے نکالی ہوئی اجلی چادر بچھا کر ہائی لینڈ کی فل بوتل، پانچ خالی گلاس، پانی سے بھرا ہوا تھرمس اور نمکو کے دو بڑے پیکٹ درمیان میں سجادیے۔

”لو جی، کم گیا مک تے جھگڑا گیا چک..... ہن بہہ جاؤ سرکاراں“ راجا رسالو، دونوں ہاتھ جھاڑ کر کچھی ہوئی چادر کے ایک سرے پر آلتی مالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اُس کے بعد ہڈ کے بازو پکڑ کر بٹھانے سے سنی بھی چارونا چار شہر یار مرزا کے پہلو میں ٹک ہی گیا۔

ڈاکٹر نذیر قدرے بلندی پر بڑے سکون سے بیٹھے تھے۔ سامنے ترائی میں گیسٹ ہاؤس کے برآمدوں اور لان کی راہداریوں میں بجلی کے قمقمے روشن تھے، جن کی مدھم روشنی میں سارا احوال تو نہیں، البتہ کچھ کچھ ضرور بھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں بوتل سے گلاسوں میں ہائی لینڈ انڈیلنے کی کل کل نے ڈاکٹر نذیر کو کہیں بہت پیچھے ماضی میں دھکیل دیا۔ اب وہ ہکا بکا گنگنانے لگے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ بھی ادھر آجائیے نا۔“ شہر یار مرزا نے تھرمس سے گلاسوں میں پانی کی سطح برابر کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں یار..... میں یہاں ٹھیک ہوں۔ ابھی ابھی لمحہ بھر کو یوں لگا جیسے اردی بہشت کا مہینہ ہے اور میں توڑے دار بندوق تھا۔ قلعہ لاہور کے اکبری دروازے کی دندانے دار فصیل پر بیٹھا ہوں..... غروب آفتاب کا وقت ہے۔ بارگاہ شاہی کے

گردقتا تیں تیں ہیں۔ دسترخوان سجا ہے۔ ناشپاتی، باباشنچی، علی شیری، رائے برگ نے اور دو د چراغ غرض کہ مختلف الاقسام کے خربوزوں کے ساتھ بدخشانی خربوزے بھی موجود ہیں البتہ علاقہ بھکر کے نواح سے سواچلے کے جاڑوں میں تیار کردہ خربوزے فراہم نہ ہو سکے۔ ہاں انار بے دانہ، سیب، بہی، امرود، شفتالو اور آلوچہ سے بھرے طشت دھرے ہیں۔ آج جہاں پناہ نے احباب کے ساتھ مل کر شرب اور سبب کا شغل کرنا ہے۔ جو کھایا گیا سو کھایا گیا، جو بچ گیا اسے حاضرین محفل کو بطورالوش تقسیم کر دیا جائے گا۔“ ڈاکٹر نذیر لہر میں تھے۔

”ڈاکٹر صاحب، اس محفل شرب میں اتنا کچھ اور ادھر صرف نمک!“ راجا رسالو کی یہ بات سن کر سب ہنس دیے۔

”ایسا نہیں ہے۔ ہمارے کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کیے رکھا ہے۔ میں نے مطبخ والوں کو کہہ دیا تھا کہ ہمارا کھانا الگ کر دیں۔ ہم دیر سے کھائیں گے۔“ ڈاکٹر نذیر نے مژدہ سنایا۔

”زندہ باد! ڈاکٹر صاحب۔“ راجا صاحب نے نعرہ لگایا۔

اب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور ڈاکٹر نذیر تنگ میں تھے: ”لو..... اب کارندے، بارگاہ شاہی میں ظل سبحانی کے ایجاد کردہ خوشبودار مصالحہ جات کو سونے اور چاندی کی انگلیٹھیوں میں سلگا کر لے آئے۔ اس کا مطلب ہے شہنشاہ، خلوت خانہ سے ادھر کارخ کرنے والے ہیں۔ دیکھ رہے ہو..... جہاں پناہ کا ایجاد کردہ فانوس ’اکاس دیا‘ ایک گز الٹی کی بلند پر نصب ہے۔ جس کے ساتھ زینہ لگا کر کافوری شمع کی بتی کتر دی گئی۔ کھلے آسمان تلے پہروں بارگاہ کی تیاری کچھ آسان کام تو نہ تھا۔ فراش خانے سے اس نو تعمیر شدہ بارگاہ تک کارندے دوڑتے پھرے۔ محفل وزربفت سے تیار کردہ زریں بارگاہ میں ایرانی و تورانی قالینوں کے علاوہ گوشکان، خورستان، کرہان اور سبزوار سے آئے ہوئے قالین سازوں کے آگرہ، فتح پور اور لاہور میں تیار کردہ چوبیس چوبیس گز اور سات سات طسوج لمبے قالینوں پر اورنگ شاہی سے فاصلے پر کابل و فارس سے منگوائے گئے تکیہ مندرہ ریشم سے تیار کردہ جاجم، شطرنجی اور بلوچی دھری ہیں اور سونے کے مرصع تخت کے سامنے کے رخ پر چار لوازمہ حشمت کو کبہ آویزاں ہے اور پیچھے غلام بند علم، پانچ عدد دقر کے ہمراہ دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے ہی ظل سبحانی نے قدم رنجہ فرمایا، علم ریشمی غلافوں سے باہر نکال کر آویزاں کر دیے جائیں گے اور حاضرین محفل دست راست پیشانی پر رکھ کر کورنش بجالائیں گے۔

نقارے پر چوٹ پڑی۔ ”نگاہ رُوبرُو..... نگاہ رُوبرُو..... نگاہ رُوبرُو“ نقیبوں نے یک زبان ہو کر آواز بلند کیا۔ ایک ارادت مند پکارا: ”اللہ اکبر“۔ حاضرین محفل یک زبان ہو کر بولے: ”جل جلالہ“۔

اس وقت تک شہر یار مرزا، کمال مہارت سے سنی کے گلاس میں قدرے زیادہ انڈیل کر پانی سے سطح برابر کر دیتا رہا تھا۔ نیز اس نے سگریٹ بھی سلگا رکھی تھی، جس کی راکھ تو اتر سے سنی ہی کے گلاس میں گرتی رہی تھی اور یہ عمل سنی کو الٹا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب ڈاکٹر نذیر نے جل جلالہ کہا تو سنی نے راجا رسالو کے کندھے پر سر ٹیک دیا۔

یہ دیکھ کر راجا صاحب نے احوال جاننے کی خاطر ہاتھ لہرا کر صرف اتنا کہا: ”اکھڑے تے..... اکھڑے تے؟“

یہ سننا تھا کہ سنی نے پنجابی گیت کا بول لکنت آمیز آواز میں مکمل کر دیا: ”لڑائی جا، چپ کر کے۔“
 ”ہاں..... اکھڑے تے لڑائی جا، چپ کر کے۔“ راجا صاحب نے کسمسا کر فضا میں ہاتھ لہرایا تو سنی، شہر یار مرزا کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چپ کر کے، ہاں..... چپ کر کے۔“ سنی نے اپنے ہونٹوں پر دائیں ہاتھ کی انگلی ٹکا رکھی تھی اور زرت بھاؤ دکھا رہا تھا۔
 ”ارے پکڑو اسے۔ شیطانو، تم نے کیا بنا دیا اسے..... ارے پکڑو، تم لوگ کمرے میں نہیں، پہاڑ پر ہو۔ خبردار! اس کا ذرا سا پاؤں رپٹا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

وہ تینوں تالیاں بجا رہے تھے۔ ”ہاں..... چپ کر کے..... ہاں، چپ کر کے۔“
 ڈاکٹر نذیر اٹھے اور لہریے لیتے، سنی کو بازوؤں میں بھر کر اپنے قدموں میں بٹھالیا۔
 ”اس کا کام ہو گیا، ڈاکٹر صاحب۔ اب اس نے نہیں اٹھنا۔ اب یہ یہیں پڑا رہے صبح تک..... یقین مانیں، نہیں اٹھے گا۔“ مغلیٰ آنکھوں والے نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

اب سنی، وہیں پسر گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔
 ”کیا وقت ہو گیا ہوگا؟“ ڈاکٹر نذیر نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی۔ ”آدھی رات ہو گئی، ڈاکٹر صاحب، ہڈی کی آواز جیسے کنویں میں سے ابھری۔“

یہ دیکھ کر ڈاکٹر نذیر گویا ہوئے: ”ایک زرگر کے دل میں خدا طلبی کا درد پیدا ہوا تو اس کے مرشد نے اس کا دلی تعلق ایک گائے سے کروادیا اور اسے ایک تنگ جگہ پر بٹھا کر ہمہ وقت گائے کے خیال میں محور ہونے کی ہدایت کی۔ قلیل مدت بعد جب مرشد نے آزمائش کی خاطر اسے، اس تنگ جگہ سے باہر نکلنے کا حکم دیا تو وہ شخص گائے کے خیال میں اس قدر محو ہو چکا تھا کہ نے معذوری کا اظہار کیا اور بولا: ”مرشد! میں اتنے بڑے سینگوں کے ساتھ اس تنگ دروازے سے باہر کیسے نکلوں؟“

”بس یہی حالت میری بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب۔“ ہڈی بولا۔
 ”کیا مطلب؟ چلو سمیٹو یہ سارا کچھ اور چلیں ریست ہاؤس کی طرف..... لیکن سنی تو اس قابل نہیں رہ گیا۔ آپ تینوں میں سے کوئی ایک یہیں رکے گا رات بھر ڈاکٹر نذیر یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی بالکل۔ میں رکوں گا یہاں..... سنی کے ساتھ۔“ ہڈی نے جھٹ ہامی بھری۔
 ”تاکہ کوئی حادثہ نہ پیش آئے۔“ مغلیٰ آنکھوں والے نے زیر لب مسکراتے ہوئے راجا رسالو کا کندھا دبایا اور دونوں، ڈاکٹر نذیر کی معیت میں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ ڈاکٹر نذیر کو کیا خبر کہ جب سنی اس پہاڑی پر اکڑوں بیٹھاتے کر رہا تھا تو ہڈی پتھروں پر سنبھل کر قدم رکھتا ان کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔

اس ہنگامہ خیز مشن نے راجا صاحب کو نڈھال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نذیر کی معیت میں کھانا کھا چکنے کے بعد وہ سب نظر بچا کر گرتے پڑتے نکل لیے اور تھوڑی دیر بعد ہڈ بھی اُن سے جا ملا۔ اس وقت بیڈروم میں ان دونوں کے بیچ خراٹوں کا مقابلہ جاری تھا۔ شہر یار مرزا، گرد و پیش کی سُن گُن لینے کی خاطر صفیہ کے ساتھ لان میں جا بیٹھا تھا۔ وہ جب سونے کے لیے اندر آیا تو ایک جانب سے مسلسل سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی اور دوسری جانب سے غراہٹ۔ دو ایک بار زور سے کھانا بھی، لیکن وہ دونوں تو جیسے شرط بد کر سوئے تھے۔ تھکاوٹ کا احساس تو شہر یار مرزا کو بھی تھا، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے الماری میں ٹنگا ہڈ کا سلپنگ سوٹ نکال کر پہنا اور لیٹ گیا۔

جلال الدین محمد اکبر کے سفر کشمیر کے دوران، ۱۵۹۷ء میں رجوڑی کے مقام پر کیا ہوا؟ گزشتہ روز سے یہ گتھی، وہ سلجھائیں پار ہاتھا۔ شہزادہ سلیم، بارگاہ اکبری میں حد ادب سے آگے بڑھا تو کیوں؟ کیا صاحب عالم ظل الہی کے سینے میں خنجر گھونپ دینا چاہتا تھا؟ شہر یار مرزا نے ذہن پر زور ڈال کر ابوالفضل کی ”آئین اکبری“ کے آئین ۱۶ کو دھیان میں لانے کی کوشش کی، جس کے تحت بادشاہ کی اپنی اولاد کو بھی مناسب فاصلے پر رہنے کا حکم تھا۔ پھر اسے شاہی سواری کے اسباب قیام و منزل کی کچھ یاد آئی اور آج کے ہنگامہ خیز مشن کی بے سروسامانی بھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ پھر اُس نے دیکھا کہ جھٹپٹا سا ہے، گلال بار بچھی ہے۔ اس سے قدم آگے بڑھائیں تو قفل و کلید سے کھلنے والا دروازہ ہے اور طلسمی خیمے کا گھیر سونگڑ مربع۔ جس کے گرد چوبیس گز لمبی اور چودہ گز چوڑی قنات ہے۔ راؤٹی سے متصل، دو منزلہ خیمے میں مے نوشی کی محفل جمی ہے۔ جہاں پناہ، جلال الدین محمد اکبر رونق افروز ہیں اور اراکین دربار کا مجرا قبول کر رہے ہیں۔

اس خیمے کے ساتھ زردوزی، زربفتی اور مٹلی سا بنان لگے ہیں اور ان کے ساتھ والے خیموں میں چاق چو بندار دیگیلیاں مستعد کھڑی ہیں، جن کی نظریں مسلسل حرم شاہی کا طواف کر رہی ہیں۔ دولت خانہ خاص کے سامنے مہتابی کے گرد پاسبانوں کے سخت پہرے کے باوجود حرم شاہی سے ایک سایہ قنات کے ساتھ جڑ کر نکلا اور صاحب عالم کے خیمے کی تاریکی کا حصہ بن گیا۔ شہر یار مرزا کو یوں لگا جیسے وہ کوئی اور نہیں، انار کی کلی ہو۔ چلتے ہوئے ڈگ بھرنے کا وہی انداز اور ہاتھ میں جسے کوئی شے تھام رکھی ہو۔

" Hello, Every body! First call for breakfast."

راجا صاحب کی آواز سنائی دی تو شہر یار مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چونک کر کروٹ لی۔

اس نے دیکھا کہ برآمدے میں کھڑی شازی چچ سے تام چینی کی پلیٹ بجاتے ہوئے، اب پلٹ کر ڈائنگ ہال کی جانب جا رہی تھی۔ ڈگ بھرنے کا وہی انداز اور ہاتھ میں جیسے کوئی شے تھام رکھی ہو۔

”شہزادہ، جاگ گیا کہ نہیں؟“ راجا صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”راجا صاحب، میں سویا ہی کب تھا؟“

نہیں میرا چاند سویا اور خوب سویا۔ رات کو خنکی بڑھ گئی تھی۔ دوبار تو سردی کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے اور دونوں بار اپنے شہزادے کو اس چادر سے ڈھانپا ہے، جو میرے جگر نے اس وقت اوڑھ رکھی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں راجا صاحب، اب تو سونے اور جاگنے کا فرق نہیں رہ گیا۔“ مغلی آنکھوں والے نے کسلمندی سے کروٹ لی۔

”مرزا یار..... اب اٹھ بھی جا۔ آج کے سیشن میں بات کرنی ہے میں نے۔“ ہڈ ہڈ نے اُسے جھنجھوڑا۔

”اوہ! ہاں۔ میں ابھی آیا۔ sorry“ شہزاد مرزا نے یہ کہا کہ ہڈ ہڈ کے ہاتھ سے تولیہ جھپٹ کر واش روم کی طرف نکل گیا۔ یہ سوچتے سوچتے کہ انار کی کلی گزشتہ دو روز سے بجھی بجھی کیوں ہے۔

.....مرحبا ریسٹوران کے صدر دروازے پر کس قدر کھلی کھلی اور خوش تھی..... کیا ہو گیا اسے؟

شہزاد مرزا جب تیار ہو کر ڈائننگ ہال کی طرف نکلا تو سرخ بالوں والے خاموش طبع محقق پورے فلم یونٹ کے لیے بے تکان Tips فراہم کر رہے تھے اور وہ سب سر جھکائے نوٹس لینے میں جُٹے تھے۔ انھوں نے شہزاد مرزا کو اُس طرف آتے دیکھا تو بولے:

”شہزاد، تم نے گزشتہ سیشن میں ایک بہت اہم سوال اٹھایا تھا کہ قلعہ لاہور اکبر کا محل اور محل سے ملحقہ حرم سرا جیسی اہم عمارات کیسے نیست و نابود ہو گئیں؟ جہانگیر اور شاہجہاں نے ان کی دیکھ رکھی کیوں نہ کی۔ تم بلاشبہ تاریخ کے اچھے طالب العلم ہو۔ کیا جہانگیر، جو ایامِ شاہزادگی میں دین الہی کا پیروکار رہا۔ اُس نے ان عمارات سے صرف نظر اس لیے تو نہیں کیا کہ اُس نے امن و آشتی کے پیام براور دین الہی کے روحانی مرشد اکبر کا انار کلی کے ساتھ بیہیمانہ سلوک دیکھ لیا تھا؟ نیز یہ کہ اکبر کے خلاف اس کی بغاوت کے دنوں میں بہ مقام اکبر آباد، نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری نے اس کی کھل کر حمایت کی تھی اور فرید بخاری، خواجہ باقی باللہ کی علما سواور دین الہی کے خلاف چلائی گئی تحریک کے سرگرم اراکین شیخ احمد سرہندی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے حد درجہ متاثر تھے۔ لہذا ایامِ جوانی کا انتہائی عیاش اور عاقبت نااندیش شہزادہ سلیم، نور الدین محمد جہانگیر کی صورت ایک نئے روپ میں سامنے آیا؟ کیا کہتے ہو؟“

شہزاد مرزا مسکرا کر بولا: ”سر، آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ بہ صورتِ دیگر اس کے لیے ایسی کیا مشکل تھی کہ ان عمارات کو منہدم ہونے سے بچا نہیں پایا۔ جہانگیر نہ صرف شیخ فرید بخاری بلکہ اپنے رشتہ کے چچا، اکبر کے رضاعی بھائی مرزا عزیز الدین خان اعظم، مرزا عبدالرحیم خانِ خاناں اور خانِ جہاں لودھی جیسے امرا کے زیر اثر رہا، جن کا مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے رابطہ تھا۔“

”میں ان بچوں کو اس تبدیل شدہ فضا ہی کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے پروفیسر نیرنگ نے شہزاد مرزا کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دونوں ناشتہ کرنے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔

درد مندوں کا دلیر

(نو تصنیف ناول کے تین باب)

۱

”..... بات یہ ہے کہ میں تم سے شرمندہ بھی ہوں کہ ماں کی موت پر بروقت نہیں پہنچ سکا۔ مجھے پہنچنا چاہیے تھا کچھ ایسے معاملات آڑے آ گئے.....“، لیکن آخری بار جب بات ہوئی تو تم بتا رہے تھے، ان کی صحت بتدریج بہتر ہو رہی ہے؟“ اس نے اپنی پہلی بات کو ادھورا چھوڑ کر مجھ سے پوچھا۔

”ہمیں ایسا لگ رہا تھا..... (میرے چہرے پر درد انگیز مسکراہٹ پھیلنے لگی، جسے شاید اس نے بھی دیکھا۔) میرا یہ معمول تھا کہ میں دفتر جانے کے بعد گھر فون کر کے اکثر ماں کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میری بچی ماں کے سرہانے بیٹھے اس سے سیکھی ہوئی دعائیں پڑھنے لگی تو ماں نے میری بیوی کو بلا کر کہا، ”اب میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی، دیکھو تو میری تندرستی کے لیے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے کتنے خلوص کے ساتھ دعا مانگ رہی ہے اور میں جانتی ہوں کہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مانگی ہوئی دعاؤں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے.....“، لیکن ہمیں غلط فہمی ان کی اس بات سے نہیں ہوئی؛ اُس کی طبیعت میں بھی بہتری کے آثار تھے..... اس دوران تمہارا فون آ گیا۔ میں نے تمہیں بھی بتا دیا۔“

”طبیعت میں بہتری کے آثار سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”دفتر جانے سے پہلے، میں جب اس کے کمرے میں گیا تو اس کے وجود پر بیماری کے اثرات کم پڑتے دکھائی دیے۔ اب اسے اپنی نظر کا دھوکہ ہی کہوں گا..... اس نے مجھے مسکرا کر پیار کرتے ہوئے الوداع کہا لیکن حقیقت کیا تھی، میں نہیں جان سکا۔ ویسے تو خیر ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے لیکن مجھ پر بہت سی باتیں آہستہ آہستہ کھلنے لگی ہیں۔ مجھے یہ پتا چلا ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی موت تمہارے حوصلے، تمہارے ارادے کی موت بن کر تم پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ میں اچھی طرح یاد کر سکتا ہوں کہ شدید موسموں کی لپٹوں میں ماں کا تھکا تھکا سا وجود، میرے مرجھائے احساس کو آشیر واد دیتا۔ شام تک تھکاوٹ بڑھتے بڑھتے مجھے دیواروں کے ساتھ لگا دیتی۔ میں اچھا خاصا جوان جان ڈھسا پڑتا، لیکن ایک اگلی ہی صبح، اس کا مسکراتا وجود، ہلکے ہلکے سفید بالوں سے جھانکتے نور کی کرنوں سان میرے اندر ایک نئی طاقت بھر دیتا۔ میں ایک نئے عزم، ایک نئے ارادے کے ساتھ دنیا سے مقابلے کے لیے تیار ہوتا۔“

”تمہارے خیال میں اُس صبح ماں کے وجود پر بہتری کے جو آثار تمہیں دکھائی دیے وہ وقتی اور ناپائیدار تھے؟“

”یقیناً وہ عارضی نوعیت کے تھے کیوں کہ انسانی وجود پر پڑنے والے کھرٹا اور سلوٹیس ایسی چیزیں ہیں، جن کی شکلیں کوئی آلہ، کوئی استری

درست نہیں کر سکتی ماسوائے موت کے۔ اگرچہ موت بھی یہ شکلیں کب مٹا سکتی ہے؟ ہماری نظروں سے پورے کے پورے وجود کو اپنی تمام تر شکنوں اور کھرندوں کے ساتھ محض اوجھل کر دیتی ہے۔“

اس نے میرے ساتھ مل کر موت کے فلسفے کو کچھ اس انداز سے بیان کرنا شروع کیا، جیسے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی متفق ہو کہ دوسرے کی موت کم از کم تمھاری آدھی زندگی جبکہ مرنے والے کی پوری زندگی کے خاتمے کا عنوان بن کر تمھاری ہر کہانی میں وقفہ وقفہ سے درآتی ہے۔

”لاکھوں سائے، پرچھائیاں، ڈوبتے اُبھرتے خواب، ادھوری، کبھی نہ پوری ہو سکنے والی تمنائیں، روحانی شب بیداریاں آخر میں موت پر جا ختم ہوتی ہیں۔ موت کو زندگی کے لبادے میں دیکھنے کی تمنائی روئیں وہاں صدیوں سے مضطرب پڑی ہیں۔ ہرنے آنے والے کو اپنا مسیحا سمجھتی ہیں، جب کہ ہر آنے والا خود اُن کا حصہ بن جاتا ہے اور منتظرین میں شامل ہو جاتا ہے۔ دائمی اور ابدی انتظار کھینچتا ہوا۔ بہر حال موت برحق ہے، ہمیں سمجھنا چاہیے۔ اُس نے یہ کہتے ہوئے سرد آہ بھری اور ہاتھ میں لیے گھاس کے خشک تنکے کی مدد سے زمین پر اُگی سرسبز و شاداب گھاس کو کھدینے لگا۔ جو بجری اور سیمنٹ کے فرش میں دراڑ پڑنے والی جگہ پر اُگ آیا تھا۔

”موت دراصل ایک ایسا راستہ ہے، جس سے پلٹنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم آخری وقت تک اسے اختیار کرنے سے کتراتے ہیں۔ جیتے جی ہم لاکھ انجان، بھیڑ بھرے پُر پیچ اور پُر خطر راستوں کا سفر اختیار کر لیں، ہمیں اپنے پیاروں کے پاس پلٹ آنے اور اُن کے کاموں اور دکھوں میں ساجھے داری کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں لیکن موت کے راستے پر چلنے کے بعد ہم مسلسل زندگی پر گھات لگائے رہتے ہیں اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے کسی پیارے سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھالے جس کے بعد اس کا پالا رنجوں اور کلفتوں سے پڑے۔ دیکھتے دیکھتے ہماری یہ گھات اس ہوس میں بدل جاتی ہے کہ کب میرے یہ پیارے ایک ایک کر کے میرے پاس چلے آئیں کہ میں اُن کی حرارت بھری موجودگی میں آنکھیں موند سکوں، آنکھیں، برسوں بیت گئے جنھیں پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ میری اس بات کے بعد بہت دیر تک خاموشی رہی۔ ہم دونوں سامنے چھوٹی سی کیاری میں خود روشہ توت کی پچیلی شاخوں کو ہوا میں لرزتے دیکھتے رہے۔ اس دوران سٹھر پر کوئی نہیں آیا..... ماسوا میری بیوی اور بچی کے جوششے کے جگ میں پانی، دو گلاس اور دو کپ چائے کے دینے آئیں۔ بچی اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دونوں گلاس تھامے یوں آئی جیسے خود بھی شیشے کی بنی ہو۔ گلاس زمین پر پچھی چادر پر رکھنے کے بعد میری انغوش ہی میں ٹک گئی۔

”شاید وہ بچ ہی جاتی۔“ چائے پینے کے دوران میں پھر سے اُس کی باتیں کرنے لگا۔ مبادا ہم اُس کے ذکر سے چوک کر کسی اور موضوع پر بات نہ کرنے لگ جائیں۔ ”لیکن آخر اُس کا ایمان موت پر زیادہ پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔ یوں بیماری اس کے وجود پر آکاس نیل کی طرح پھیلتی چلی گئی اور وہ ہرے بھرے شجر کے جیسی سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ سا بن گئی اور یہ بات بھی میں نے اسی کے توسط سے جانی کہ مذہب سے گہرے طور پر وابستہ انسانوں کا یہ وتیرہ بن جاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت موت پر کامل ایمان کے ساتھ جیتے ہیں۔ پھر

تصوف کی طرف اس کا میلان شروع ہی سے تھا۔ کچھ برس پہلے اس نے اپنے طور پر پڑھنا سیکھ لیا تھا، کبھی کبھار مجھ سے بھی لفظوں کے بچے سمجھا کرتی لیکن زیادہ تر خود ہی سیکھا۔ صوفیہ کے کلام پر مشتمل صوفیانہ افکار کا خزانہ اس کے رمل پر دھرے قرآن اور الماری کے آس پاس موجود ہوتا۔ ورد کثرت سے کرتی رہتیں ایک بات بہت زیادہ کرتی تھیں۔ ”میں سے کوئی بھی یہ نہیں جان پایا کہ دنیا کے پاس ایسی کون سی دل کش شے ہے (کہ دنیا بذات خود تو کوئی دلکش شے نہیں)۔ جس پر زندگی اور زندگی جینے والے ایمان لے آتے ہیں اور کسی صورت اس کا پیچھا چھوڑنے پر رضا مند نہیں ہوتے۔“ اس کا یہ قول میرے پاس بطور امانت محفوظ رہ گیا ہے۔ ہاں، ہم دوسروں کی زندگی کے شب و روز اور ان کی باتوں کے امانت دار ہی تو ہوتے ہیں۔ انسانی خوشیوں کا شور و غل، درختوں کے پتوں پر نقش چھوڑتی خزاں، ہری دوب اور فصلوں کی ہریالی، کچی راہوں سے دھول اڑا کے جاتی ہوئی نرم ہواؤں کے گیت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہماری سسکیاں آہ و بکا میں ڈھلنے لگی تھیں۔ شام درختوں کی پرچھائیوں میں پرندوں کی چچھبھاٹوں سمیت ہمارے سروں پر گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔۔۔۔۔ وہ بہت آگے چلی گئی تھی۔ سسے کے بھید بھاؤ سے پرے۔ اجاڑ موسموں کے کنج میں جہاں تھلوں میں جولائی کی لوائیں جگہ جگہ سے ریت اڑا تیں، ٹیلے بناتیں، انھیں پھر سے مٹا دیتیں، پھر سے بنا دیتیں، مٹانے، بنانے کا یہ کھیل ان گنت سموں سے جاری ہے۔ جنھیں محسوس کر کے مجھے ایک شاعر کی نظم کی یہ سطر یں یاد آتی ہیں:

”چمکتا ہو جب سر پہ بے دید سورج

دودھاری سی تلوار بن کر چلے لو

تو گردن جھکا کر ہمیں یاد کرنا“

اسے یاد کرنے کے سوا، ہمارے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے اور وہ بھی گردن جھکا کر۔ جولائی کی جس سے پھول کر غبارہ سی بنی لوکی دودھاری تلوار کیسے ہرے بھرے جسموں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے؟ اس کا تجربہ تو ہر حساس وجود کرتا ہوگا۔؟“

”ضرور“ اس نے کہا۔

ہماری گفتگو تارکول کی سڑک پر جا رہی ہے ایک ایسے انجن کی طرح تھی جو کسی خرابی کے باعث کچھ دیر چلتا اور پھر یک دم گرڑ گرڑ کرتا ہوا بند ہو جاتا۔

”ہم اس بات کے آرزو مند تھے، ہم یعنی اس کے بچے (میں نے یہ وضاحت کرنا لازمی سمجھا)۔ کہ ہم اسے ایک پُر آسائش زندگی مہیا کرتے اور وہ اچھے دنوں کی گزرگاہ پر چلتے ہوئے زندگی کو الوداع کہتی۔ یا پھر تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ میں اب تک اس بات سے خائف ہوں کہ وہ ماضی جو غم اور مسرت دونوں میں پُر وقار دکھائی دیتا تھا، وہ بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ جو صحن میں اس کے چلنے پھرنے، باتیں کرنے۔ عبادت کے دوران، یہاں تک کہ خاموشی میں بھی اپنے آپ کو دہراتا رہتا۔“

”اگر تو تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ وجود وقت کے پنچے میں آ کر پس جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے، تو دوسری بات ہے۔ ورنہ

روح کو موت نہیں آتی۔ روح، زندگی کے بھرپور احساس کا دوسرا نام ہے اور پھر تم بھی تو ماں کی زندگی کا ایک روپ ہو، بالکل وہی نہیں، لیکن اس کی پرچھائیں کی چھوٹ تو پڑتی ہے ناں تم پر؟“ سین نے میری بات کا جواب نہایت منطقی انداز میں دیتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ (سین نے اپنی بات جاری رکھی)۔۔۔۔۔ وقت اور وجود کے معاملے پر الجھنے کی جتنی خواہش انسان کو ہے، فطرت کی کسی اور شے کو نہیں۔ اس لیے تم دیکھتے ہو کہ ماسوا انسان کے فطرت کی دیگر سبھی اشیاء نہایت سکون سے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جتنا آسان وقت سے معاملہ کرنا ہے، اتنا آسان تو کسی انسان سے بھی نہیں۔ بات سمجھنے کی یہ ہے کہ وقت دریا کے سے بہاؤ کی مانند بہتا ہے۔ پہلے پہل یہ ہمیں افسردہ اور مبہم انداز میں نظر آتا ہے اور پھر جوں جوں دن، مہینے اور سال گزرتے جاتے ہیں، اس کی رفتار میں تیزی آتی چلی جاتی ہے۔ دریا کے پانی کی طرح وقت کا بہاؤ بھی بچپن کے خیالات سے نشوونما پانے والی خود رو نباتات اور گھاس پھوس میں اٹکتا ہے لیکن یہ انکا محض کچھ لمحوں، کچھ لمحوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر پانی ہمیں ادھر ادھر راستے بناتا بھی دکھائی دیتا ہے پھر یہاں سے نکلتے ہی یہی پانی یعنی وقت پہاڑی چٹانوں سے آبشاروں کی مانند خود کو اُچھالتا دکھائی دیتا ہے۔ بیس بائیس برس کی عمر تک ہمارا خیال ہوتا ہے کہ وقت کے اس بہاؤ کی وسعت لامحدود ہے۔۔۔ دوسری طرف دیکھیں تو یہی وقت ایک عجیب و غریب مادہ دکھائی دیتا ہے جو اپنے آپ سے ہی خوراک حاصل کر کے اپنے آپ پلتا رہتا ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتا، لیکن بہر حال ایک لمحہ آتا ہے، جب وقت، انسان پر گزرتے برسوں کی فریب کاری کا انکشاف کرتا ہے۔ ایسا لمحہ ہمیشہ آتا ہے۔“

”یقیناً وہی لمحہ ہے جو ماں کی موت کے ساتھ مجھ پر بھی آیا۔“ میں نے سین کی بات کا ٹٹے ہوئے کہا۔ حالاں کہ اگر میں اس کی بات نہ بھی کاٹتا تو بھی شاید اس کے پاس اس مسئلے پر کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ”شاید یہی وجہ ہے کہ میں وقت کی اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کے جتن میں خود بھی الجھتا چلا جا رہا ہوں۔ میری ذات بے حد پیچیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔“ میں نے اپنی بات کچھ اس انداز سے اس کے سامنے پیش کی کہ مجھے کہنا بھی نہ پڑے اور سین مجھے اس کا بھی کوئی حل دے دے۔

”اس مبتدیانہ گفتگو کو اگر آپ میری وسعت نظر، تازگی احساس اور فطرت سے ودیعت تو توں کا فیض قرار نہ دیں، جیسا کہ آپ اکثر کہتے ہیں۔۔۔ تو میں اس مسئلے کو حل کرنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ ورنہ وقت جیسی لائیکل کہانی کہ تار و پود کو آپس میں گوندھنے اور گوندھ کر اسے کوئی شکل دینے کا ڈھب نہ تو مجھے آتا ہے نہ تمہیں۔۔۔۔۔“ اتنی سی بات کر کے سین نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر بولا: اس کا ایک سادہ سا اور آسان حل تو یہ ہے کہ آپ ماں کی زندگی اور اس میں پیش آنے والے روزمرہ معاملات کو سیدھے سبھاؤ دیکھنا شروع کرو اور جب کبھی بیان کرنے لگو تو ایک تو اتر کے ساتھ۔ پیچیدگی خود بخود جاتی رہے گی۔

”ہاں، شاید تم درست کہتے ہو، ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کی زندگی کے واقعات اور یادداشتوں کو کاغذوں کے ٹکڑوں، ذہن کی چٹائی، اوپری سطحوں اور اس کے استعمال میں رہنے والی بچی کچھی اشیاء سے بندھی گٹھڑی کی صورت میں محفوظ کر لیا تھا۔۔۔ وقت آن پہنچا ہے کہ اسے میں ایک تسلسل کے ساتھ زمانے کے سامنے بیان کروں!۔۔۔“ ہاں“ اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہے اور

یہ بات جو میں اب کرنے چلا ہوں تو جناب سین! اس کو غور سے سنو، چاہو تو جواب دینے سے پہلے اس پر خوب سوچ بچار کر لو، ورنہ میری یہ الجھن بھی دوسری بے شمار الجھنوں کی طرح سلجھنے میں نہیں آئے گی۔ مجھے اکثر احساس ہوتا ہے کہ وقت کا کچھ حصہ جو ابھی ماں کو جینا تھا، پلٹ پلٹ کر ہمارے گھر کی دہلیز تک آتا ہے، بعض اوقات درود یوار سے گزر کر ہماری رسوائی اور سونے کی جگہوں تک چلا آتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ واقعی اس کی زندگی کے حصے کا کچھ وقت اس پار رہ گیا ہے، ایسے جیسے جلدی میں آپ اپنا قیمتی سامان پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے اس بچے کچھ وقت میں پیش آنے والے واقعات، خوشیاں، غم، تبدیلیاں، یہ سب کیسے وقوع پذیر ہوں گے۔ وقوع پذیر ہو پائیں گے بھی یا نہیں، یا وقوع پذیر نہ ہو سکنے کے رد عمل میں کسی قدر ترقی آفت اور صدمے کا روپ دھار لیں گے؟“

”ہمارے لیے ان بازاروں، گھروں، رہداریوں، فصلوں، کھیتوں، لوگوں اور اوّل اوّل خوب صورت نظر آنے والے نظاروں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا احساس کم و بیش ہر انسان کو ہوتا ہے۔ ہم اپنے خوابوں اور خیالوں میں انھی میں جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وہ گھر جس میں ہماری پیدائش ہوئی۔۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان جگہوں اور لوگوں کی قربت ہمارے ساتھ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ وقت اور اس کے ایک حصے یعنی ماضی کی آپس کی چپقلش ہے۔ یاد رکھو! ایک مقام ایسا بھی آتا ہے، جہاں ماضی وقت کا حصہ رہتا ہے نہ ہی وقت کے لٹن سے ماضی کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے۔ ان دونوں کی کھینچا تانی میں ہم ادھر دھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہی کچھ تو ہوا ہے، ماں کی کہانی میں تمہارے ساتھ اور ماں کے ساتھ بھی۔ جب تک وقت کے دریا کی طوفانی لہر اچھال کر تمہیں اُس پار نہیں پھینک دیتی، تم وقت کی اس پھسلن پر پھسلے ہی رہو گے۔“

سین کی گفتگو ختم ہونے کے بعد تادیر خاموشی چھائی رہی۔ میں نے اس کی بات کا واضح جواب دینے کی جگہ خود کلامی کا سا انداز اختیار کر لیا تھا۔ میری بات کی بازگشت ارد گرد دُوسری دیواروں سے ٹکرا کر واپس پلٹتی محسوس ہونے لگی تھی۔

”سکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھنا۔۔۔ اُس کا زمینوں سے واپس گھر آنے پر صحن میں اپنے بچوں کو بھوک سے مرجھائے، لوگوں کے ناروا رویے سے سہمے ہوئے تادیر سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے رہنا، گالوں کو پیار سے سہلاتے رہنا، اپنی جان پہچان کی عورتوں کے ساتھ جو زیادہ تر بیوائیں ہوتی تھیں، سرگوشیوں میں بات کرنا۔ ہمارے لیے کھانا بناتے ہوئے، بستی کے خاموش بازاروں سے گزرتے ہوئے، دکان سے کچھ خریدنے کے لیے جاتے ہوئے راستے میں اگر کسی نے حال احوال کرنے کے لیے روک لیا تو سر کو جھکائے جھکائے باتیں کرتے رہنا، اپنے دکھ بیان کرتے ہوئے آنسوؤں کو نہ روک پانا۔۔۔“ وہ آ رہی ہے۔ صحن کی ٹکڑیوں میں، آنکڑا مارے ہرنولیوں سے کھیلتے ہوئے میں اُسے دیکھتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ میں جان سکوں، وہ اس وقت خوش ہیں، غصے میں یا کسی سوچ میں گم ہیں۔ اس کے لیے مجھے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو بے حد مشکل ہو جاتا ہے یوں دیکھنا بھی۔ اب کے بار بھی اُسے دیکھے بغیر ہی میں نے نظریں نیچی کر لی ہیں۔ ہرنولیوں کو ایک دوسری پر تیزی کے ساتھ پھینکتے ہوئے۔ وہ غصے میں ہے۔ تھکاوٹ زدہ غصہ اس کے چہرے، آنکھوں یہاں تک کہ پورے وجود سے پھوٹ رہا ہے۔

ابھی زمینوں سے لوٹ کر آئی ہے، بھینسوں کو چارہ کھلا کے، نہلا کے، ہو سکتا ہے سہ پہر تک گھاس کاٹتی رہی ہو۔ جون، جولائی کے لوؤں اور جس بھرے دنوں میں گئے اور مکئی کے کھیتوں سے گھاس کاٹنا کس قدر مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ ایسے نپتے ہوئے دنوں میں کبھی کبھار میں بھی اُس کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ وہ مجھے ایک گنا توڑ دیتی ہے، میں جسے ہاتھ میں لیے پگڈنڈی پر کیکر کے سائے کے نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں تک جہاں میں بیٹھا ہوتا ہوں جس کی یلغار ہو رہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایک بار پھر سے میں اُسے دیکھتا ہوں۔ اب کی بار منظر کچھ بدلا ہوا ہے۔ میں اُسے بہت دُور سے دیکھ سکتا ہوں۔۔۔ وہ گاؤں کی ٹلڈ پر سے نکلتی پگڈنڈی کے سرے پر پہنچ چکی ہے، پگڈنڈی سے اُتر کے گاؤں کے شمال مشرقی بازار میں داخل ہوگی، جو ہمارے گاؤں میں اُبھرتے سورج کی طرف سے آنے والوں کے لیے داخلی بازار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس داخلی بازار سے وہ کچھ ہی پل کے بعد گھر ہوں گی۔ چولھے میں آگ جلے گی، روٹی پکے گی، جسے ہم ایک ہی ترکیب اور ایک سی ترتیب کے ساتھ کھائیں گے۔ کچے دودھ کے ساتھ سُرتے ہوئے۔ کھانے کے بعد بھی آگ جلتی رہے گی، بکڑیوں کے ساتھ ایلے بھی ڈالے جائیں گے۔ آنکھوں کی بینائی، جیسے ہی شام کے چھٹے سے رہائی پائے گی، ہمیں کہانی سننے کو ملے گی۔۔۔ شام کے چھٹے میں ماں کہانی اس لیے نہیں کہتی کہ ایسے میں مسافر رستہ بھول جاتے ہیں، مسافر، جو کہانی کے اندر سفر کرتے ہیں اور جو کہانی سے باہر ہیں، سارے کے سارے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ستاروں کی کہکشاں میں سے وہ ایک ستارہ جسے دُم دار ستارہ کہتے ہیں، خوب چمکنے لگے اور اپنی روشنی اور چمک میں آسمان کے دوسرے ستاروں پر غالب آجائے، کہانی شروع ہو جائے گی۔ ”ڈھول مارو اور رانی سہی، ان کے توتے اور ہرن کی کہانی۔ شہزادے، رانی، جانور اور پرندے کے تال میل سے بنی یہ کہانی چلتی رہے گی، یہاں تک کہ ہم نیند میں اوگھتے ہوئے بستروں پر جا لیٹیں گے۔ کہانی مکمل ہمارے سپنوں میں ہوگی۔۔۔ بچپن میں میرے بہت سے سوالات تھے، جن کے جوابات مجھے اُس سے نہیں ملے یا پھر اگر ملے بھی تو آج خود ان سوالات میں سے گزر نے کے بعد میں انھیں تسلی بخش قرار نہیں دے سکتا، شاید میرے ان سوالوں کے جواب اُس کے پاس تھے ہی نہیں، جیسے میری جوانی اور اس کے بعد کے دنوں میں وہ مجھ سے کئی سوالات کیا کرتی۔۔۔۔۔ چھیا لیس برس اُس کی ذات کی پرچھائیں بن کر گزارنے کے باوجود مجھے لگتا ہے، اس کے بارے میں، میں بہت سی باتیں نہیں جان پایا، ہاں اُس کے کچھ سوالوں کے بے تکے سے جواب دے کر اُسے مطمئن کرنے کی کوشش ضرور کی، جب اس طرح کے لایعنی جوابوں کی حقیقت اُس پر کھلی تو اگلے کئی دنوں تک ہمارے درمیان موجود سوالوں، جوابوں کی موت واقع ہوتی رہتی۔ مجھ سے پوچھتی نہیں، میں جان جاتا کہ اس کے من میں کچھ ہے لیکن خاموش ہے، کتنی باتیں، کتنی یادیں ہیں جو ایک ایک کر کے چلی آتی ہے۔۔۔“ اس کے بعد خاموشی کا ایک گہرا اور گھمبیر وقفہ آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ ”یہ ماں ہی تھی جسے خوب صورتی اور جوانی دے کر عورتوں کی سرگوشیوں سے لرزتے اس گاؤں میں بھیج دیا گیا لیکن اس کی تقدیر میں تنہائی کے گیت اور جدائی کے نوحے لکھے تھے۔۔۔۔۔ اُس کی زندگی رومان پرورد اسی اور نفسگی سے رچی ہوئی تھی۔ طبیعت میں سادگی اور لوگوں کے ارادوں کو بروقت نہ بھانپ سکنے والی معصومیت، اس کی ذات میں آخر وقت تک برقرار رہی۔ مجھے ماں کے ان اوصاف پر فخر رہا ہمیشہ۔ اوصاف، مرصع کار

اور گھسی پٹی دل آویزی سے لتھڑی میری شخصیت جن کی متحمل نہیں ہو سکی۔ اس کی غیر مرئی اور سحر آگین ذات کا اعتراف ہر اُس انسان نے کیا جو، اس سے ملا، جس نے اُس سے باتیں کیں۔“

مجھے، سین کے ساتھ بیٹھے خاموشی اور باتوں سے بھرا طویل سے بیت چکا تھا۔ ہمارے سامنے ہی دھوپ دیواروں سے ڈھل گئی۔ عصر ہوئی، اب مغرب ہونے لگی تھی۔ ابھی جھپٹا چھائے گا۔ دو وقتوں کے ملے سورج مغرب میں ایسے گرے گا جیسے سنہری جھیل میں کوئی تانبے کا جال پھینکے۔ یہ جال اپنے ساتھ وقت کی ہلکی سی رنگت لیے دو رانق میں دہکتی لالی میں جل بجھے گا۔ دن کی شکار کی ہوئی رات ہمارے اوپر اپنے پر پھیلا لے گی۔

میں خاموشی سے اٹھا، اپنا جوتا سیدھا کرنے اور اُسے پہننے میں اُسے کچھ وقت لگا۔ اس دوران اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہی کپکپاہٹ کبھی کبھی ہم اس کی زبان پر بھی محسوس کرتے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا اور کچھ ہی دیر میں گھر کے قریب سے بڑی سڑک کی طرف گرتی ہوئی گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی سے کئی بار آتے جاتے ماں گھر میں داخل ہوئی تھی، اپنے اُسی وقار کے ساتھ جو گاؤں سے اس کی ذات کے ساتھ چلا آیا تھا۔ پھر ایک دن اُسے کتنے ہی لوگوں کی موجودگی میں دفن دیا گیا، اُس کی دھیمی ہنسی، پُر وقار چال اور دانش بھری باتوں کے ساتھ، جواڑ سٹھ برس کی سیاحت جہان سے چُن چُن کر اُس نے اپنے دامن میں بھر لی تھیں۔ کئی بار میں اس کے ماضی کو ٹیپ پر ریکارڈ کرنے کا جتن کرتا، کئی بار کم پڑ جانے والے صفحات پر اس کی یادداشتیں تحریر کرتا۔ وہ بولتے بولتے اچانک رُک جایا کرتی۔ میں سمجھتا کچھ بھول رہی ہے لیکن ہمیشہ اُس کی یادوں میں سے یہ کوئی خاص پڑاؤ، کوئی خاص موڑ ہوا کرتا، جس سے آگے وہ اپنی بات چیت میں تسلسل برقرار نہ رکھ پاتی، یوں بات چیت کا یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا، پھر کتنے ہی برس گزر جاتے، اُس کی باتوں کو لکھنے کا سہ نہ بن پاتا لیکن اچانک کئی بار میری طرف سے اور بہت کم اُس کی طرف سے اس کی باتوں، اُس کی یادوں کو لکھ لینے کی تاکید بھری فرمائش ہوتی۔ میں اُس کی باتوں کو ہمیشہ سننے کا آرزو مند رہتا۔ اُس کی باتیں جو پیچیدہ حقیقتوں کے تھان سے خوابوں کے دیدہ زیب لباس بنانے کے مترادف ہوتیں۔ ماں ہی کے خوابوں سے کسی کی دانش بھری باتوں پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ خواب مشکل بھی ہوں تو انھیں ترک نہیں کرنا چاہیے، ہم محنت کریں تو بڑے سے بڑا خواب بھی پورا کیا جاسکتا ہے۔۔۔ ہم بچے تھے۔ تو سردیوں کی طویل تاروں بھری راتوں میں ماں چولھے پر سلگتی آگ کے ارد گرد دیر تک ہم بچوں کی محفل گرمائے رکھتی۔ آگ اور اس پر ماں کی تپش بھری باتیں جسموں کو عجیب کیف بھری حرارت پہنچا تیں۔ یہ راتیں عزم اور ارادوں سے لبریز ہوا کرتی تھیں۔ یہ عزم اور ارادے ماں کے ناقابل شکست وجود سے نشوونما پاتے۔ انھی راتوں میں سے کوئی ایک رات تھی، میں نے ماں سے کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ تمھاری عمر کے بڑھنے سے پہلے میں اتنا بڑا ہو جاؤں کہ تمھارے حصے کے کام اپنے ذمے لگا لوں، لیکن ایک خوف ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔؟“

ماں نے میرے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا: ”میرے ہوتے ہوئے میرے بچوں کو خوف کیسا؟“

”میں تمھاری روز بروز بڑھتی عمر سے خوف زدہ ہو رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جب میں بڑا ہوں گا، تو تم بہت بوڑھی ہو چکی ہو

گی!“

میری اس بات پر وہ ہنسنے لگی، اُس کی ہنسی میں ٹھہرے موسموں کا سا احساس تھا۔

”میری بڑھتی ہوئی عمر سے تمھیں اس لیے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ جیسے جیسے میری عمر بڑھے گی، میں زمانے سے بہت کچھ سیکھ چکوں گی اور یہ تمھارے لیے یعنی میرے بچوں کے لیے اچھا ہوگا کہ میرے بڑے ہونے تک تمھارے سیکھنے کی عمر ابھی باقی ہوگی۔“

لیکن اب میرے ساتھ اس بات کے ساتھ جڑا محض عمر بھر کا کچھتا وا ہے کہ وقت سے پہلے ہی میں نے فرض کر لیا تھا کہ میرے سکھانے کی عمر آچکی ہے۔ میں قدم قدم پر ماں کو روکنے، ٹوکنے لگا تھا جس سے وہ زود رنج ہو جایا کرتی۔ افسوس، اُس نے کبھی یہ نہیں کہا۔ ”چپ رہو ابھی تمھارے سکھانے کی عمر نہیں آئی اور ماں جو مجھے جیتے جی نہ بتا پائیں، اُس کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد ہی میں اُسے جان گیا۔

۲

در اصل ماں کی کہانی اور اُس کے ساتھ جڑے ہوئے واقعات کچھ اس طرح کے ہیں کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ مجھے کیا بیان کرنا چاہیے۔ کیا چھوڑ دینا چاہیے اور پھر یہ کہ کیا پہلے بیان کروں اور کیا بعد میں، ”واقعات تو ایسے جیسے تیز بوچھاڑ کے ساتھ برسنے والی بارش کی طرح مجھ پر برستے آتے ہیں۔۔۔۔۔

جہاں ہماری بستی تھی۔ وہ اور اس کے ارد گرد کا علاقہ بہت دیر بعد انگریزی عمل داری میں آیا۔ فریقین کے مابین غیظ و غضب اور طویل جنگ و جدل کے بعد انتظامی اصلاحات رائج ہوئیں۔ ان اصلاحات کا اطلاق محض انسانوں پر ہوا کیوں کہ زمین کو کاٹ پیٹ کر جب تک سیدھا پدھر انہیں کر لیا گیا، یہاں اُگنے والے درختوں خود رو جھاڑیوں، لے نو کیلے تنکوں والے گھاس، تھوہرا اور بھکھڑے نے ان اصلاحات کو قبول نہیں کیا۔ جن مقامی کسانوں نے محنت اور محبت سے اس زمین کو ہموار کیا ان میں میرے نانا اور دادا بھی شامل تھے۔

اور اس سے بھی کتنے ہی برس پہلے قدیم گزرگاہ اور دیر آباد شہر کے قرب و جوار میں میری دادی اور نانی کے والد (میری نانی اور دادی کہ سگی نہیں ہونے کے سبب ایک ہی تھے۔) اپنی خانہ بدوش زندگی کو اپنے چوڑے چکے کندھوں پر اٹھائے کسی مناسب اور ٹھکانہ کیے جانے کے قابل جگہ دھونڈنے کے جتن میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں میں نے پیدا ہوتے ہی گھر کے شمال مشرق سے چلنے والی گرم لوؤں کا استقبال کیا۔ گرم لوئیں جو چاول، مکئی، جوار اور گندم کے چھدرے کھیتوں کو دُور پار کی بستیوں کا احوال سناتی ہوئیں ہماری بستی سے یوں گزرتیں جیسے جلدی میں ہوں اور قبرستان کے گھنے گہرے درختوں میں چھپے پرندوں کے لیے کوئی پیغام لیے جا رہی ہوں۔ مجھے ان لوؤں کے لطن میں سے آواز سنائی دیتی۔

ہم ابھی کے ابھی واپس آئیں۔ تم ہمارے آنے تک کنوئیں کے ٹھنڈے پانیوں میں پاؤں دھرے، سر نہیوڑائے بزرگ عورتوں سے سنی ہوئی کہانیوں میں سے اپنی پسند اور ناپسند کے کرداروں کی نشان دہی کرو اور اپنے دماغ میں ان کی شبہیں تشکیل دو۔“ ہاں کس قدر عجیب و غریب تھیں شمال مشرق سے آنے والی یہ گرم لوئیں۔۔۔ میں جن لوگوں کے درمیان پلا بڑھا، اُن میں نسلوں سے خط اور جنون کا مرض چلا آرہا تھا۔ بعد میں ان دو امراض میں ایک اور مرض تپ دق کا اضافہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے، جنون نے بڑھ کر ہی تپ دق کی شکل اختیار کر لی۔ یہ دیکھا گیا کہ جب گرم لوئیں چلتیں تو صحن میں سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آتی اور بلغم کا لوٹھڑے کا لوٹھڑا صحن میں ہی جوتی سے بنائے گئے سوراخ یا چولھے کی راکھ میں جا گرتا۔ جہاں یہ لوٹھڑا گرایا جاتا وہاں مٹی بھر راکھ پھینک دی جاتی۔ میرے بڑے ہونے تک یہ لوئیں چلتی رہیں۔ جا بجا کھنکھارنے کی آوازیں آتی رہیں اور بلغمی لوٹھڑے گرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن دُور پار کے ایک رشتے دار لڑکے نے سکول میں مجھے آکر بتایا: ”تمہارا باپ مر گیا ہے، گھر چلو۔“ پونے ایک میل کا گھر تک کا یہ سفر میرے اندر کی دنیا کے لیے عجیب و غریب واردات کا سفر ثابت ہوا۔ یہ خبر میرے لیے اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ میں سمجھ نہ پایا۔ اس سلسلے میں مجھے کن کیفیات کا اظہار کرنا ہے۔ صحن میں پڑی چار پائی کے گرد روتی بین کرتی عورتوں میں سے ایک بزرگ عورت نے میرا چہرہ پیالے کی طرح اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھ سے کہا۔ نگڑا ہو پتہ اور ہمت سے کام لے۔ اب تجھے اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی، بہن کا بوجھ اٹھانا ہے۔“ مجھے یاد ہے اس کے بعد کتنے ہی عرصے تک نہ تو گرم لوئیں چلیں نہ ہی کھنکھارنے کی آواز سنائی دی، جس میں سے بلغم کی کھکھار گونجتی۔ کتنے ہی برسوں تک ہماری ماں کا ٹھنڈی چھاؤں جیسا سایہ محافظ پرندے کی طرح ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا۔

۳

جون، جولائی کی دو پہروں میں درختوں کی چھدری شاخوں میں سے چھتی ہوئی دھوپ ہمیشہ یہ پیغام دینے آتی کہ پرندوں نے اپنے اپنے ٹھکانوں میں بسیرا کر لیا ہے۔ تم بھی تیاری پکڑو، زمینوں پر پہنچو، کیکر کے درختوں کے نیچے زمین میں گڑے کھوٹوں سے بھینسوں کو کھولو۔ کچی مٹی کی بڑی بڑی اینٹوں سے اُساری حویلی سے انھیں نکالو۔ انھیں تالاب پر لے جاؤ۔ تالاب پر جاتے ہوئے وہ راستہ میں ادھر ادھر اُگی گہری دُوب اور گھاس پر منہ ماریں تو مارنے دو۔ تمہیں ایک پتہ اور مضبوط اعصاب رکھنے والے چرواہے کا ثبوت دینا ہوگا۔ تالاب پر پہنچ کر اگر یہ جلتے جلتے پانی سے پیاس بجھانا چاہیں تو بجھالیں، نہیں تو انھیں حویلی سے دُور شمال مشرقی قطعوں تک ہانکتے لیے چلے جاؤ، جہاں تمہارے ہم جولیوں نے بارہ ٹینی کی بساط بچھالی ہوگی، جہاں کھیلنے کے دوران بابا نور محمد اپنی کسی نئی من گھڑت کہانی، کسی نئے واقعے کے ساتھ موجود ہوگا۔ تم بھی اپنی بھینسوں کو نئی نئی کٹنے والی فصل میں چرنے کے لیے چھوڑ دو، اب بھڑکھا بھڑ زمین پر پہنچتے ہی وہ پہلے تیز تیز منہ ماریں گی پھر جیسے جیسے اُن کی بھوک کم ہوتی جائے گی، اُن کی چرائی میں ایک دھیرج، ایک سہتا آتی جائے گی اور یاد رہے کہ اس دوران تم اپنے کسی اُن دیکھے خواب سے تشکیل دی جانے والی کہانی گھڑ لینا، جو بارہ ٹینی کھیلنے کے دوران بابا

نور محمد کی کہانی کے جواب میں بے دھڑک سنا دینا۔ کیا ہوا جو تمھاری کہانی بابا نور محمد کی سنائی ہوئی کہانی کی ٹکری نہیں ہوئی تو کم از کم تمھیں وہ توجہ تو مل سکے گی جو کھیل کے دوران کھیل میں گم ساتھی نہیں دے پاتے۔ جو صرف اور صرف بابا نور محمد کے حصے میں آتی ہے۔ یقیناً بابا نور محمد کے پاس کہانی گھڑنے اور پھر اُسے سنانے کا ڈھب ہے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ بار بار کہانی سنا کر وہی ڈھب تم بھی حاصل کر لو۔“

آج اپنے آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے اور اپنے بیٹے ہوئے کل کے حوالے سے یاد کرتے ہوئے عجیب و غریب صورت حال کا سامنا ہے کچھ ایسا جان پڑتا ہے، اپنے وجود کے حاشیے پر بیٹھا میں جو کچھ سوچ رہا ہوں۔ اس میں سے بہت سا حصہ تو میرے بارے میں ہے ہی نہیں۔ البتہ میرا کچھ کچھ حصہ میرے پاس یوں دھرا رہ گیا ہے جیسے پانی پینے کے دوران اچانک پیاس کا احساس مر جانے سے آپ کچھ پانی گلاس میں باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس باقی رہ جانے والے پانی کا مصرف کیا رہ جاتا ہے؟ بے پرواہی میں کسی گگلے میں مر جھائے ہوئے پودے کو دیکھ کر اس پر پھینک دینا۔ میں کوئی دوسری ہی زندگی جینے لگا تھا۔ بدحواسی میں پلیٹ فارم سے چھوٹی ہوئی ریل کے آخری ڈبے کی طرح جس کا تھکا، گرتے سنبھلتے آپ کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ تب آپ کسی اندرون ڈبے کی تلاش میں آگے بڑھتے ہیں، پھولے ہوئے سانس کے ساتھ، تاکہ باقی ماندہ سفر دھیرج اور سکون سے کٹ سکے۔ اگرچہ شروع بچپن سے ہی بستی سے زمینوں کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے چلتے میں تخیل کے گھوڑے پر سوار دُور دراز مقامات پر جا اُترتا تھا جہاں زمین اور آسمان کے کنارے آپس میں مل رہے ہوتے۔ دلدلی اور کھاری زمینوں سے پرے۔ دھان کے سنہرے کھیتوں پر، پرواز کرتے اُس خوب صورت اور دنیا کی یکتا لڑکی کو اپنے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتا۔ کچھ برس ہوئے جس کے خیال کا دامن کسی گہری تاریک رات میں مجھ سے چھوٹ گیا۔ تخیل کی ان لہروں پر بہتے ہوئے بھی مجھے یہ خوف رہتا، جس کا اظہار میں بارہا ماں سے بھی کرتا۔ مجھے اس کی خبر ہے کہ ایک روز سفید جھاگ اڑاتے پانیوں کی گہرائی میں ڈوب مروں گا اور یہ بہت برس بعد نہیں، بہت جلد ہونے والا ہے۔ ماں مجھے اپنے ساتھ لپیٹا لیتی اور کہتی۔ اریب قریب پانی نہیں بہتا تو پھر تم ایسا کیوں سوچتے ہو، خدا تجھ سے دکھ اور غم کی پرچھائیاں دُور رکھے۔ بلوغت کے سن تک پہنچتے ہی میری ساری کی ساری خفہ حیات بھی بیدار ہونے لگیں، وہ جو نہ دیکھے جاسکنے والے خواب دکھائیں، جو پیش آنے والے حادثوں سے پہلے ہی خبردار کر دیتیں اور وہ بھی جو مجھے برسوں پہلے کے زمانوں میں لے جاتیں اور پھر پل کے پل میں واپس بھی لے آتیں۔ تبھی مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ میں زیادہ برس نہیں جینے والا اور بہت جلد سفید جھاگ اڑاتے پانیوں کی گہرائی میں ڈوب مروں گا۔ اس پر ماں جو قیاس کیا کرتی تھیں کہ اریب قریب تو پانی ہی نہیں۔ میرا وہم زیادہ تقویت پکڑتا کہ موت ہی تو ہے جو کوسوں دُور آپ کو با آسانی کھینچ لے جاتی ہے۔ زمان و مکان سے ماورایہ واحد اور یگانہ روزگار شے موت۔۔۔ شروع شروع میں یہ سارا ایک وہم کی طرح جان پڑتا تھا اور پھر یہ سارا کچھ تسلسل کے ساتھ مجھے خوابوں میں دکھائی دیا جانے لگا۔ اکثر یہ ہوتا کہ میں بیک وقت اپنے آپ کو سفید جھاگ اڑاتے پانیوں کی گہرائی میں ڈوبنے بھی دیکھتا اور کنارے پر گھٹنوں میں سر دیے پڑا بھی رہتا۔ بے حس و حرکت۔ ایسے ہی جیسے مجھے کسی نادیدہ قوت نے جکڑ رکھا ہو، پھر ماں کی آواز سنائی دیتی۔ ویسا ہی روپ دھارے جیسا تیز تپتی

دھوپ میں لوؤں کے کاندھوں پر سے تھرکتی ہوئی آیا کرتی ”پتر! سفر کا سامان باندھ لے، چاند نکل آیا ہے۔ یہ آخری راتوں کے چاند کے بارے میں ہوتا جو سورج سے کچھ ہی پہر پہلے نکلتا۔ زرد پتلی قاش کی طرح بیمار سا۔۔۔ چاند کی مدھم روشنی میں نہائے جنگل کی پرچھائیاں جھاڑیوں سے گتھی راہیں اور جنوب مغرب کی سمت کی اتریاں سب ایک ایک آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ فجر کی اذان ہوئے ایک آدھ پہر بھی نہ گزرا ہوتا، میں صبح کی سلیٹی رنگ روشنی میں زمینوں پر وقت سے کچھ دیر پہلے ہی پہنچ جاتا۔ بستی سے زمینوں کا فاصلہ کوئی سو ایک کوس تھا لیکن یہ سو ایک کوس میرے لیے کالاکوس ثابت ہوتا۔ عین اُس وقت جب چاند کے سامنے سے کوئی بادل گزر جاتا، جو بھی بادل کی پرچھائیاں، کھیتوں پر سے لہراتی ہوئی گزرتیں، آسمان پر صاف شفاف دھلا دھلا چاند چمکنے لگتا۔ میں اس کی جانب نکلتا۔ ندی میں بہہ رہے پانی میں اس کا عکس میرے اندر قیامت برپا کر دیتا۔ زمینوں پر پہنچنے کے لیے واحد راستہ ندی کے ساتھ سے ہو کر گزرتا تھا، میں چاند کی اور نہ بھی دیکھتا تو ندی سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔۔۔ ایک جھماکا سا ہوتا۔ میرے اندر جوار بھانا سا اٹھنے لگتا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ تب ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو جاتا۔ تو میں ندی کی جانب پیٹھ کیے پگڈنڈی پر بیٹھ جاتا۔ کئی بار تو دودھ کا خالی برتن ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا پڑتا۔ اس احساس سے جب واپس پلٹتا تو میری دونوں مٹھیوں میں ہری گھاس کے تینکے اور چھوٹے چھوٹے پات چھپے ہوتے (والیسی پر کہ جب دودھ سے بھرنا برتن میرے پاس ہوتا، میں آسمان اور ندی پر سے نظریں بچا کر جس طرح گھر پلٹتا، اس کا بیان محال ہے۔) ایسے میں کسی جانور کی خرخراہٹ، کسی پرندے کی کوہو، کیڑوں مکوڑوں کے رینگنے اور اپنے وجود پر ان کے پل پڑنے کا احساس کر کے اٹھتا اور چل پڑتا۔ دادے کی مشترک بڑی حویلی سے دونوں بھینسوں کو کھونٹوں سے کھولتا، تالاب سے انھیں پانی پلاتا۔ انھیں اپنی حویلی لے جا کر کھری میں بھاڑا ڈالتا اور دودھ دوہ کر بھینسوں کے وجود تھا پڑتا، گھر کی راہ پر ہولیتا۔ کتنے برسوں یہی معمول رہا۔۔۔ ان صبحوں میں جب پڑوس کے دالانوں میں دہی بلونے اور تلاوتوں کی آوازیں آرہی ہوتیں۔ پگڈنڈیوں پر جو راستوں کے لیے فرض کر لی گئی تھیں، اُن پر پاؤں میں روندی جانے والی گھاس ابھی اوس سے بھگی ہوتی، چچہاتے ہوئے پرندے نئی اڑانیں بھرنے کے لیے پر پھیلا رہے ہوتے۔ میں دودھ دوہ کر واپس پلٹتا تو تب تک ماں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ تیار کر چکی ہوتی۔ کھانے میں عام طور پر پراٹھا اور چائے ہوتی۔ چائے تب ہمارے مختصر سے کنبے کا روزمرہ کا معمول تھا، جس کے صحت پر دیر پا اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ آنکھیں پیلی پڑنے لگیں اور جسموں میں کمزوری بڑھنے لگی۔ پیلی زرد رنگت کے ساتھ چولھے کے راستے ہمارے صحن، کمروں یہاں تک کہ بستر وں تک گھس آنے والی کمزوری یرقان کا شاخسانہ تھی۔ ویسی ہی جیسی آخری دنوں میں ماں کے پورے وجود پر اُتر آئی تھی۔



دوہے

کیا بتاؤں بانورے ، کیسا ہے یہ دیس
پر جا ، راجا اوگنی ، مکھڑے بھن بھن بھیس

پر جا پاتھر بھوک سے ، دیس پڑا ہے کال
رانی گاتی ، ناچتی ، پاؤں میں بھنڈ سال

کیسی آس نراش ہے ، پل پل ہے انجان
سوگند لے کر گھونپتا ، سارا جگ کٹان

چکٹو چکٹو نیروا ، بُردے بُردے داغ
کیسا سُوندیشوا ، کیا بولے گا زاغ

پگلا جنگل ماپتا ، جوتی کو گھر چھوڑ
پرسادیت بھگ چیتا ، لیکھ خوشی کے پھوڑ

من گھوڑا ٹُکارتا ، سرجیون منجھار
لاسک مٹی ناچتی ، کون لگائے پار

جیون پُتک دس بھری ، یا یادِ رتجمنان
کیا لکھوں میں داستاں ، لکھوں اُتر دان

برہم وڈیا کاترتا ، رہو بھولا ناتھ
بھاوک ، پرگم یوگ پھل ، کیسے آئے ہاتھ

ایک سے کے پیار میں ، من کو لاگا روگ
جوگی تورا بھاگتا ، کانٹوں سے سنجوگ

جیھ ہوئی ہے لاکڑی ، پاوت شبد تو بول
ٹھٹ بیٹھامیں ڈوبتا، تیجس مکھڑاکھول

توری بانی کاکلی ، رس گھلتا بھنسا
خالی درشن مانگتا ، کاہے دے دھتکار

اے پیاری ! لیلآوتی ، جلمی سُدر نار
پرُہو موہے لکھ گیا ، تورا ٹیکا کار

کاٹے منوا ناگوا ، انتر باہر مون
کیا بتلائے مادھری ، من بھیتر میں کون

دوہے غزلیں یہ گہت ، اک ابلا کے نام
جس نے سرجیون مرا ، کر چھوڑا ہے شام

بس کر خاور بانورے ، کیا کھولو ہو بھید
پاتھر توری باکیہ ، کرتی ہردے چھید



آئینوں کی شہادت

وصالِ ہجر کے لمحے بھی آگئے آخر
 چلو حجابِ حقیقت سرکنے والا ہے
 ہر ایک شے کی صداقت اُبھرنے والی ہے
 محبتوں میں جو مضمحل تھیں نفرتیں کیا کیا
 ابھی وہ صورتِ آئینہ سامنے ہوں گی
 کہ آئینوں کی شہادت بڑی شہادت ہے

.....

وہ دن بھی تھے کہ صدائیں سکون پرور تھیں
 شبیں اُترتی تھیں افلاک سے سحر صورت
 جدھر نگاہ اٹھائیں قرارِ جاں پائیں
 قدم قدم پہ ہجومِ نظر نواز کی خیر
 مگر یہ دل کہ ابھی تک نہ اس کے چاک سلے
 کبھی فلک کو کبھی فرشِ خاک کو دیکھیں
 یہ رنگ و نور کے چشمے کہاں سے پھوٹ رہے؟
 پھر ان میں کون ہے جو بار بار لہرائے
 خیال لینے لگے جانے کروٹیں کیا کیا

.....

کہیں وہی تو صداقت نہیں ہے رنگوں کی
 کہیں اُسی کے تو جلوے نہیں ہیں جلوت میں

کہیں اُسی سے نہ روشن ہوں خلوتیں اپنی
کہیں وہی نہ رگِ جاں سے ہو قریب اتنا
کہ سانس لیں تو اُسی نام کی صدا آئے

.....

یہ ڈھلتی چھاؤں، یہ ہر سمت پھلتے سائے
یہ سبزہ زار، خزاؤں کے جیسے دیباچے
یہ زرد رنگ سے لکھی شجر کی تحریریں
ذرا سی فکر کریں تو سمجھ میں آجائیں
ذرا سی چاپ بھی تحلیل ہو فضاؤں میں
تو پل جھپکنے میں تصویرِ راگیر کھنچے
نگہ اٹھائیں تو قربت کے فاصلے کہہ دیں
نظر جھکائیں تو سب فاصلے سمٹ آئیں

.....

جسے بلائیں وہ کیوں بولتا نہیں آخر
یہ راز، رختِ سفر ہے جو پا گئے تو کہو
وصالِ ہجر مقدر نہ ہو اگر راحت
تو کون تاروں بھری رات جاگ کر کاٹے



(۱)

ٹی وی اینکر

میں تو کوئی کردار نہیں ہوں
 میں تو پردے کے پیچھے
 اسٹیج کے عقبی دروازے کے پاس کھڑا ہوں
 میرے منہ میں مانکر دفون کو باندھ دیا ہے ڈائریکٹر نے
 لہجہ بدل بدل کر ہر انداز کی قرأت میرا فن ہے
 سرگوشی سی، گلو گرفتہ، ہلکی، دھیمی آہٹ جیسی، گم صم سانسیں
 گرج، کڑک سی، غوغائی، پُر رعب، سماعت پاش آوازیں
 سب میرے فن کے کرتب ہیں
 صوتیات کا ماہر ہوں میں
 اعزازی، تکریمی باتیں کہتا ہوں
 جیسے خوشامد، در آمد ہی ایک اکیلا کام ہو میرا
 چرب زبانی کے ہاروں میں گندھے ہوئے
 سب بیٹھے بیٹھے، نپے تئلے تعریفی جملے
 میرے منہ سے یوں جھڑتے ہیں
 جیسے پھولوں کی کلیاں ہوں
 مسکہ، پالش، کاسہ لیلی میں یکتا ہوں
 گالی بکنے میں بھی میرا ثانی نہیں دنیا میں کوئی
 بغض و عناد، مذمت کے الفاظ وہ نوکیلے پتھر ہیں
 جن میں بدخواہی، بے مہری، استکراہ کا زہر بھرا ہے
 اور یہ زہر کدورت کے جذبے میں گھل کر
 حزب مخالف کے ہر دشمن پر یلغار کیے جاتا ہے
 میں اخبار کے کالم لکھنے والا ایک صحافی تو ہوں، لیکن

میں اسٹیج کے عقبی دروازے کے پاس کھڑا ہوں
میرے منہ سے لاؤڈ اسپیکر بندھا ہوا ہے
جس پالیسی یا حکمتِ عملی پر چلنے کی اسکرپٹ مجھے ملتی ہے
اس پر چل کر
اپنا کام کیے جاتا ہوں اور انعام لیے جاتا ہوں

(۲)

آج کا فاؤسٹ *

[محرف خفیف کورن آن لائنز کے التزام سے پڑھا جائے]

کب کیا تھا، یہ بات یاد نہیں
میں نے اپنی ہی شخصیت کے خلاف
ایک جنگِ عظیم کا اعلان

کون سی نامراد ساعت تھی
جس میں اس شخص نے جسے ماں باپ
”ستیہ“ کہہ کر بلایا کرتے تھے
اس صداقت کا اعتراف کیا
”ستیہ“ (سچائی) ایک اسم نہیں
دو الگ اسم ہیں معانی میں
نفسِ مضموموں میں سر بہ سر بے جوڑ
مختلف قول و فعل و محضر میں
اس صداقت کے اعتراف کے بعد
ستیہ کی شخصیت کے دو پہلو
ایک بیکار جنگ لڑتے رہے

کوئی بھی جنگ اسی (۸۰) برسوں میں
جیتی یا ہاری جا بھی سکتی ہے

صلح و آشتی بھی ہے ممکن
لیکن اس پر بھی یوں ہوا کہ مری
جنگ جاری ہے آج کے دن تک
آج میں سوچتا ہوں کاش مجھے
علم ہوتا کہ کفر اور حق، دو
باہمی رنجشوں کے نام نہیں
ایک سکھ ہیں جس کے دونوں طرف
ایک ہی نقشِ رخ عبارت ہے

عرصہ کارزار بے معنی
عمر بھر کی لڑائی بے مقصد

ٹریجیڈی میری ذات کی، لوگو!
فاؤسٹ سے کم نہیں، کہ میں نے تو
اک موفیسٹو فلیس کے ہاتھوں
روح کو مفت بیچ ڈالا ہے

English: Faust German: Faustus *
کے علم و حکمت کے خزانوں کے عوض اپنی روح کو شیطان (موفیسٹو فلیس) کے ہاتھوں بیچ دیا۔ شیکسپیر کے ہم عصر، مارلونے انگریزی
میں اس کردار کو لے کر شہرہ آفاق ڈراما تصنیف کیا۔

(۳)

بینا، نابینا

ستیہ پال آنند امدھا ہو گیا ہے

ذونگاہی * یوں بھی اس کی ذات کا شیوہ نہیں تھی
اپنی آنکھوں سے اُسے شکوہ بہت تھا

اپنے ”اندز“ دیکھ سکنے کی صلاحیت سے عاری
صرف ”باہر“ دیکھتی تھیں

دیکھتی تھیں
کم نظر لوگوں کی کم ظرفی
تفاوت

اُن کے ظاہر اور مخفی
دیدنی، نادیدنی اعمال میں
کردار کی، گفتار کی قہمیت میں
اس کی آنکھیں نامکمل عضو تھا اس کے بدن کا
کوئی مابعد انظر ** منظر بھی ان کو
اس قدر دل کش نہیں لگتا تھا
جس کو دیکھ سکتیں

مادر اہو کرانا سے، دُور ہٹ کر
دوسرے لوگوں سے عاری بھی تو ایک دُنیا ہے
ان اندھی گُھٹاؤں میں بسی
جو اس کے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں سو رہی ہے
اس کی آنکھیں (خود سے اس نے بار بار پوچھا تھا)

آخر رخ پلٹ کر
اُلٹے پاؤں گھوم کر
اندر کی جانب کیوں نہیں کھلتیں
انھیں کیا وسوسہ ہے، خوف ہے کیا؟
ستیہ پال آنند راندھا ہو گیا ہے
کس قدر خوش ہے

کہ مابعد النظر منظر بھی اس کی دسترس میں آ گیا ہے

* Double Vision

** Meta Vision

(۴)

تیسرا باب

ٹیورِ باغِ جناں کے پیشِ نظر فقط دو ہی راستے تھے
خوشی کا

جس میں خود اختیاری کا کوئی عنصر نہیں تھا، یعنی
خودی نہیں تھی

اُڑان بھرنے کا حق نہیں تھا

حدودِ باغِ جناں میں رہ کر

قفس سے باہر

مگر درونِ قفس کی حالت میں

تا ابد زندگی کی خوشیوں کو جھیلنا تھا

ٹیورِ باغِ جناں نے، لیکن

خوشی کے اس راستے کی رد و نفی کو اپنا شعار سمجھا

جو دوسرا راستہ دکھایا گیا تھا، اس میں

خودی تھی۔۔۔ خود اختیار کردہ عمل تھا، یعنی

اُڑان بھرنے کا حق تھا، لیکن

حیاتِ ابدی کی پیش کش چھین لی گئی تھی

خوشی نہیں تھی

کشاکشِ جہدِ لبثا تھی

ٹیورِ باغِ جناں نے پھر بھی
خودی کے اس راستے کو حسبِ پسند سمجھا

عجیب تھا دورِ آمرانہ
عجیب تھی طرزِ حاکمانہ
کہ دو _____ فقط دو ہی راستے
بے قصور، معصوم ملزموں کے لیے کھلے تھے

یہ راز سر بستہ راز ہی ہے کہ تیسرا در
وہیں، کہیں، آس پاس ہی تھا
جو اُن پہ کھولا نہیں گیا تھا
اُنھیں بتایا نہیں گیا تھا
کہ تیسرے در کے پار اُن کو
اُڑان بھرنے کا حق بھی ملتا
خود اختیاری عمل کا رشتہ
خوشی سے بھی استوار ہوتا

یہ راز سر بستہ راز ہی ہے
کہ تیسرا باب تھا، تو پھر کیوں
ٹیورِ باغِ جناں پہ کھولا نہیں گیا تھا؟



بلاوا

سفر کا بلاوا

جب آتا ہے رکتا نہیں ہے

میں سامان باندھے ہوئے گھر کے آنگن میں بیٹھا ہوا

منتظر ہوں

سماعت کے چُپ اور بے چین سبزے پہ

آ کر گرا

زرد ہوتا ہوا ایک خلوت نشیں سبز پتہ

بلا یا بھی تم نے تو کس موسمی رمز سے

کتنا دل کش ہے یہ استعارہ

اشارہ

بہت مہرباں ہے مرے ساتھ قاصد تمہارا



(۱)

تاریخ، خدا اور تنہائی

تاریخ جن راستوں سے گزرتی ہے
 ان پر انسانوں کے ساتھ ساتھ
 گھاس اور پھولوں کی پتیاں بھی پامال ہو جاتی ہیں
 تاریخ کے راستوں پر
 ہواؤں کے نقوشِ پاکون تلاش کرے گا؟
 عجائب گھروں میں
 مرنے والوں کے حنوط شدہ سر
 اور فاتحین کے کاسٹیوم رکھے جاتے ہیں
 روحیں اور خواب نہیں

تاریخ کے معرکوں میں
 خوابوں کی جیت ہوتی ہے نہ ہار
 یہ ٹوٹے، بکھرتے اور پھلتے رہتے ہیں
 اور قدیم پناہ گاہیں چھوڑ کر
 نوزائیدہ دلوں اور ذہنوں میں جاگزین ہو جاتے ہیں
 تاریخ کی غارت گری میں
 لفظ اپنے معانی بدل کر
 علامتوں، استعاروں، غیر مرئی پیکروں
 اور نظر نہ آنے والے منظروں میں
 کیونٹلاڑ ہو جاتے ہیں
 اور کبھی کبھی تو
 کاندوں اور حاشیوں سے باہر نکل کر

کائنات کی کسی دُور دراز نگ میں

مُحِ مطالعہ

خود فراموش خدا کی تنہائی میں گونجنے لگتے ہیں

یہاں تک کہ وہ تنگ آ کر

عظیم خاموشی کی کتاب بند کرتے ہوئے

تاریخ کا پیہر گھما دیتا ہے!

(۲)

ہم خود فریبی کا شہکار ہیں

محبتیں اور فلسفے کبھی قدیم اور جدید نہیں ہوتے

ہم بدل جاتے ہیں

ہماری محبتیں

فلموں کی طرح کامیاب یا فلاپ ہوتی ہیں

اور ہمارے فلسفے

ہمارے ساتھ ہی ہائبرنیٹ ہو جاتے ہیں

ہم جو خود فریبی کا شہکار ہیں

سمجھتے ہیں کہ امر ہو گئے ہیں

حالانکہ ہماری موت کا انتظار کیے بغیر

دوسرے ہماری جگہ لے لیتے ہیں

ہم وقت کا بگڑا ہوا چہرہ ہیں

جس پر غمازہ لگا لگا کر

میک اپ کی تہیں چڑھا چڑھا کر

ہم نہ نئی اداکاری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں

اور نادیدہ ہدایت کار کے اشارے پر

ناچنے لگتے ہیں

حتیٰ کہ سین کٹ یا اوکے ہوئے بغیر

ہماری زندگی کی فلم مکمل ہو جاتی ہے!

(۳)

آئن اسٹائن شاعر نہیں تھا

آئن اسٹائن کو معلوم تھا
کہ کائنات پھیلتی جا رہی ہے
اور انجام کار اپنے آپ میں سمٹ جائے گی
آخری چہ مراہٹ کے بعد۔۔۔
لیکن آئن اسٹائن شاعر نہیں تھا
اسے معلوم نہیں تھا
کہ دیواروں کے آر پار دیکھ لینے سے
زندگی اتنی عریاں ہو گئی ہے
کہ ہماری ہڈیوں کا پگھلا ہوا گودا بھی نظر آنے لگا ہے
اور زمان و مکاں کی ساری اداسی
ہمارے دلوں میں سے گزرتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے
اور ہمارے خواب فرشتوں پر عیاں ہو گئے ہیں
اور وہ حیران ہیں
کہ خوابوں کی دنیا میں انسان اتنا بے بس کیوں ہے
اور روشنی کی رفتار حاصل کر لینے کے باوجود
بھاگ کیوں نہیں سکتا!

(۴)

وقت کی بو طیقا

وقت کا اپنا کوئی وزن نہیں ہوتا
لیکن یہ جس کا ہو جائے اسے بھاری کر دیتا ہے
اور جس کا نہ ہو اسے بے وزن
وقت کی اپنی کوئی شکل بھی نہیں ہوتی

ہم ہی اس کا چہرہ ہیں
 ہم ہی آنکھیں
 اور ہم ہی اس کے پاؤں
 لیکن کبھی کبھی یہ ہم سے آگے نکل جاتا ہے
 یا ہم اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں
 متواتر اس کے ساتھ چلنا
 دُنیا کا مشکل ترین کام ہے

بعض لوگ وقت کو پیسے لگا لیتے ہیں یا پر
 اور ڈوڑنا یا اُڑنا شروع کر دیتے ہیں
 یہاں تک کہ وقت کی یا ان کی اپنی حد ختم ہو جاتی ہے
 وقت سدا دوڑ سکتا ہے نہ اُڑ سکتا ہے
 اسے بس چلتے رہنے کے موڈ میں رکھا گیا ہے
 اس کی اصل سائنس کیا ہے
 اسے کب چلنا ہے
 اور کب رُک کر کسی عظیم دائمی ٹھہراؤ کا حصہ بن جانا ہے
 یہ کوئی نہیں جانتا!



ساری ماؤں کے نام

ماں!

مجھے آج گاؤں کا دن چاہیے
عید کا دوڑتا بھاگتا، کھلکھلاتا ہوا دن!
مجھے تھالیاں بیٹھے دن کی محبت سے بھر دے
محلے کی سب ماؤں کو جا کے دوں گا
مبارک کے پھولوں،
دعاؤں کی کلیوں بھری سینیاں لے کے جاؤں گا
عیدی کی خوشیوں سے جیبیں بھرے
اُن کے بوسوں کی برسات میں بھیگتا آؤں گا

دیکھ ماں!

کاج کی چوڑیاں خالہ صغریٰ نے بھیجی ہیں
سدرہ کی امی نے لڈو،
گزرک اور مہندی بھی دی، تمھارے لیے
نانی صفیہ بہت خوش تھیں
اُن کو خدا نے نواسہ دیا ہے
ابھی تین دن کا ہے
لیکن وہ کہتی تھیں:
”مڑکا مہینے سے اوپر کا لگتا ہے
امی سے کہنا دُعا بھی کریں
اور بہت خوب صورت، کوئی نام بھی اس کا رکھ دیں“
صبا آٹئی عمرے سے آئی ہیں

مکے مدینے کی میٹھی کھجوریں بھی لائی ہیں
جنت کی ویسی ہی خوشبو
مجھے اُن کے کپڑوں سے آتی تھی
جیسے ترے پاؤں چومتے وقت آتی ہے

ماں!

تو کہاں ہے؟

بتاتی نہیں کیوں؟

میں ابو سے کیسے شکایت کروں

آج تو اُن کی برسی منانے کا دن ہے!



موت کا لمس

گھٹن سینے کی بڑھتی جارہی ہے
 پس دیوار اک بوڑھا پڑوسی کھانتا ہے
 میں اس کے کھانسنے سے (مسلل کھانسنے سے) تھک گیا ہوں
 بدن نیندوں سے بوجھل ہو رہا ہے
 (مگر بے خواب آنکھوں میں اداسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے)
 درو دیوار پر جھڑتے، اکھڑتے رنگ و روغن نے کئی شکلیں بنائی ہیں
 بہت سے جانے پہچانے، مرے، بچھڑے ہیولے ہوئے ہوئے
 مرے اطراف جمع ہو رہے ہیں
 بدن بستر سے چپکا ہے
 میں سینہ تھپتھپاتا ہوں مگر کھانسی گلے میں رُک گئی ہے
 گھٹن سینے میں بڑھتی جارہی ہے
 میں پورے زور سے کروٹ بدلنے کی تگ و دو میں
 بدن سے دُور وور جا کر گر گیا ہوں
 میں آنکھیں مل کے خود کو دیکھتا ہوں
 ارے----- میں تو وہاں پر سامنے بستر پہ کتنا پُرسکوں سویا پڑا ہوں
 مرے سینے میں کوئی کھانتا ہے
 مگر آواز بستر سے نہیں۔۔۔ دیوار کے اُس پار میں لیٹے پڑوسی کے گلے سے آرہی ہے
 گھٹن کم ہو گئی ہے
 میں آدھی نیند پوری کر چکا ہوں
 اب اُس کا کھانسنہ بھی مجھ کو اچھا لگ رہا ہے

(۱)

بیل ذبح ہو گیا

ٹھٹ کے ٹھٹ چرنے نکلے میدان کے اندر
 غٹ پٹ ہو گیا آپس میں دو بیلوں کا میل
 اک بیل نے گھاس کی چوبی ناند سے بھوک مٹائی
 دوسرے بیل کو مہنگا پڑ گیا اپنا کھیل لڑائی
 مایا جال میں لے آیا آخر دھن مایا
 مالک بازار میں اُس کو چکاتے لے آیا

بازار تو پھر بازار ہے جس میں گھاڑ بیل کی چال
 بے اوسان ہجوم کا گھممس گھممس گھمسان
 بے چارہ بیل انسانوں کے گھن چکر میں چکرایا
 صبح سویرے اُس کو چیت فرش پہ جب لٹوایا
 تب دریا کے مانجھی کی اک بات اُسے یاد آئی

”انسانوں کی مائی کو تم بوڑھے سموں سے کھودنا
 کیچڑ سے لتھڑے پھران میں ہیں مدفون
 اکیچھ کی پھوک سے زیادہ ان کا مان دھان نہیں
 ان کا کھولن، جوش، اُبال _____ اور سب مال
 زنگ ز میں سنسار میں بتنا صرف اک بنجوگ
 نفرت کے تانبے اور پیتل کے برتنوں میں
 گھر گھر رکھا ہوا
 رسموں کے ماتھوں پہ محبت کا سیندور“

پھر بازار کے بیچ میں صبح سویرے
 نیل کی رسی کھلتی سب لوگوں نے دیکھی
 دیکھتے دیکھتے کھال کی کترن کٹ کے
 دھڑلیوں میں گوشت کو چانپ چانپ بکھیر گئی
 اور دیکھتے دیکھتے خلق خدا
 سب ران گوڑ کو چتون چتون چاٹ گئی

(۲)

چھڑاں والی مسجد کی گلی

ہم اکثر ترے ساتھ گھر سے نکلتے
 قدم سے قدم جوڑ کر چلتے چلتے
 وہیں آ کے رکتے
 جہاں سخت گرمی میں نکلے کا پانی
 کشادہ کئے بازوؤں سے ہمیں پاس آنے کو کہتا
 اسی آبِ تشنہ کے اس طرف دنیا کٹوروں سے پانی کی فیاضی سے بہرہ ور
 ہم سے نظریں ملاتی
 دوسری سمت _____
 (اس آبِ تسکین کی دوسری سمت _____)
 اک گلی ہے
 جو کھوئے ہوئے، گم زمانوں کے معروف لوگوں کا
 مسکن ہے
 (مسکن کہ جو آخر کار سب کا ٹھکانہ ہے اور
 جس سے کوئی نہیں بھاگ سکتا)

اس گلی کا دہانہ تو تاریک زینہ ہے
جس پر فقط پاؤں دھرنے کی 'مہلت' کے بعد آپ ہی آپ
تاریکیوں کے سمندر کے پتو اکھل جاتے ہیں

ہم اکثر ترے ساتھ اس گھر کا مہماں بنے
یہ گھر جس کا اب میزباں تو ہے
جب بھی ترے ساتھ گھر سے نکلتے
اسی آبِ اول کی سرحد سے
ہم آبِ آخر کو جاتی گلی سے گزرتے
اس گلی سے گزرتے جو وقت اور لا وقت کے درمیاں اک
خطِ حاشیہ ہے

مجھے تب خبر ہو سکی جب زمانہ مرے اس طرف
اور تو وقت کے اُس طرف رہ گیا
تجھ کو اک لحد کے ثود میں جا کے چلہ کشی کی ریاضت پسند آگئی
مسجدِ چھپڑاں والی گلی میں اذناں دے رہی ہے
سجدہ کرنے کو مسجد کا صحن آسماں کی طرف کھل گیا ہے
کوئی اس گلی کی طرف جا رہا ہے
مگر اُس طرف سے کوئی اس طرف آبِ تشنہ کا طالب نہیں
مسجدِ چھپڑاں والی میں کوئی وضو کر رہا ہے
کوئی سخت گرمی میں نلکے کا پانی لیے جا رہا ہے
آبِ اول سے سب آبِ آخر کی جانب رواں ہیں



ہم ہار جائیں گے

ہمیں معلوم ہے ہم ہار جائیں گے
 شیوہ کی کالکوں سے
 تیرگی کے نعرہ زن اُن وحشیوں سے
 جن کی گردن میں گسے ہیں طوقِ فتنوں کے
 زبائیں ہیں، تو سب گروی پڑی ہیں منبروں کے پایوں میں
 جو اپنے لفظوں کی سماعت خود نہیں سنتے

ہمیں معلوم ہے سب کچھ
 ہماری جیت میں رخنے ہیں
 اُن احباب کی خاموشیوں کے رخنے ہیں
 جن کے دلوں کی روشنی بھی تالوؤں کے قفل میں جکڑی
 یہی تو ہیں

لہو کی آبشاروں سے سُہانی لوریوں کے راگ سنتے ہیں
 جنہیں چائے کی ٹیبل اور دھوئیں کی باس نے دانش نوازی کی
 ہماری جیت میں اُس دانشِ فتنہ کے رخنے ہیں
 ہمیں معلوم ہے ہم ہار جائیں گے
 اُنھی بے رحم کالے بھیڑیوں کے غول سے
 جن کے تراشے ناخنوں کو خود ہمارے پاسبانوں نے لہو کا رزق بخشا ہے
 ہمیں معلوم ہے



بیسویں صدی کے اواخر کی پاکستانی اردو غزل اور اجتماعی حسیات

مشرقی اصنافِ شعر میں شاید ہی کوئی دوسری صنف ایسی ہو جسے غزل کی طرح بیک وقت عوام میں محبوبیت اور خواص میں مقبولیت نصیب رہی ہو۔ صنفِ غزل کے یہ دو امتیازی کمالات بھی غزل کے Charisma کا محض ایک یک سطحی سا تعارف ہی کرا پاتے ہیں ورنہ نہ کہتے ہوئے بھی کہہ جانے کا عمل، اختصار و ایجاز سے بڑی بڑی باتیں سمجھا جانے کی توفیق، حسن کاری کا لفظی و معنوی قرینہ، استحسانِ حیات، جہاں دوستی اور ذاتی محبت دونوں کی ہمراہی میں رہ حیات کو طے کرنے کا شعور یہ سب سمجھاؤ اگر کسی ایک صنف سے متعلق ہیں تو وہ صرف غزل ہے۔

غزل نے اسلامی فتوحات کے بعد کے ایران میں جنم لیا۔ عربی قصیدہ کی تشبیب سے پھوٹ نکلنے والی یہ بہار آفریں صنف ایران سے ہندوپاک اور افغانستان تک پہنچی مگر اس کا سحر سارے مشرق و مغرب پر محیط ہوا۔ جرمن شاعر گوٹے ایرانی غزل کو حافظ کے تتبع میں ”دیوانِ مغربی“ تشکیل دیتا رہا۔ ادھر انیسویں صدی سے اب تک مغربی مترجمین نے مغرب کی کتنی ہی زبانوں کو غزل کا مزاج آشنا کر دیا۔ اس سے دُور پہلے عرب ہسپانوی ثقافت کے زیر اثر آنے والے علاقوں اٹلی، سسلی تک میں غزلیہ اسلوب کی حامل اصنافِ شعری نے صدیوں پہلے جنم لے لیا تھا۔ اُن علاقوں میں رائج صنف شعر ”ZAJL“ کی متغزلانہ صفات مشرقی یورپ تک پھیلتی ہیں۔ برصغیر میں غزل نے خوب خوب مقبولیت پائی مگر اس پر ایک پیغمبری وقت بھی پڑا۔ وہ وقت جب بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے ربع میں مغربی اصولِ تنقید سے آشنا اہل وطن اس کی ”ریزہ خیالی“ اور اشاراتی اسلوب کے نکتہ چین ہوئے تھے۔ کلیم الدین احمد وغیرہ کے اٹھائے ہوئے سوالات اپنی جگہ نیک نیتی سے خالی نہ ہوں گے تاہم یک رخ اور اتہا پسند ضرور تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز کی دہائیاں عموماً مشرق کے جوہر کی نمود کا عہد نہ تھیں۔ ۱۹۴۷ء تک یہ سوال موجود رہا ہے کہ آیا یہ ”قافیہ پیمائی“ اور غزل آزمائی آتے دنوں کا ساتھ بھی دے سکے گی کہ نہیں؟ تب ناصر کاظمی کی زبان سے یہی جواب دلوا یا جاسکتا تھا کہ:

ع یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

یہ تو پاکستان کے استقلال و استحکام کے بعد آج کہیں جا کر کھلتا ہے کہ سارے برصغیر کے اندر غزل کا چلن اور تغزل کا استمرار پاکستان کے مزاج سے غزل کی مناسبت اور پاکستانیوں کے شغفِ تغزل سے مربوط ہے۔ کسی ملک کے وجود سے اصنافِ شعری کی زندگی یا موت کا کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا مگر غزل کو ملنے والا نیا اعتماد پاکستان ہی کی تہذیبی عطا ہے کہ غزل جس تہذیبی مزاج سے مستعار ہے، پاکستان اسی مزاج کی مدنیت کا استعارہ تھا۔ ان راہوں پر چاہے یہ ملک ایک قدم بھی نہ چلا ہو مگر اتنا تو طے تھا کہ مسلم مدنیت اور اسلامی پہچان کے حوالے سے اپنی شناخت کرنے کے عمل کو یہاں روکا نہیں جاسکتا تھا۔ سو یہاں ایسے اجتماعی خوابوں پر قدغن نہ لگی۔

آزادی کے حصول کے زمانے میں جو ادیب اور شاعر پیش قدمی کرنے سے قاصر رہے تھے، آزادی کے حصول کے بعد وہ لوگ اپنے سیاسی رفقا سے کہیں آگے چلے۔ بعض اوقات مسلمان کے اس خواب میں دوسرے اہل وطن کا اشتراک بھی ظاہر ہوا۔ یہی خواب شعر کے پاکستانی مزاج کا خالق ہوا مگر یہ کوئی آسان سفر نہ تھا۔

غزل جس نے قیام پاکستان سے سہارا لیا تھا۔ اس کے رستے کی ایک بڑی اوگھٹ گھاٹی سے لسانی تشکیل کا مرحلہ تھا۔ غزل جو ایک مخصوص تہذیبی نمکسال کا ڈھلا ہوا سکہ ہے، نمکسال سے باہر لفظیات کی بھی متحمل نہیں تھی۔ اگر نئی مصدر سازی کرنی ہے تو اس کی معیار بندی تک کا عہد گویا غزل بندی کا عہد ہوگا مگر لسانی تشکیلات کا مرحلہ قاری کے ذوق کے معیار نے خود طے کر دیا۔ تشکیلات کے تجارب دھرے رہ گئے مگر غزل بچ نکلی۔ غزل اپنی تہذیبی معیاریت کے ناتے اظہار کے انہی پیکروں پر حصر کرتی ہے جو عام سطح تک ابلاغ بھی کریں۔ تشکیلات کے ریلے کے اثرات کے ساتھ ہی غزل نے اپنے ماحول، اپنے لوگوں اور اپنی ملکی زبانوں کی لفظیات اور اپنے ملک کے روزمرہ کی زندگی کو زیادہ اعتماد سے بیان میں لانا چاہا۔ اپنے ماحول، اپنے مسائل اور اپنے خیالات و محسوسات کی باز آفرینی کا سلسلہ اقبال کے اسلوب فن سے جاڑتا ہے۔ ہر چند کہ لفظیات و موضوعات اس کے بعد آنے والوں کے اپنے اپنے اور جدا جدا تھے۔ نئی غزل اسی پس منظر سے ابھرتی ہے۔ اس کے لہجے میں ناصر کاظمی کا لہجہ بھی ہے اور شکیب جلالی کے اسلوب کے دُور رس اثرات بھی۔ غزل اپنے ماحول، اپنے موجوداتی روزمرہ اور اپنے ذہنی و جذباتی آفاق کو اہمیت دیتی ہے۔ نئے عہد تک آتے آتے غزل جہاں اس خوف سے رہائی پالیتی ہے جو استعارے کے سلسلہ میں حالی کو لاحق رہا ہے وہاں حالی ہی کے خواب کی تعبیر بھی سامنے لاتی ہے کہ اس عہد کی غزل نے چبائے، ہوئے نوالہ کو چبانے سے کھل کر انکار کر دیا اور اپنی واردات کو سامنے لانے کی سعی کی، اپنے مسائل کو فنی اظہار بخشا۔ اپنا پن اس قدر کہ تکنیکی سطح پر تشبیہ و استعارہ کا اپنا ہی نظام وضع کیا۔ سوئے غزل گواپنے ہاں سے نئے ردیف و توانی اور تازہ و نادر اوزان کے تجربے کرنے میں بھی بہت نمایاں ہوئے ہیں۔ یہ غزل گویا شبہ مشق کی اس بھٹی سے نہیں گزرے جس میں سے مصرع طرح پر طبع آزمائی کرنے والے گزر گزر کے پختہ مشق ہوتے رہتے تھے، خود کلاسیکی ادب کے مطالعہ کے سلسلہ میں ان کے ہاں شدید محرومیاں سامنے آئیں گی، فنی اصلاح اور شاعری میں شاگردی کا ادارہ اپنی جگہ دم توڑ چکا ہے تاہم ان شعرا کے ہاں تجربے کو ذاتی حوالہ کے طور پر محسوس کر کے اجتماعی اظہار دینے کی جو روش قائم ہوتی ہے وہ ایک طرف انھیں روایت سے جوڑے رکھتی ہے تو دوسری جانب اسی تازہ گوئی نے تغزل میں بھی رنگ آفرینی کی ہے۔ سو جہاں کہیں نئی غزل دقیق مشاہدے یا بڑے سوال کا بوجھ اٹھانے پر قادر ہو سکی ہے، شعری لطف بھی کئی کئی گنا بڑھ گیا ہے۔

غزل کا تہذیبی مزاج جانچے بنا بعض حضرات نے اسے ایک صنف محض کے طور پر اظہاری تجربات کا موضوع بنانے کی ناکام کوشش کی۔ جس طرح ہم روایتی نظم سے نظم معریٰ اور نظم آزاد تک پہنچے اسی طرح غزل کو آزاد غزل تک جا پہنچانے کی سعی بھی کی گئی۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا کہ غزل سب دیگر اصناف سے بڑھ کر ہیئت پسند صنف ہے۔ اس عہد میں بھی ایسے رائیگان تجارب ہوتے

رہے مگر مظہر امام کی آزاد غزل پاکستان میں کیا چلتی!! غزل جس کی ہیئت میں عہد قدیم کا مستزاد والا تجربہ نہیں چلا، اس نے شان الحق حقی کی غزل نما اور صلاح الدین محمود کی جڑواں غزلوں کے تجارت بھی بڑی سہولت سے رد کر دیے۔ اظہار ہی کے ناتے غزل نے مخلوط القوانی غزلوں کا تجربہ بھی برداشت کیا ہے مگر یہ بھی غزل کا چلن نہیں بنا۔ غیر مردف غزل والا تجربہ اظہاری حوالے سے واحد کامیاب تجربہ ہے جو قدیم سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ ہاں استعارہ و علامت کی قدیم روش اس عہد میں خوب خوب چلی۔

پاکستان کے حکومتی معاملات میں انگریزی کے تسلسل کے باوجود اردو زبان عوامی سطح پر اجتماعی وسیلہ اظہار بھی رہی اور اجتماعیت کی ایک اہم شناخت بھی۔ لسانی تشکیلات کی مصدر سازی کی بیل تو منڈھے نہ چڑھی مگر ۱۹۶۵ء کے زمانے ہی کے لگ بھگ اس ملک کی اجتماعیت نے اردو میں نئے زور سے نفوذ کیا۔ بین الصوبائی تراجم، پاکستانی زبانوں کی کلاسیک کی بازیافت، قدیم تہذیبی شناختوں کی تکریم، صوفیہ کے لحن کا قبول عام، یہ سب رویے مل جل کر چلے۔ سرکاری سطح پر پاکستانی زبانوں کی لغتیں اور فہارس مترادفات جو طبع ہوئیں ان سے کہیں بڑھ کر عوام کے اپنے بے ساختہ اظہار نے ایک سے دوسری زبان کے الفاظ و تصورات کی خوشہ چینی سے اردو کو ثروت مند بھی کیا اور ایسی زبان بھی بنایا کہ جو اب قلعہ معلیٰ کی زبان نہ تھی بلکہ جس کے لہجے میں عوام کی مادری زبانوں کا فطری رس بولتا تھا۔

تعلیم کے نصابوں سے فارسی کے فاصلے بڑھے تو قاری اور شاعر ہر دو کے لیے ابلاغ کے مسائل ابھرے۔ اردو زبان قبل ازیں فارسی مرکبات لفظی سے بھری پڑی تھی۔ لفظ تو ایک طرف خود محاورات تک فارسی کے تراجم سے بنتے تھے۔ اردو فارسی کی اپنی مشابہتوں پر بھنا کر ہی تو نیشنلسٹ ہندو نے اپنا سفر آزادی لسانی دوئی سے آغاز کیا تھا مگر ہماری بعد کی زبان خود فارسی سے بہت دور ہو گئی۔ فارسی شناسی کے گھٹنے کی وجہ سے زبان کی نکسال کو بھی مجبوراً قبول عوام پر مہر لگانا پڑی مگر روایتی فارسی اظہار سے اردو شعر کا جو اشتراک تھا اس کے لیے یہ transition آسان نہ تھا۔ قاری اور شاعر کے درمیان ابلاغ کے فاصلے کے پیچھے صرف یہ کوتاہ دہی موجود تھی جسے اردو کے نظم نگاروں نے اپنی نشاۃ ثانیہ کا لمحہ جانا اور قاری سے فاصلے پر اصرار کیا؛ یوں ابلاغ کی ذمہ داری سے سبکدوشی کا اعلان کر کے ایک فرضی بحران کو جنم دے دیا۔ اس زمانے میں مغربی اظہاری تجربات سے لے کر مغربی حسیات کی پیروی تک کے رویوں نے نظم کے قاری کو شاعر سے جدا کر دیا تھا مگر غزل کے میدان میں ایسا عمل تب بھی نہیں ہوا۔ فارسی نا آشنائی کے باعث فک اضافت کی روش بہت سے شاعروں کے لیے سہولت کا باعث بنی۔ تاہم فک اضافت انھی کے ہاتھوں بھلی لگی جو فارسی مرکب سازی سے بھی معذور نہ تھے۔ ۷۰ء کی نظموں میں اگر ”فنون“ میں چھپنے والی ہماری نظموں میں یہ چیز ملتی ہے تو غزل میں ۶۰ء کی دہائی میں ظفر اقبال کے ہاں اس کے عمدہ نمونے مل جائیں گے اور ظفر اقبال سے پہلے اساتذہ کے ہاں۔۔۔ مگر ۸۰ء کے بعد مرکبات فارسی سے آزادی ہماری غزل کی پہچان بنتی ہے۔

سادہ اظہاری قرینوں کی حسن کاری شکیب کے عہد سے موقع بہ موقعہ جلوہ دکھا رہی تھی۔ اپنے مسائل، اپنا ماحول، اپنے تجارب و واردات، عام محسوسات، عام بول چال کی زبان میں ادا ہونے لگے۔ یہیں کہیں جدید اردو غزل نے اپنا وجود پایا۔ پہلے بیان ہوا کہ اقبال کا اثر اپنے مسائل کو اپنے نقطہ نگاہ سے دیکھنے، بیان کرنے میں ہر نئے شاعر پر غیر محسوس طور پر دیکھا گیا گو وادصف علی وادصف

سیف زلفی، سلیم شہزاد اور بھارت کے شاعر جو ہر سعیدی ایسے شعرا کے ہاں کئی بار اقبال کی لہجہ کی بازگشت کی جھلک بھی مل جاتی ہے مگر لہجے سب کے اپنے اپنے ہی بنے۔ اقبال کا معنوی اثر عبدالعزیز خالد سے صلاح الدین محمود تک دیکھا جاسکتا ہے۔ دوسرا اثر میر کا ہے جو ناصر کاظمی کے عہد ہی سے نمایاں ہو گیا تھا۔ یہ روش شان الحق حقی، ابن انشا بلکہ فرید جاوید تک کہیں کہیں جھلکتی ہے۔ تاہم غالب وہ بڑا شاعر ہے جس نے مزاجی سطح پر آج کے شاعر سے یک جائی اور ہم رنگی کا احساس دلایا ہے۔ اس امتزاج کی تشکیل فطرتاً ہوئی مگر آج کے ادبی مزاج کی صورت گری میں حلقہٴ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے امتزاج نے بڑا کام کیا ہے۔ آج حلقہٴ ارباب ذوق خود ترقی پسند ہے اور ترقی پسندی مارکسزم اور انقلاب سے مشروط نہیں رہ گئی۔

تنقید کی روایت میں اپنے وقت میں احتشام حسین اور آل احمد سرور نے ہماری اجتماعیت کی روایات کے لیے کچھ گنجائش ضرور فراہم کر رکھی تھیں۔ گو یہ روایات اس حد تک نہیں جاسکتی تھیں جہاں مثال کے طور پر آج صفر میر ہمیں لے جاتے ہیں۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے تو حالیہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے بعد کہیں جا کر اقبال کو قبول کیا ہے۔ ”ادب اور زندگی“ میں اختر حسین رائے پوری نے جسے کہیں نہیں قبول کیا تھا۔ سچا چوف نے بھی اس کا NOTICE لیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری کے تصور میں قومی شناختیں تو خالدہ ادیب خانم کی توضیحات سے محکم ہوئیں۔ اقبال کی شاعری سے وہ سمجھے نہ لیکچرز سے۔ ”گر دسفر“ ان کے ہاں بعد میں ابھرنے والی ذہنی ہم رنگی کی عمدہ گواہی دیتی ہے۔

ترقی پسند تحریک، تحریک پاکستان کی کامیابی کے بعد ہی دم توڑنے لگی تھی۔ روایتی طور پر ہمارے سکہ بند ترقی پسند مذہبی بنیاد پر بنی قومیت ہی کو ناقابل تصور یقین گردانتے تھے۔ جنہوں نے پاکستان کے تصور کا ساتھ دیا تھا، ترقی پسندوں نے من حیث المجموع ان کی داد نہ دی تھی۔ روایتی نظریہ سازوں نے مذہبیت کو منفیت سے تعبیر کر رکھا تھا۔ عالمی ترقی پسند تحریک بعض اعلیٰ انسانی اقدار سے عبارت تھی جیسے مارکسزم، لینن ازم کی طرف سے حکومتی محدودیتوں کا تابع کر رکھنا یوں بھی ایک منفی عمل تھا دوسری بات جو ہمارے ترقی پسند لوگوں کے سوچنے کی تھی وہ قومی ملی حوالوں کی ترقی پسندانہ تعبیر کا عمل تھا جسے درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ نئے ملک کے اور مسلمانوں کی قوم کے بہت سے رشتے انقلاب آفرین تھے مگر قومی ترقی پسند رویہ متعین کرنے کا جتن ہی نہ کیا گیا۔

ترقی پسند حوالوں سے جن قوتوں نے پاکستان کا اثبات نہ کیا انہوں نے پاکستانی زبانوں، مقامی کلچر اور علاقائی شناختوں پر اصرار ضرور کیا۔ مرکزی طور پر پاکستان کی ترقی پسند تحریک کو سید سجاد ظہیر اور آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی نگرانی کے تابع سمجھنے والوں نے ترقی پسندی کو یہاں کی زمین میں جڑ نہ پکڑنے دی یوں یہ تحریک قومی دھارے میں شامل نہ ہو سکی۔

مسلمان مزاج چونکہ فطرتاً جہاں دوست اور وسیع المشر ب ہے اس لیے ہمارا ادب ترقی پسند اقدار سے ہمقدم ہو کر بھی چلا ہے۔ حیات کی معنویت پر ہمارا ایمان تعقل، فطرت پسندی اور عظمتِ آدم پر یقین ایسے مثبت رویے ہیں جو ہمارے مزاج کو ایک مخصوص اثبات بخشتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اسلام میں موجود اس ترقی پسندی کی دریافت ہی نہ کی گئی سو، ترقی پسندوں نے قومی ملی حیات کو

خود مذہبی حلقوں کے سپرد کر دیا۔ ترقی پسند لہر سے علیحدہ شناخت پانے والوں میں مجید امجد، شہزاد احمد، احمد مشتاق، منیر نیازی اور ظفر اقبال ابھرے۔ ناصر کاظمی اور باقی صدیقی اسی حوالے کے نمایاں نام ہیں۔

ہمارے ہاں ترقی پسندی نصف صدی بعد بھی ۳۶ء والے موقف سے آزاد نہ ہو سکی۔ اس عہد میں بھی ترقی پسند نظریہ سازوں نے مذہب، ثقافت اور زبان کے حوالے سے اجتماعی اور عوامی رائے کو اہمیت کے قابل نہ جانا کہ کہیں اسلام، پاکستانیت اور اردو کا نام نہ لینا پڑ جائے۔ عالمی سطح پر تو بقول وہاب اشرفی آج ذہن کے تعصبات سے پاک ہونے کا نام ہی ترقی پسندی ہے۔ آج کا ترقی پسند پوری زندگی کو ایک وحدت مان کر ادب کو اس کی فکری جمالیاتی تہہ داریوں کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ سو قومی حوالوں سے جو ترقی پسند اصحاب نظر سامنے آئیں گے ان میں اختر حسین رائے پوری، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر ممتاز حسین، صفدر میر، محمد علی صدیقی، جمیل ملک اور، فتح محمد ملک کے نام آئیں گے۔ ۱۹۷۰ء کا عہد بہت بڑے بڑے مسائل لے کر آیا اور از خود بڑے بڑے فیصلے کر گیا۔ مدت کے بعد انتخابی عمل کے وسیلے سے جمہوری حکومتوں کا ظہور ممکن ہوا مگر جمہوری فیصلے نہ ہو سکے۔ سو ملک دولخت ہو گیا۔ اس زمانے کی شاعری حیرت انگیز طور پر شکست و ریخت، انتشار، کھراؤ اور انہدام کے استعارے کثرت سے لاتی ہے۔ ادب اس انتشار کا اشاریہ بن گیا تھا جو ہمارے دروازے سے گزر کر ہمارے اندرون میں جا گزریں ہو چکا تھا۔ ریاض مجید، جمیل عالی اور عدیم ہاشمی کے ہاں اس شکست کے ناتے سے بہت سے استعارے اور علامت ظاہر ہوئے۔ ثروت حسین، صابر ظفر، غلام حسین ساجد اور محمد خالد ایک خاص حوالے سے ۱۹۷۰ء کے بعد ہی سامنے آئے۔

جن زمانوں میں عوام کے محسوسات کے واسطے اظہار کے راستے کھلے رہیں وہ زمانے انواہ سازی، شکوک اور باہمی فاصلوں کے عہد بن جاتے ہیں۔ عہد جبر کی پاکستانی شاعری کا احوال بھی یہی ہوا اور پاکستانی معاشرے پر بھی یہی بیتی۔ شہزاد منظر کے خیال کے مطابق ہمارے حالات کے تناظر میں لبرل ازم اور جمہوریت پسندی ہی ہماری ترقی پسندی ہے مگر اس میں بھی لبرل ازم اپنی جگہ مشکوک ہے۔ ترقی پسندی تو حیات کو با معنی اور با مقصد گردانتی ہے جب کہ ہمارے حوالوں سے لبرل ازم کے پرچارک عموماً مذہب سے ڈرے ہوئے لوگ تھے۔ ہمیں تو حقیقت میں اپنی ترقی پسندی کی بنیادیں بھی ابھی طے کرنی ہیں، ہمارے ہاں لبرل ازم ترقی پسندی کیسے ہو سکتی ہے؟

۱۹۷۷ء کے انتخابات پر سیاسی حوالے سے شکوک کا جو سایہ رہا اس کے زیر اثر چلنے والی تحریک کے نشیب و فراز کو بھی ادب نے محفوظ کیا اور اس پر اہل فن کے تبصرے بھی جمع کیے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک کے ادب میں ۱۹۷۷ء کی سیاسی حکومت کی برطرفی کے اثرات و عواقب بھی سامنے آئے اور نتائج بھی۔ احتجاج و مقاومت نے شاعری میں بھی راہ پائی۔ مگر اس عہد کے رسائل و جرائد سے اس اختلافی لہر کی تصویر اس لیے نہیں بنی کہ یہ ادب تلخ اور ناقابلِ تحریر بھی تھا اور حکومتی پالیسیوں کے تناظر میں اسے چھاپنے کے خطرات بھی برداشت نہیں کیے جاسکتے تھے۔ یہ ادب محدود حلقوں میں چھپا اور پھیلا۔ تاہم عام ادب میں بھی ہمارا غزل گوزنداں، احتساب، تعزیز کے سماجی استعاروں کے نئی معنی ترتیب دے رہا تھا۔ اس شاعری کا عمومی لہجہ بھٹو دوستی کا لہجہ تھا۔ آفتاب اقبال شمیم جیسے فنکاروں نے اس

احتجاج کو لطیف لہجہ دے کر عمدہ شاعری بھی بنایا ہے بعینہ جیسے نظم میں اختر حسین جعفری نے کیا۔ بہت سے لکھنے والوں نے اس حوالے سے قلم اٹھایا۔ ”مرگ یوسف کی خبر“ نے ایک طرف اگر ڈاکٹر محمد افضل کو شاعر بنادیا تو دوسری طرف فارغ بخاری کے اندر کے شاعر کو منہاج شعر ہی دوسرا دے دیا۔ احمد فراز، منظور عارف، محسن احسان، علی حیدر، ستار سید اور صفدر سلیم سیال کی بعض نفیس تخلیقات اس حوالے سے سنی گئیں۔ انور سدید کے خیال میں ۱۹۸۰ء سے ”غزل صحن گلشن سے نکل کر اب کو لتار کی سڑک پر آ گئی ہے“ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عہد کی غزل فطرت کی طرف مراجعت بھی کر رہی ہے اور ایک مذہبی رویہ غزل کے مزاج سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اب شاعر شکست ذات کے بجائے رد عمل کے اظہار کو راہ دے رہا ہے۔ تلخ حقائق کو قبول نہ کر سیکھ گیا ہے۔ وطن کے حوالے سے تلخ حقائق کے ادراک نے ہی شاعر کو وطن دوستی کے لازوال رشتہ سے زیادہ مضبوطی سے باندھا ہے ادھر ملکی ثقافت نے بھی شعر میں ظہور کیا۔ فنی طور پر استعارہ کا چلن بھی بڑھا اور اظہار نے نئی نئی راہیں بھی دریافت کیں۔ ہمارے خیال میں اس عہد کی شاعری حقیقت کی جستجو کا سفر ہے اور حقیقت پسندی غالب رویہ ہے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اعصاب شکن تنقیدی کے خاتمہ پر بھی اجتماعی ہیئت احوال، ملکی رویوں اور مستقبل کی سیاسی پالیسیوں کے ناتے سے سوالات کا ایک سلسلہ تھا۔ جس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ الجھاؤ اور حیرت کے حوالے سے کئی برس تک ہماری غزل بھی استفہامیہ ردیفوں پر حصر کرتی رہی:

ع سوچتا رہتا ہوں دن رات یہاں کیا کیا ہے (سرور کا مران)
ع ہوئے زخمہ زن سے ربط، کھلتے پھول کا کیا ہے؟ (توصیف تبسم)

اور

حدودِ عمر یہ پھیلی یہ کیا مسافت ہے

اس امتحان سفر کے نصاب میں کیا ہے (ذوالفقار تابش)

اس عہد کی غزل میں نظم کا سا بہاؤ اور یکسانی بھی دیکھنے کو ملے گی؛ ایسی یکسانی جس میں شاید غزل کا مرکزی مزاج تو ابھر کر سامنے آ جائے مگر غزل والا شعر جس میں نکھر کر چمکتا دکھائی نہ دے۔ شعر کے مصرع ثانی والے قافیہ ردیف کے جبر نے بھی ایک بے معنی تسلسل کو جنم دیا ہے سو عمومی سطح کا ہنر اظہار کی میکا نیکیت اور تکرار سے نہیں بچ سکا۔ تاہم ہمارے شعرا نے بحیثیت مجموعی غزل کہنے میں بڑی چابکدستی کا بھی ثبوت دیا ہے اور غزل سے اپنے مزاج کی فطری رغبت بھی ثابت کی ہے۔

مشاہدہ سے عموماً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اچھا مطلع ہمیشہ اچھی غزل کا ضامن ہوا ہے نئے شاعر نے جاندار مطلع کہنے کی خاص طور پر سعی کی ہے۔ اپنے ارد گرد اور ماحول کی بات کرتے ہوئے آج کی غزل عمومیت کے بجائے انفرادیت اور آفاقیت کے بجائے حقیقتِ موجود کو سامنے رکھتی رہی ہے سو مقامیت کا در آنا طے ہے:

سناہے بارشیں برسی ہیں پچھلے سال بہت
نہ جانے گاؤں میں اب میرا گھر بھی ہو کہ نہ ہو

یہ عمل بسا اوقات نظم کی طرح تفصیل بھی فراہم کرنے لگتا ہے:

ہوئی تھی دیوارِ قصر حد سے بلند کیسی
کسی نے کنگرے پہ بڑھ کے پھینکی کمند کیسی

وارداتِ قلبی سے چلتے ہوئے اب واقعات ذاتی تک غزل کے شعر کی جولاں گاہ ہے کہ شاعر کے وہ بھی تو ذاتی تجارب ہیں:

بیوی سے روز روز کے جھگڑوں سے آخرش
لوگوں کو اس کاریل کی پڑی پہ سر ملا
مجبوریوں نے مجھ کو بھی رکھا خوشی سے دور
چھٹی کے روز بھی نہ میں بچوں کو گھر ملا

مگر ہوا یہ کہ اب شاعری روازنہ کی routine کی عکاس بن کر رہ گئی۔ معنی کی وہ دوسری جہت جسے ہر عہد اپنی توفیق کے مطابق دریافت کیا کرتا تھا ایسی شاعری کے لیے ناممکنات کی دنیا ہو کر رہ گئی۔ روزمرہ کی بات کرنے کی تازہ روش توازن کی اور بھی شدید مشکلات لیے ہوئی تھی:

گرمیوں کی دوپہر کا ذکر تھا
ہم تھے گھر میں اور گھر تھا دھوپ میں (ریس فروغ)
اک جھیل کے کنارے پرندوں کے درمیاں
سورج کو ہوتے دیکھا تھا تحلیل آب میں (فاطمہ حسن)
دور ہوتے جارہے تھے ساحلوں پر دو چراغ
بادبان نے رکھ لیا تھا عکس بھی اک ہاتھ کا

بلاشبہ یہاں توازن نبھانے کے لیے بڑی سلیقہ مندی سے بات کا جتن کیا گیا مگر بات نظم کی بات ہی بنی غزلیہ اسلوب پیدا نہیں ہو پایا۔
ایسی بات صرف کہیں کہیں بن سکتی ہے کہ یہ لہجہ تغزل کا ہو سکتا ہے:

کبھی جو سرما کی تیز بارش مجھے سر راہ آن گھیرے
تمہارے گھر کے برآمدے میں رکوں میں پھر راگیر بن کر (نثار ناسک)

روایتی طور پر غزل اپنے اساطیر و اطوار کی نگہ دار رہی ہے۔ ان اطوار میں یہ رسم بھی شامل رہی ہے کہ شعر کا آغاز حرف ربط سے عموماً نہیں کیا جاتا تھا۔ (استعجاب یا شدت تاثر کی خاطر لیکن، مگر وغیرہ کا استعمال ہی شاید واحد استثناء رہا ہے آج کی غزل چونکہ بیانیہ کو راہ دیتی

ہے جس کے ہمراہ تسلسلِ منظر اور تسلسلِ خیال بھی چلتا ہے، سو نظم کی طرح غزل کا بھی آج ہر کسی لفظ سے آغاز کیا جاسکتا ہے:

کوئی ہم سا پاگل کہاں ملے
جو نیند سے آنکھ چراتا ہو
اور تجھ سے ملنے کی خاطر
جو خود سے بچھڑا بیٹھا ہو

کلاسیکی اور جدید غزل میں فکری رویوں کے تقابلی مطالعہ کے سلسلے میں ڈاکٹر سعد اللہ کلیم کا کہنا ہے کہ کلاسیکی تصور میں ”نہ ما بے او“ پر اصرار ملتا ہے جب کہ جدید اردو غزل نے اقبالی زبان میں ”نہ او بے ما“ پر بھی مناسب توجہ دی ہے جب کہ جدید تر اردو غزل ”نہ ما بے او“ کو یکسر فراموش تو نہیں کرتی مگر یہ طے ہے کہ اس کے لیے زیادہ کشش کی بات ”نہ او بے ما“ ہی کے رویہ میں مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ نیا عہد کائنات کی وسعت کے تناظر میں خود کو حقیر سمجھنے کے بجائے خدا کی عظمت کے تناظر میں انسانی کمتری کا احترام کرنے کا قائل ہے۔ ان کی تائید درمیانی عہد کے فن کاروں کے بعض اشعار سے نکلتی بھی ہے۔

جو خود ان کے دلوں میں تھا تر سنگ
وہ خزانہ کسی کسی کو ملا (مجید امجد)
ادھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی
کہ زیر سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا (شکب جلالی)
سفر تمھاری ہی جانب ہے کوئی منزل ہو
تمھارے نام سے منسوب ہوں کہیں ہوں میں (سلیم احمد)

ڈاکٹر صاحب کے لفظ ہیں:

”ہر راستہ کا گھوم پھر کر ایک منزل تک جا پہنچنا، شہکار کو فنکار کے حوالے سے شناخت کرنا، مظاہر فطرت کا کسی ایک سرچشمہ حسن کی سمت رہنمائی کرنا، عشق کا حسن کے حوالے سے حسن کی منزل تک پہنچنا، یہ سب ذہنی و جذباتی روئے غزل کو ظاہر موجود تک محدود کر دینے اور خارج کا پابند کر دینے کی جگہ ماورائے موجود و محسوس کی چاہت میں آگے بڑھا کر عہد کے اجتماعی لاشعور میں ازل سے موجود تصورِ معبود کی دھیمی خوشگوار روشنی کو جدید تر اردو غزل پر اتار رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جدید تر اردو غزل کے افق پر حقیقت کے روحانی تصور کے بظاہر غروب ہوتے سورج کی روشنی جسدِ غزل

کے ہر مسام سے پھوٹ پڑنے کو بے قرار ہو۔

اردو غزل کا ابتدا سے رومانوی تسلسل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ عظمتِ بشر کا تصور ہر دور میں موجود رہا ہے۔ کمی یا بیشی اگر کہیں نظر آتی ہے تو وہ عقیدہٴ عظمتِ بشر میں نہیں بلکہ بندے اور خدا کے مابین رشتے کے کم و بیش ادراک میں ہے اور یہ رشتہ بھی کسی دور میں یکسر معدوم نہیں ہوا۔ (اردو غزل اور تصورِ بشریت: ڈاکٹر سعد اللہ کلیم)

منیر نیازی کے ہاں تئیر کا عنصر ایک ماورائیت کا سفر کرتا ہے جو کئی بار روحانیت کے دروازے پر دستک جادیتا ہے۔ یہ روش بھی کئی نوجوانوں کے لیے باعثِ تقلید بنی۔ شہزاد احمد اور احمد مشتاق نے خالص تغزل کے اسلوب میں جدید لہجہ کی دریافت کی۔ احمد فراز نے محبت اور پھر محبت اور سیاست کے سنگم پر غزل کی بنیاد اٹھائی۔ پروین شاکر نے نوعمر لڑکی کے محسوسات سے آغاز کیا اور محبت کے حلقہ میں اپنے موضوعات کا جہان آباد کیا۔ ظفر اقبال نے ”گلافابی“ روش ترک کی تو بعد کے آنے والوں نے ان کے تیکھے لہجے سے بہت کچھ سیکھا۔ ہر موضوع کو تغزل مآب کر سکرنا پھر قافیہ کی ان دیکھی پرت میں سے جھانک سکنے کا سلیقہ ظفر اقبال کی خصوصی توفیق ہے۔ یہاں شاید مثال دینا ضروری ہوگا:

جینے کی سزا یہ ہے کہ اس میں کسی صورت

مرنے کے سوا کوئی سہولت نہیں ملتی

ظفر کا یہ نیم مزاحیہ، نیم سنجیدہ اسلوب اپنی جگہ ایک رویہ بنتا ہے۔ سیف زلفی اپنا ایک انداز رکھتے ہیں تاہم ان پر اور خلیل رامپوری پر یہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس روش میں غزل آفاقیت سے ہٹ کر پیش منظر پر زیادہ حاوی اور زیادہ محیط ہے۔ یہ اسلوب نیم طنزیہ لہجہ بھی اختیار کر لیتا ہے:

پڑھا محبت کا مضمون

بے مقصد اور با تصویر (ظفر اقبال)

اپنے لب و لہجہ سے لفظیات تک غزل ایک معیار بندی کی قائل رہی ہے۔ تاہم ہوتے ہوتے غیر نکسالی الفاظ کی ایک روش بھی اسی اثر کے تحت کئی ایک کے ہاں چلی۔ ہندوپاک کی سطح پر سلیم احمد، رئیس فروغ، سرشار صدیقی، مہدی جعفر کی غزل سے انعام درانی کی صحافتی غزل تک یہ روش دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ رویہ مگر ہماری غزل میں چلا نہیں۔ اس نے تغزل سے بڑے فاصلے پیدا کر لیے تھے۔

نثری ادب کی طرح ہماری غزل نے بھی پاکستانی زبانوں سے بہت سی لفظیات مستعار لیں۔ شیر افضل جعفری کا جھنگ رنگ کئی جگہ بہت کامیاب رہا۔ پنجاب کی دیہی فضاعلی اکبر عباس نے دکھانے کی سعی کی۔ ہندی انگ میں جمیل الدین عالی، ناصر شہزاد اور پرتو روہیلہ نے لکھا۔ اس عہد میں اگر ایک طرف کرار نوری اور صہبا اختر کے کرارے لہجے ہیں تو دوسری طرف افتخار عارف اور پروین

شاکر کے گدا اور لطیف اسالیب سامنے آتے ہیں۔ کہیں فراز کے رومانی معاشرتی تجزیہ کا بانگ ہے تو کہیں ظفر اقبال کے معاشرتی طنز کی کاٹ۔ تہذیبی مطالعات کے ناتے اگر بزرگوں میں ندیم و محشر کے فکری پیرائے سامنے آتے ہیں تو ان کے ساتھ ایک اور سفر منیر نیازی سے اوپر تک بھی چلتا ہے۔

کچھلی تین دہائیوں سے ہماری خواتین کے فنی اظہار میں جنس اور اس کے تلازمے استعارے سے محاکات تک پھیلے ہیں۔ نظم میں اس نے پہلے جگہ بنائی تھی۔ تغزل میں وہی جنسی قرینہ اپنی جگہ پاسکتا ہے جو بے توازن نہ سو جہاں جہاں فنکاروں کے ہاتھوں ایسا توازن قائم ہوا ہے، اچھی شاعری ہوئی۔ پروین شاکر کے ہاں یہ عمل زیادہ بھی دکھائی دیا اور زیادہ سلیقہ بھی سامنے آیا۔ پنہاں، شاہدہ حسن، سیدہ ثمن، شمینہ راجہ، فرحت نواز کے ہاں جنسی استعارہ سے اجتناب ایک خصوصی شناخت بنا ہے۔ ستر کی دہائی کے آغاز تک مرد وزن کے جنسی رشتوں کے تناظر میں آسمان اور زمین کے استعارے استعمال کیے جاتے تھے مگر اس عہد میں عورت اپنی جنسی انفعالیات کا استعارہ لانے کے بجائے جنس میں اشتراک کی تصویر لاتی ہے۔ اس کے لیے بھیگنا، بارشیں اور برسات کے استعارے اور علامت سامنے آئے۔ آج کارویہ یہ ہے کہ لڑکی ادب میں جنس گم کر کے نہیں آتی بلکہ اپنی علیحدہ جنس کا اعلان کرتی ہے:

شب وصال میں اک نقطہ توقف ہوں

اور اک جنوں ہے اُسے منزلوں کو پانے کا

جنسی حوالوں سے کھل کر بات کرنے میں مردوں نے تو مسلسل حصہ لیا ہے بلکہ بہت زیادہ لیا ہے۔ سراج الدین ظفر ہی کے وقت سے شروع کریں تو رئیس فروغ، ظفر اقبال اور سلیم احمد تک کافی کام سامنے آ جاتا ہے۔ یہ بات البتہ رک کر سوچنے کی ہے کہ ہوتے ہوتے اب باب ہوس کو بھی شاعر شامل نصاب عشق جاننے لگا ہے۔

وہ بازوؤں میں یوں ہے کہ جوں جلد میں کتاب

شامل نصاب عشق میں باب ہوس بھی ہے

عشق کے بارے میں ہمارے لوگوں نے کیا کیا کچھ داخل نصاب کر لیا ہے وہ ایک علیحدہ بحث کا موضوع ہے۔ جدید غزل کے ناتے اس وقت جدیدیت کے بارے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔ شمیم احمد کو شکایت ہے:

”اس (جدیدیت) کی بنیاد صرف و محض ذاتی رد عمل کا نتیجہ تھی۔ یہ ذاتی رد عمل بھی بعد

میں غائب ہو گیا جب کہ کلاسیکی اسلوب چاہے اپنی ذات کے وسیلے سے ہی بات

کرے اجتماعی معنویت کی تلاش ضرور کرتا ہے۔“

جدیدیت کے علمبرداروں کے ہاں ابلاغ کے فنی سانچوں کی بے وقعتی کو شمیم احمد ان کی سب سے نمایاں کمزوری سمجھتے ہیں۔

جدیدیت سے شمیم احمد جو بھی مراد لیتے ہوں اسے بحث میں لائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نئی غزل خالی خولی جدیدیت کا کھیل نہیں کہ

غزل فطرتاً ایک روایت پرست صنف ہے اور تہذیب کے تسلسل میں سفر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سعد اللہ کلیم نے بجا طور پر کہا تھا کہ اردو غزل خصوصاً جدید تر غزل کا داخلی سفر آج (بلکہ آج خصوصیت سے) قومی ملی آفاق کی جانب ہے۔ نئی غزل ہم ہی لوگ لکھ رہے ہیں۔ اب بطور فرد اور بطور اجتماع کے ہمارے جو جو اپنے رویے ہیں وہی ہماری غزل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اصل مسئلہ اپنے رویے کو بہتر بنانے کا ہے، کسی خاص اظہاری رویے سے صرف نظر کرنے کا نہیں۔ بلاشبہ بعض نئے غزل گوؤں کے ہاں نئے استعارے اپنی غیر ضروری چلت سے cliché بن کر رہ گئے ہیں تاہم یہ نہیں کہا جاسکے گا کہ نئی غزل فرد کے ذاتی ردِ عمل ہی کو سامنے لاتی ہے بل کہ نئی یا آج کی غیر روایتی غزل کے پاس تو وہ توانا لہجہ بھی موجود ہے، جس کے دامن میں ہمارے تہذیبی آفاق کی پہنائی بھی ہے اور جو آنے والے دن کی عظمت کا اجتماعی خواب بھی دیکھ رہی ہے۔ غزل تو اس حد تک روایت آشنا صنف ہے کہ صدیوں سے اس نے اپنی ہیئت کی ایک رنگی کونسنجھالا ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں جن لوگوں نے فیشن سمجھ کر نیا استعارہ برتنے کے بجائے اظہار کے لیے نیا استعارہ دریافت کیا ہے، وہی نئی غزل کہہ رہے ہیں۔ ایسے غزل گو کافن انسانی حوالے سے فرد کی بارِ درگزر یافت کر رہا ہے۔ زیر مطالعہ عہد کے غزل گو کا رویہ دیکھیے:

قدیم شاعر شراب کے استعارے کے ناتے بڑی بڑی باتیں کر جایا کرتا تھا۔ اگرچہ کہ اس بادہ و جام کی توجہات کئی سے کئی ہوتی تھیں یہ محض شرب ممنوعہ نہ تھی تاہم نئے شاعر نے لفظی معنویت سے رندی کا ڈنکا بجایا نہ اس کی مجازی معنویت سے روحانیت کشید کی۔ سو آج کی شاعری سے شراب کا استعارہ اسی طرح معدوم ہے جیسے کہ آج عمومی طور پر شراب غائب ہے۔ نئے شاعر نے واعظ کے لئے بھی نہیں لیے۔ تاہم چونکہ غزل اپنی روایت کے جلو میں چلتی ہے اس لیے یہ مضامین یکسر معدوم ہو کر بھی نہیں رہ گئے۔

نئے غزل گو نے نادر سے نادر وزن کا تجربہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے کبھی ہندی پنگل کے حوالے سے اپنی غزل کو نئے اوزان سے آشنا کرانے کی کاوش کی تھی۔ محبت عارفی نے بھی کچھ سعی کی تھی بعض پنجابی اوزان و بحور رفیق خاور کے اولین تجربوں کے وقت سے ہی متداول تھے۔ مگر نئے غزل گوؤں نے اردو کی قدیم بحور و اوزان میں سے غیر مروج اوزان و بحور کو شعوری طور پر برتا۔ ان کے ہاں اس دوران رواں بحریں کم برتی گئیں۔ metre میں رکاوٹ والے اوزان زیادہ برتے گئے۔ کراچی کے شعرا نے اس سے خصوصی رغبت ظاہر کی۔ افتخار عارف، صابر ظفر، سلیم کوثر اور حسن اکبر کمال کے علاوہ اظہار الحق اور خالد اقبال یا سر نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں بھارت کے شعرایوسف جمال وغیرہ کی آزاد غزلیں بھی چھپیں مگر یہاں آزاد غزل کی ابتدا بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ناصر شہزاد وغیرہ کا ہندی لہجہ بھی غزل نے متفقہ طور پر نہیں قبولاً۔ لفظیات کے حوالے سے شیر افضل جعفری، رئیس فروغ اور ظفر اقبال کی اجنبی لفظیات کے باوجود غزل نے زبان کے معیار اور ذائقہ کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ ہاں اس عہد میں فارسی کے بجائے سہل اردو اور مقامی زبانوں کے الفاظ نے راہ ضرور پائی۔ اس زمانے کی شاعری میں مرکب اور طویل ردیفیں بھی برتاؤ میں آئیں:

ہجر کا موسم ہے عمرِ رائگاں اور ایک میں

ایک صحرائے زمین و آسمان اور ایک میں

ہوا، غبار بھرا گھر بھی، میری آنکھیں بھی

بچھڑتے وقت کا منظر بھی میری آنکھیں بھی

اردو شاعروں نے عالمی احوال و آثار پر اپنے قلب و ذہن کے در کبھی بند نہیں کیے۔ برصغیر کی سطح پر شاعروں کے ناتے بھی شعرا کا میل جول رہا مگر غزل نے اپنے لیے نظم والے تجارت نہیں قبولے۔ ہاں بعض اوقات نظم کی طرح کے وقفے اور سکتے استعمال میں ضرور آئے۔ تاہم اپنے ہاں ایسی مثالیں بھی کم ہی ملیں جیسی بھارت کی غزل میں ملیں گی:

اٹھو کہ اب تو صبح ہوئے دیر ہوگئی

وہ داستانِ درد سنا کر سنو! گیا (مظہر امام)

پاکستانی غزل کی لفظیات میں عربی الفاظ کا دخل بھی بڑھا اور فارسی اثرات بھی گہرے ہوتے گئے۔ احمد جاوید، ثروت حسین، انور مسعود، خورشید رضوی، اظہار الحق اور اجمل نیازی کے ہاں ایسے اثرات عام ملتے ہیں۔ ۸۰ء سے پاکستان میں نعت کا عام فروغ ملتا ہے سو مذہبی حوالوں سے ایک بڑا vision بھی غزل گو کے خوابوں کا حصہ ہوا۔ خورشید رضوی، ثروت حسین، افتخار عارف، احمد جاوید، جلیل عالی، اظہار الحق، سراج منیر، اجمل نیازی، علی اکبر عباس وغیرہ کے ہاں خواب سے یہ انسلاک دکھائی دے سکتا ہے۔ اس سلسلہ کے آغاز میں دور کہیں منیر نیازی کے ہاں موجود اجتماعی حوالے کے خواب آگئیں اشارے بھی ہیں اور مجید امجد کی مربوط سوچ بھی۔ غلام حسین ساجد، محمد خالد اور ایوب خاور کے ہاں بھی ایسی فضا کے اثرات کئی جگہ ملیں گے۔ ثروت حسین کی غزلوں سے اوّل اوّل یہ لحن سنائی دیا تھا جو بعد میں مذکورہ شعرا کے ہاں اپنے طور گونجا:

قریب ہی کسی خیمے سے آگ پوچھتی ہے

کہ اس شکوہ سے کس قرطبہ کو جاتا ہوں

حذر کہ دجلہ دشوار پر قدم رکھتا

شکار گاہ فرات و فنا کو جاتا ہوں

رمیدگی کا بیاباں ہے اور بے خور و خواب

غبار کرتا سکوت و صدا کو جاتا ہوں

اسی جائے نماز و راز پر اک روز ثروت

اچانک در کھلے گا اور وہ جھوٹکا ملے گا

فراتِ فاصلہ و دجلہ دعا سے ادھر

کوئی پکارتا ہے دشتِ نینوا سے ادھر

گزر گیا ہے وہ سیلابِ آتشِ امروز
بغیر خیمہ و خاشاک کو گزند کیے

آج کی غزل نے مجموعی طور پر انسان، کائنات (اور اس کے مسائل) اور خدا کے حوالے سے جو کچھ بھی محسوس کیا اسے لگی لپٹی رکھے بغیر بیان بھی کر دیا۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جو رائے دی ہے وہ گہرے تجزیے پر منحصر نہیں ہے، کہیں یوں بھی محسوس ہو سکتا ہے کہ محض زمانے کے رواج کے تحت کوئی مقبول رائے سامنے لائی گئی ہے۔ تاہم اپنی رائے رکھنا ہر کسی کا حق ہے اور کسی شاعر کو اس سے محروم کر دینے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب بعض آرا ملاحظہ ہوں:

مرے لیے تو یہ رائے دہی عذاب ہوئی
دو نیم کر گیا پہلا ہی انتخاب مجھے
ہر ایک شخص یہاں خوبیوں کا مالک ہے
یہاں پہ عیب نہ ٹھہرے گا عیب جو ہونا

ہر قوم کی اپنی ایک اخلاقیاتی روش ہوتی ہے جو قومی آدرش کے تناظر میں طے ہوتی ہے۔ نطشے کے عہد سے اب تک اخلاقیات کے ازلی یا اضافی ہونے کے مباحث ہمیں یہاں تک ضرور لے آئے ہیں کہ کوئی انسانی وجود اخلاقی حس سے عاری ہونے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جب ایسا ہے کہ اخلاقی حد کی برقراری طے شدہ ہے تو پھر اخلاق عالی ہی کا معیار سامنے کیوں نہ رکھا جائے۔ ہماری قوم کے تصور میں سہائی ہوئی مخصوص اخلاقی حس ہی ہمیں انسانی معیار بھی عطا کرتی ہے جس میں ہیرو کے لیے ذاتی لطف و لذت کی خاطر مکھن چرانا غیر پسندیدہ ہے۔ یہ معیاری کردار ہمارے ہاں اب عموماً ملتے ہی نہیں ہیں مگر وہ جو رومی نے کہا تھا:

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد؟ گفت محال
گفتمش کوشش من در طلبش؟ گفت رواست

یہ بلندی معیار کردار کی زیادہ دُور تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ زیادہ عظیم انسان خلق کر سکتی ہے۔ اردو کی روایتی غزل محبوب، عاشق، انسان اور حسن کے ناتے سے ایک عجیب معیار پسندی اور تصور اتیت کی علمبردار رہی ہے۔ یہ مطالعہ اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے کہ زیر تبصرہ عہد کے شعرا نے اس تناظر میں کیا کیا رد عمل ظاہر کیا ہے۔ بعض موضوعات پر چند اشعار ایک تقابل فراہم کرتے ہیں:

واعظ:

لب کشائی کریں تو کیسے کریں
واعظ خوش بیان سر پر ہے

دینداری اور رندی:

جتنی جلدی ہو جام خالی کر

دیکھ وقتِ اذان سر پر ہے

تسلیم و رضا کے نئے معنی:

اک پیکرِ تسلیم و رضا پاس تھا میرے
کس منہ سے کہوں چوک سی کیا ہو گئی مجھ سے

مذہب:

بھوک سے مرتے رہے خیمہ افلاس میں لوگ
آسمان سے نہ مگر خوانچہ نعمت اتر

خدا:

اسے پکار چکا زندگی میں ہار چکا
مرا خدا تھا تو پھر میری التجا سُننا

محبوب اور محبت کی دوئی:

اپنے لیے جو شام بچا کر رکھی تھی
وہ تجھ سے عہد و پیمان میں گزری ہے

محبت:

اور اب تو زندگی کرنے کے سو طریقے ہیں
ہم اس کے ہجر میں تنہا رہے تھے جب بھی نہیں

وفا:

کسی اور دل میں بنالوں کا راہ
جب اس کی نظر سے اتر جاؤں گا

عاشقی:

قتیل انجام ہوتا کاش اپنا عاشقوں جیسا
کہ دم دیتے کسی زانو پہ ہم آہستہ آہستہ

خدا سے بے نیازی:

پُر ہوا جام سے کچھ پہلے مرا کاسہ عمر
اے خدا شکر ہے میں تیرا سوالی نہ بنا

محبوب سے تعلق کی حیثیت:

تو بھی محدود نہ ہو مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

چاہت کی شرط:

میں تجھے ٹوٹ کے چاہوں گا مگر شرط یہ ہے
تھک کے بیٹھوں تو کہیں سایہ دیوار ملے

میزبانی:

نہال کر گیا مجھ کو ٹھہر کے رات کی رات
وہ میہماں تھا مگر میرا میزباں نکلا

نئی غزل کا کمزور ترین نقطہ اور شاید واحد بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس میں محبوب کا مرتبہ شدت سے متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے اور عشق کا معیار گویا نہ ہونے کی منزل تک آپہنچا ہے۔ فراق نے اپنے زمانے میں اس گرتے ہوئے گراف پر گرفت یہ کہہ کر کی تھی:
نرخ میں آ گیا عشق اعظم ٹوٹ پڑے دنیا کے کمینے
مگر ہمارے عہد تک آتے عشق اہل دنیا کی بیعت کر چکا ہے۔ کم کوشی اجتماعی ہو چکی۔

اجتماعی زندگی ہو کہ انفرادی عمل ہمارے ہاں معیارِ محبوب کی بربادی نے ہمارے دوسرے سب معایر کو متاثر کیا ہے۔ نئی غزل کا واحد غائب اس ”وہ“ کا استعارہ ہی نہیں بن سکا، غیاب جس کا پردہ تھا۔ جس پردے سے ہر محبوب جھانک سکتا تھا، ہر حسن جس سے مستعار ہو سکتا۔ نئی غزل کا واحد غائب اگر محبوب کا پردہ ہے تو یہی واحد غائب رقیب کا رمز یہ بھی ہے۔ سونفرت، حقارت، جھجھلاہٹ اور طنز بھی محبت کے ہم رکاب مل جاتے ہیں۔ ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی آج کی غزل نے محبوب اور رقیب کی ایک وحدت سی بنادی ہے۔ یہ سب عشقِ اعظم کے انتشار کے طفیل۔ شاعری، سماجیات اور بشریات کے تجزیے، قومی نبض شناسی کی بنیادی ضرورت ہوا کرتے ہیں۔ ان میں شاعری کے ذریعے ظاہر ہونے والا اتفاق آرا کسی موضوع پر سب سے وقع اور قابلِ اعتماد referendum کہلائے گا۔ زیرِ تبصرہ دورانیہ میں شاعر نے بھی احوال کو نظم کیا۔ سبھی رویوں پر رائے دی اور کتنی سچی رائے دی:

گھنے درخت ڈریں احتسابِ موسم سے
میں ایک سوکھا ہوا پیڑ کس شمار میں ہوں
چنو وہ لفظ مناسب ہوں جو مگر نے میں
وہ وقت آئے گا سوچو گے یہ کہا بھی ہے؟

گزر رہی ہے تذبذب میں زندگی اپنی
نہ ہم یقین کی جانب نہ ہم گماں کی طرف

یہ سب شعر ہمارے اجتماعی احساسات کی تصویریں ہیں۔ ہمارے بکھراؤ کے اشاریے۔

نئی غزل کی خارج پر کھلتی ہوئی آنکھ کے یہ زاویے کئی اہم سوالات کی طرف ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ اخلاقی انحطاط اور عدم وابستگی سے لے کر منزل حیات کے عدم تعین تک ہماری اجتماعی زندگی میں کتنے بڑے بڑے کھانچے ہیں۔ فارغ بخاری نے کہا تھا:

ع ہم نئی نسل کو بیدار تو کر سکتے ہیں

مگر یہ بیداری ہی مشکل تھی۔ ہمارے ہاں ساری تعلیم و تعلم کے باوجود نئی نسل کی تعلیم اور تربیت ہر دو میں رخنے موجود ہیں۔ جنہیں قومی اعتماد کے حوالے سے مطالعہ پاکستان کی لازمی تدریس بھی پورا نہیں کر سکی۔ شاعر الہامی باتیں تو نہیں کرتا مگر جو کہتا ہے وہ آخراں کے ماحول میں ضرور کہیں موجود ہوتا ہے، سوچنے کی بات تھی کہ نوجوان شاعر نے یہ کیوں کہا کہ:

کوئی دریچہ ہوا کے رخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کر گھر نہیں بنایا

اس لیے کہ بزرگوں نے کہا تھا:

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

اس تناظر میں احسن علی خاں کا یہ شعر کئی حوالوں سے بڑا ماعنی ہے:

دولت مری کچھ خواب تھے سو بکھرے ہیں وہ بھی
بے ورثہ ہے اب نسلِ جواں دیکھیے کیا ہو

کاش ہمارے پالیسی بنانے والے ادارے اپنے عہد کی تصویریں اپنے ادب سے دیکھنے کی توفیق رکھتے۔ بزرگوں کی وہ نسل جو ترک وطن کر کے پاکستان آئی تھی اسے مدت تک یہ طعن سننا پڑا تھا کہ اس نسل نے اس زمین کو وطن جانا ہی نہیں مگر اس عہد کے دوران اس طرف سے یہ اظہارِ تعلق کھل کر سامنے آیا ہے:

ہجرت کی تمنا تو رقم کرتے رہے ہو
جیسا بھی ہے اپنا ہے یہ گھر کیوں نہیں کہتے

(مظفر حسین رزمی)

اے زمیں! مجھ کو یہ ازبر ہے کہ میرے اجداد
چھوڑ کر تیرے لیے کوچہ دلدار آئے

(سلیم کوثر)

اور مشرقی پاکستان کے سقوط کو سہے ہوئے پاکستانی کا یہ کہنا کیسا لگا:

اب تو میری کل تو قیر شجر ہے آدھا
 برق کو یہ آدھا بھی شجر دوں یہ نہیں ہوگا
 شجر میں چاہے سو ترمیم ضروری ہو
 شجر پناہ پہ ضرب لگانا ٹھیک نہیں (جلیل عالی)

ایک اور فرزند زمین کا رویہ بھی اسی آواز سے آواز ملاتا ہے:

ہمیں یہ غم ہے نگارِ وطن کہ ہم نہ رہے
 تو جانے کون ترا قرضِ غم اتارے گا (مقبول عامر)
 مقبول عامر نہ رہے لیکن جذبہ سلامت رہ گیا۔ یہی درد مندی مرتضیٰ برلاس کی ان دو پوری کی پوری غزلوں میں رچی بسی ملے گی جن کے
 مصرع ہائے اولیٰ ہیں:

ع بدن میں جاگ اٹھیں کپکپا ہٹیں کیسی اور
 ع تیز رفتاری میں آخر تم نے یہ دیکھا گرے
 یہی احساس پر تو روہیلہ کی کتنی ہی غزلوں میں ملے گا بلکہ آج کے اکثر اہل فن کے ہاں اس قومی درد مندی کا احساس موجود ہے۔ جن
 کے ہاں واضح اظہار نہیں ان کے ہاں تر الفاظ ان احساسات کی پرتیں ملیں گی۔ تسلسل اظہار اور قوی حسیت ہر دو حوالوں سے غزل کا یہ
 رخ نیا بھی ہے اور آگے کو بڑھتا ہوا قدم بھی ہے۔ اس درد ملی کے ناتے ہمارے شاعر کی حساسیت ملاحظہ ہو:

مکینوں پر بھی لازم ہے مکانوں کی نگہ داری
 جو کڑیاں چھت کی ٹوٹیں شکوہ بنیاد مت کیجیے (مرتضیٰ برلاس)
 اے میرے خدا میرا وطن تیری امانت
 پھل پھول بھی دینا اسے آباد بھی رکھنا (حلیم قریشی)
 جس طرح کی ہیں یہ دیواریں یہ درجیسا بھی ہے
 سرچھپانے کو میسر تو ہے گھر جیسا بھی ہے (انور مسعود)
 کس طرح کے ہیں ملیں جن کی تگ و دو ہے یہی
 در تو باقی رہے دیوار نہ رہنے پائے (محسن بھوپالی)
 اے مادرِ گیتی تری حیرت بھی بجاہے
 تیرے ہی نہ کام آیا تو سرکس کے لیے تھا (پروین شاکر)

بجا کہ ہمارا شاعر ہر عہد کے دوام کے کام آیا۔ بعض اوقات اس نے احتجاج اور جہاد میں فرق کو بھی نہ پہچانا۔ بعض اوقات دنوں ہی سے روگرداں ہوا مگر ہماری شاعری کی مرکزی رو بڑے کردار کے ہم قدم چلی ہے، خیر کی آرزو مندی ہمارا بنیادی خواب رہا ہے۔ سوانقلابی نعرہ جنھوں نے نہیں لگایا انھوں نے بھی بات کی اور جنھوں نے نعرہ لگایا انھوں نے بھی کہا:

رہے قائم تمیز مستحق نامستحق کچھ تو

اگر نااہل ہو مسند پہ زندہ باد مت کیجے

جن نئے لوگوں نے نظم کے بجائے غزل کو خصوصیت سے توجہ دی ان میں انور جمال، صفدر سلیم سیال، صابر ظفر، فرحت نواز، غلام محمد قاصر اور حسن عباس رضا وغیرہ کے نام زیادہ سامنے آئے۔

آں حضورؐ نے ارشاد کیا تھا کہ جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے وہی آنے والے دنوں میں ظاہر ہوتا ہے (اؤگما قال) اس سچائی کا ظہور سقوطِ مشرقی پاکستان سے پہلے شاعری تک میں بکھرنے لڑنے کے استعاروں کے چلن میں ہم دیکھ چکے ہیں مگر یہ عہد اپنے شعری رویوں میں کسی قدر اعتماد، ذرا سی مستقبل بینی اور کچھ امید کی بات کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اس دوران جو ردیفیں بے حد مقبول رہیں، ان میں: کریں گے۔ رہے گی۔ رہ جائیں گے۔ دے جائے گا۔ لے جائے گی۔ بن جائے گا۔ جاؤں گا۔ ہو جائیں گے۔ ہوں گے۔ رہے گی۔ ڈھونڈیں گے۔ ہو جائے گی اور ہوگی کی ردیفیں مستقبل کے بارے میں سوچنے کے عمل کی چغلی ضرور کھاتی ہیں۔ یہ صحت مند رویہ اپنی جگہ ایک اثبات رکھتا ہے۔ شاعر قومی رہنماؤں کی طرح پبلک کے مستقبل کے بارے میں سوچنے سے حذر نہیں کر رہا بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اسے ملک کے اور اپنے مستقبل کا یقین بھی ہے۔ برصغیر کی سطح پر دیکھیں تو ان ردیفوں کو برتنے والوں میں میرے علاوہ سہیل جعفر، حسن عباس رضا، منور ہاشمی، سیف علی، مظفر احمد ضیا، نعیم ثاقب، خاور زیدی، رضی حیدر، ناہید شاہد، تصدق حسین الم، شاہین بدر، گلنار آفریں، انام دانش، ممتاز اطہر، افتخار امام صدیقی، آسی خانپوری، مصدق اقبال، خادم رزمی، عطاء الحق قاسمی، نجیب احمد، اختر امام رضوی، صمد انصاری، عالم تاب تشہ، سلطان رشک، نیاز حسین لکھویر اور محشر بدایونی کے نام گنانا اس لیے ضروری ہوا کہ اس استقبالی ردیف کی حیرت انگیز مقبولیت کا ثبوت دیا جاسکے۔ معین تابش، افضل منہاس، سلیم کوثر، روحی کنجاہی، افضل پرویز، محسن احسان، سلیم احمد، پرتو روہیلہ، حزیں لدھیانوی، اسرار زیدی، شہزاد احمد، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی اور احسان دانش کے نام اسی ضمن کے بھی نمایاں نام ہیں۔ مستقبل کے بارے میں ان غزلوں میں بعض اوقات شکوک اور شبہات بھی سامنے آتے ہیں مگر مستقبل کی بات کرنا خود اعتمادی کا پہلا نشان ہے جس کا ثبوت فن کار نے سب سے پہلے دیا ہے۔ اس عہد میں ”کوئی اور ہے“ کی ردیف بھی چلی۔ بعض لوگوں نے ”اپنی جگہ“ کو ردیف بنایا اور اچھے اچھے شعر نکالے۔ ”آہستہ آہستہ“ والی ردیف تاہم خصوصیت سے نمایاں ہوئی۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم کے بعد اس زمین میں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، توصیف تبسم اور پروین شاکر نے خوب صورت غزلیں کہیں۔

میں ان ردیفوں کے لٹن سے بھی درجہ بدرجہ وجودِ قوی کے ظہور کی مبارک ساعت کے جلوہ کا امکان دیکھتا ہوں اور عوام کے

مسائل کے حل کی نوید کا تصور باندھتا ہوں۔ ان ردیفوں کے انتخاب کو نئے جہاں کی امید سے جوڑتا ہوں جیسے ہم ان شاعروں کے ہمراہ آہستہ آہستہ انفرادی و اجتماعی تجزیوں سے چلتے چلتے امید، اعتماد اور صداقت کی یافت تک پھر وہاں سے آگے یقین کی منزلوں تک کا سفر کر رہے ہیں۔ شاید یہ کسی قوم کے ظہور نو کی نوید ہے۔

نئی غزل کی جانب پہلی پہلی کوششیں پاکستان ہی میں کامیاب ہوئیں مگر بعد کے بھارت میں بھی نئی غزل خوب چلی۔ مظفر حنفی، بشیر بدر، عرفان صدیقی، فضا ابن فیضی نے اتنے ہی اعتماد اور اتنی ہی توانائی سے اس لہجہ میں بات کی ہے جس قوت کے ساتھ پاکستان میں غزل بڑھی پھیلی اور پھولی ہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک کے زمانے میں پاکستانی اور بھارتی اہل شعر ایک دوسرے ملک کے علاوہ خلیجی ممالک کے شاعروں میں بھی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے ہیں۔ ان سب اسباب نے جہاں تازہ گوئی کے رویے کو بڑھوتری دی ہے وہاں شعرا کے دائرہ استحسان کو بھی پھیلا دیا ہے۔ دونوں حوالوں سے شعر میں جدید رویہ یعنی اپنے مسائل کی پیش کش کی روش کو بڑھنے اور مقبول ہونے کا موقع ملا۔ بشیر بدر نے تو اسے بھارتی مسلمان کے روز و شب کا آئینہ کر دیا۔

بعض غزلوں میں اس ہند ایرانی تہذیب کی جھلکیاں بھی پس منظر میں مل جاتی ہیں جسے سادگی سے مسلم تہذیب کہہ دیا جاتا ہے۔ بعض غزل گوؤں کے ہاں یہ روش محض جاگیر داری ثقافت کی Aggrandisement کے کام آئی ہے جب کہ بعض ایک ایسے بھی ہیں جو تہذیب کی اجتماعی روح تک کا سفر کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ثروت حسین، غلام حسین ساجد، افتخار عارف اور محمد اظہار الحق کی غزلیں اس سفر کا استعارہ بنتی ہیں۔ سراج منیر نے بھی قبل ازیں چند ایک ایسی غزلیں کہی تھیں۔

اس عہد میں غزل مقبولیت کے وسیع تر آفاق سر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سے پرانے مشہور نظم نگار غزل کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ ضیا جالندھری، اقبال کوثر، احمد ظفر اور قیوم نظر نے غزلیں کہیں۔ فراق و اثر کے انداز میں طویل اور بعض اوقات مسلسل غزلیں بھی بعض ایک فنکاروں نے کہیں۔ جمیل ملک گوہر ہوشیار پوری، اختر ہوشیار پوری، خلیل رامپوری اور کبھی کبھی سیف زلفی کے ہاں ایسی کوشش ملتی ہیں۔ ادبی رویوں کے مطالعہ میں نئی غزل کے لہجے کی مقبولیت یقیناً حیران کر دیتی ہے۔ بعض اکابر شعرا نے قدیم روش ترک کر کے نئے اسلوب کی غزل کہی اور بڑے کامیاب ہوئے۔ شمیم احمد ان اکابر میں امید فاضلی کی نئی غزل کو اہمیت دیتے ہیں مگر زیر مطالعہ عہد میں ہماری نگاہ میں امید فاضلی سے کہیں زیادہ کامیاب محشر بدایونی اور مسعود قریشی رہے۔ منور لکھنوی کا نام بھی انہی کے ساتھ آتا مگر ان کا مزاج فطرتاً وراثی ہے جو نئے غزل گو اسی عہد میں ابھرے ان میں محمد اظہار الحق، غلام حسین ساجد، اجمل نیازی، جلیل عالی اور عباس تابش اہم نام ہیں۔ غزل کی مقبولیت کے اس عہد میں بہتوں نے غزل کہی مگر انتہائی اعتماد، سہولت اور حسن کے ساتھ ظفر اقبال، رام ریاض، رئیس فروغ، سلیم کوثر اور فیصل عجمی نے شعر کہا۔ جس طرح ان مختلف زمانوں کے یہ سارے نام ہماری غزل میں یک جا ہو جاتے ہیں، ہم اپنی قومی زندگی میں بھی ادب سے ایسی ہی اجتماعی بندش کی صورت ابھرتی دیکھتے ہیں۔

غلام عباس کے افسانے

اُن تخلیقی توفیقات کا اندازہ کیے بغیر جو غلام عباس کے افسانے کو ماجرا نویسوں کو محبوب ہو جانے والی حقیقت نگاری سے مختلف اور نمایاں کرتے چلے گئے ہیں، اس باکمال افسانہ نگار کو ڈھنگ سے سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ جی، میں غلام عباس کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے ۱۹۳۹ء میں ”آئندی“ لکھ کر ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ سب حیرت سے اس افسانے کو دیکھتے تھے، اچھایوں بھی افسانہ لکھا جاسکتا ہے، کہ اس کا کوئی ایک مرکزی کردار نہ ہو، کوئی ہیرو نہ ہو نہ اینٹی ہیرو، سب کچھ منظر ہو کر یوں کاغذ پر اترے کہ وقت پہلو بدلنا بھول جائے۔ وہ جوان کے قلم کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نرم رو اور سبک سیر تھا تو اس کا سب سے کامیاب مظاہرہ اسی افسانے میں ہوا تھا۔ خود غلام عباس کو بھی یہ افسانہ لکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ایک مصنف کی حیثیت سے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا موڑ آچکا تھا۔ انہوں نے بہت پہلے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں، تراجم کیے اور ماخوذ کہانیاں بھی دیں، افسانے بھی لکھے مگر جب پہلی بار ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا تو اس کا نام ”آئندی“ تھا؛ جی اس افسانے کے نام پر، جسے لکھ کر انہوں نے خود کو ایک تخلیق کار کے طور پر شناخت کیا اور جوان کے فن کو عجب طرح کی توقیر دے گیا تھا۔ غلام عباس نے اس مجموعے کے بارے میں لکھ رکھا ہے: ”یہ افسانے میں نے دلی میں ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے وقفوں میں لکھے۔“ یہیں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے، مگر اپنی تصنیفی زندگی کو ایک خاص سال سے اہم سمجھنے کی وجہ کچھ اور نہیں ”آئندی“ جیسا شاہکار افسانہ ہے۔

عین آغاز ہی میں ”آئندی“ کا ذکر لے آیا ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ غلام عباس کی تخلیقی شخصیت محض اس ایک افسانے کے منہا کرنے سے وہ رہتی ہی نہیں، جو اس افسانے کو تصور میں لاتے ہی بن جاتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غلام عباس کے پاس اور کامیاب افسانے نہیں ہیں۔ اوور کوٹ، فینسی ہمیر کٹنگ سیلون، ہمسائے، کتبہ، اُس کی بیوی، بامبے والا، کن رس، دھنک۔۔۔ پڑھتے جائیے اور مختلف لطف والا بیانیہ آپ کو زیادہ دور نہیں جانے دے گا، باندھ کر کہانی کے آخر تک لے جائے گا۔ میں نے کئی ماجرا نویسوں کو بڑی بڑی ہانکتے سنا ہے مگر انہیں پڑھا جائے تو شروع سے آخر تک انہیں کہانی کہتے ہوئے اپنے بیان کو تخلیقی بیانیے میں ڈھال لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بس واقعہ واقعہ اور واقعہ، جو لکھنے والے کے اعصاب پر سوار رہتا ہے وہی وہ اپنے قاری کے اعصاب پر بھی سوار کر دیتے ہیں۔ غلام عباس کی حقیقت نگاری کی کوئی نسبت ایسے بے توفیقوں سے ہے ہی نہیں۔ ذرا دیکھیے وہ پورے منظر کو اور پورے ماحول کو اپنے بیانیے میں کیسے مختلف کر رہے ہیں:

”یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا، گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ

ہے۔“ (۱)

”وہ (بدلیاں) دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔“ (۲)

”وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا جس طرح کوئی دور دراز ملک کا رہنے والا منجلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کا ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے“ (۳)

تو یوں ہے صاحب، کہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنا اور اپنے تجربے کی تازگی، مشاہدے کی گہرائی اور انوکھے تخیل کو تخلیقی کٹھالی میں ڈال کر، پگھلا کر، ڈھال کر، سہار سہار کر لکھنا غلام عباس نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ چونکائے بغیر، واقعات میں اُتھل پھل کیے بغیر، زندگی کو یوں لکھنا جیسی وہ تھی، مگر اُسے یوں لکھ دینا کہ عین عین ویسی نہ رہے جیسی وہ تھی۔

۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہونے والے غلام عباس کی زندگی کا وہ دورانیہ جو ۱۹۳۹ء سے پہلے کا تھا، ایک تخلیق کار کی حیثیت سے چاہے غلام عباس کے لیے اہم نہ ہو، ان کی تخلیقی زندگی میں بعد میں یوں ظاہر ہوا کہ ان کے فکشن کے لیے بہت اہم ہو گیا ہے۔ ابھی وہ شیر خوار تھے کہ ان کا باپ مر گیا۔ ماں نے دوسری شادی کی اور ابھی نو سال کے ہی تھے کہ ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ چار سال کے ہوئے تو امرتسر سے لاہور آ گئے۔ ماں نانی اور نانی کی بہن، یہیں بھائی گیٹ کے قریب ایک مکان میں رہے۔ کمانے والا کوئی نہ تھا، ماں نے پان سگریٹ اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان بنالی، ذوق عمدہ تھا ناول وغیرہ پڑھتی رہتی تھیں۔ یہ پڑھنا غلام عباس نے ماں سے لیا۔ چھوٹی عمر میں ماں نے انھیں امام حسین علیہ السلام کا ملنگ بنا کر در در کا منگتا بھی بنایا تھا، اس سے ان کا مزاج بہت کچھ سہہ لینے پر قادر ہوا۔ نویں جماعت میں تھے کہ انگریزی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ کرنے لگے اور معاوضہ ملنے لگا، گویا ماں کے معاون ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقاتیں عبدالرحمن چغتائی، ڈاکٹر تاثیر اور نیرنگ خیال والے حکیم یوسف حسن سے ہوئیں کہ وہ سب وہاں ایک پان والی دکان پر اکٹھے ہوتے تھے۔ نویں پاس نہ کر سکے تو سکول سے اٹھوا لیا گیا۔ سوچا کیا کر سکتے ہیں، موسیقی سیکھنے کی طرف نکل گئے۔ بعد میں پڑھا بھی اور بہت کچھ حاصل بھی کیا مگر زندگی کا یہ دورانیہ ان کے افسانوں میں بار بار ظاہر ہوا ہے۔ یہ زمانہ بھی، اور وہ زمانہ بھی کہ جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے رسالے ”آواز“ کے ایڈیٹر تھے۔ اور ان کا دفتر پرانی دلی کے علی پور روڈ پر واقع تھا اور گھر نئی دلی کی ایک لین میں، یعنی شہر کے دوسرے سرے پر۔ تو جو کچھ اُن پر بیتا اور جو کچھ انھوں نے دیکھا، جو کچھ انھوں نے سہا اور جس کا اُنھوں نے تخیل باندھا وہ اُن کی زندگی سے کٹا ہوا نہیں تھا۔ مثلاً دیکھیے کہ تیس روپے ماہانہ کی۔ ملازمت کا وہ تجربہ جو انھوں نے اسٹیشن کے مال گودام پر حاصل کیا تھا، ”فینسی ہیئر کٹنگ سیلون“ اور ”چکر“ لکھتے ہوئے یاد آ جاتا ہے۔ ”تینکے کا سہارا“ لکھتے ہوئے وہ اپنے یتیم ہونے کے تجربے سے جڑ رہے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ”آنندی“ اور ”سایہ“ میں پان والی دکان کو اس پان والی دکان سے الگ کر کے کیوں کر دیکھا جاسکتا ہے، جس کا ذکر اُن کی ماں کے حوالے سے اوپر ہو چکا۔ (۴)

دلی میں قیام کا زمانہ تو ان کے کامیاب افسانوں کے ریشے ریشے میں بسا ہوا دکھتا ہے۔ 'بات' آنندی' سے شروع ہوئی تھی، تو اسی کا قصہ خود غلام عباس کی زبان سے سینے۔ انھوں نے بتا رکھا ہے کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہفتے پہلے، انھوں نے یہ افسانہ لکھا تھا۔ ان دنوں وہ دلی میں تھے اور وہاں کے مشہور بازار چاڑی کوٹوانوں سے خالی کرا کے انھیں شہر سے باہر دھکیل دیا گیا تھا۔ جس سڑک پر ان زنان بازاری کو منتقل کیا گیا وہ غیر آباد تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چوں کہ خالی زمین پڑی تھی، اس لیے دلی کے شرفاء کے لیے کم "خلل رساں" سمجھ کر میونسپل کمیٹی نے اسے طوائفوں کو الاٹ کر دیا گیا تھا۔ غلام عباس دفتر آتے جاتے وہاں سے گزرتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ پہلے پہل تو ہفتوں زمین ویسے ہی بے آباد پڑی رہی پھر اس نے انگریزی لی راج مزدور آگئے اور جوش تعمیر جنوں کی حدوں کو چھونے لگا۔ یہی تجربہ آنندی میں ہے مگر محض یہ مشاہدہ اس افسانے میں نہیں اور ابھی بہت کچھ ہے، ایسا کہ جسے شاید سہولت سے بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے کا آغاز بلدیہ کے اجلاس کی کارروائی کی رپورٹنگ سے ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں زندگی کے مختلف شعبوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے زنان بازاری کو شہر بدر کیے جانے کے حق میں اپنے اپنے دلائل دے رہے ہیں۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ یہیں بیانیہ ہم پر بازاری کی تجارتی اہمیت اُجاگر کرتا ہے اور مختلف سطحوں پر اس بازار کے عام زندگی میں ذخیل ہونے کی صورتوں کو سامنے لاتا ہے۔ افسانہ ہمیں باور کرا دیتا ہے کہ نئی زندگی کے مرکز میں بازار ہے۔ اسی سے نہ صرف سب مردوں کو، ان کی بہویٹیوں کو بھی گزرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں جاری بحث کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ شریف زادیاں جب آب و باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کا بناؤ سنگھار دیکھتی ہیں تو غریب شوہروں سے فرمائش کرتی ہیں۔ طبیلے کی تھاپ سے زندگی کا وہ بے ہنگم پن خطرے میں پڑ جاتا ہے، جس کے وہ عادی ہیں۔ یہیں ایک پنشن یافتہ معمر رکن کی آواز بھراتے دکھایا گیا ہے جس کا مکان بازار کے وسط میں تھا، اور کسی رکن سے یہ سوال بھی پچھوایا گیا ہے کہ آخر یہ طوائفیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ اس کا جواب سماج کی طرف سے فقط ایک تہقہہ ہے۔ جی، یہ افسانے میں بتا دیا گیا ہے۔ (۵)

بتا چکا ہوں کہ افسانے میں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو غلام عباس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بازاری عورتوں کے مکانات خرید کر انہیں شہر سے چھ کوس باہر ایک ویرانہ الاٹ کر دیا جانا۔ غلام عباس کا قلم یہاں جادو دکھاتا ہے اور زندگی کی تفہیم کرتے ہوئے، جنس کو زندگی کے عین وسط میں متعین کر دیتا ہے حتیٰ کہ ابداء کر پھر سے آدمی اس جنس کو آلائش سمجھتے ہوئے اپنی زندگی، کہہ لیجیے سو کالڈ پاکیزہ زندگی سے کاٹ کر دور پھینکنے کے جتن کرنے لگتا ہے۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے آج کے کارپوریٹ اداروں کی بالادستی کے عہد میں عورت کا پراڈکٹ بن جانا بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگر افسانہ یہ بتا رہا ہے کہ پانسو بیسواؤں میں سے چودہ ایسی تھیں کہ خوب مالدار تھیں اور انھوں نے مکانات بنوانا شروع کر دیے تھے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان بیسواؤں کو کس کی سرپرستی حاصل تھی، گویا سرمایہ بیسواؤں پر سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ اچھا یہ بھی دیکھیے کہ تعمیر کو مزدور، معمار تو آنے ہی تھے مگر حیران کن سلیقے سے غلام عباس نے بتایا ہے کہ وہاں سب سے پہلے اللہ کا نام بلند ہوا۔ حُسن آباد، جسے بعد میں حسن آباد کا نام دینے کی کوشش کی گئی اور جس کا سرکاری نام

”آئندی“ ہوا، اس میں ایک جگہ پر مسجد کے آثار تلاش کر لیے گئے، کنواں بحال ہوا، مسجد بن گئی تو اذان بھی دی گئی۔ ایک امام کی ضرورت تھی کسی گاؤں کا ملا وہاں پہنچ گیا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار بھی وہاں مل گیا تھا۔ اس کی پھوٹی قسمت جاگ اٹھی، ایک لمبا تڑنگا مست فقیر آگیا، پیر کرک شاہ کی جلالی کرامات کا ذکر ہونے لگا۔ گویا اللہ کے نام پر حسن آباد، آباد ہو رہا تھا۔ ایک بڑھیا ایک لڑکے کے ساتھ مسجد کے قریب ایک درخت تلے گھٹیا سگریٹ، بیڑی چنے اور گڑ کی مٹھائیوں کا ٹھیلہ لگا کر بیٹھ گئی۔ مذہبی وسائل، عورت اور پسا ہوئے سماج کے کارکن، سب ہی بازار کی بھٹی کا ایندھن بننے لگے۔ بوڑھا شربت لگا کر بیٹھ گیا، سری پائے والا آیا اور خر بوزے والا بھی۔ خوائے والا کبابی، تندور والا، شہر کے شوقین، لپے لفنگے سب وہاں پہنچ گئے۔ رونق بڑھتی گئی، چھ مہینے میں چودہ مکان بن گئے، ہر مکان کے نیچے چار چار دکانیں، بدھ کو نیاز دلوائی گئی دیکیں پکیں، شامیانے کرسیاں لگیں اور نیا شہر بس گیا، میسوائیں، بناؤ سنگھار قرض و سرود، ناز نخرے، شراب کی بوتلیں۔ دکانوں پر کرائے دار آگئے۔ پہلے تھیٹر کیل کمپنی نے تمبو لگائے پھر وہاں سینما بنا، ڈاکخانہ، بینک، اسکول، ریلوے اسٹیشن، جیل، کچہری۔ تو یہ ہے وہ سارا ہنگامہ جو غلام عباس نے اس افسانے میں دکھایا ہے (۶) اور اسی سے یہ کتبہ بھی بہت سلیقے سے بچھا دیا ہے کہ زندگی کو اسی دائرے میں گھومنا ہوتا ہے اور اسی دائرے میں گھومتے رہے گی۔

آپ نے دیکھا کہ اس افسانے میں پورا سماج کہانی کا کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں، اس کا امکان رہتا ہے کہ پڑھنے والا تفصیلات سے اکتا کر اس سے الگ ہو جائے۔ اس کا احساس غلام عباس کو تھا، لہذا انھوں نے اپنی جزئیات نگاری میں ایسے ایسے پہلو رکھ دیے ہیں کہ بیانیہ توجہ کھینچے رکھتا ہے۔ ایسا ہی قریبہ ہم غلام عباس کے ایک اور افسانے ”کتبہ“ (۷) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شہر سے باہر ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ یوں دکھایا جاتا ہے، جیسے کسی ڈرامے کا لانگ شارٹ لیا جا رہا ہو۔ گرمی کے زمانے کا منظر نامہ پوری طرح نگاہوں میں گھوم جاتا ہے اور ہم کھلی آنکھ سے کڑکوں، ریپکارڈ کیپروں، اکاؤنٹنٹوں، ہیڈ کڑکوں، سپرینڈنٹوں غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجے کے کڑکوں کو سیلاب کی صورت ایک بڑی سی سڑک پر اُمنڈتا دیکھ سکتے ہیں۔ اسی میں سے کہانی کا مرکزی کردار چپکے سے برآمد ہو کر اپنی شناخت مکمل کرتا ہے۔ جی اس سیلاب سے ایک چھینٹ کی صورت الگ ہونے والا کردار درجہ دوم کا کلرک شریف حسین۔ وہ ایک تانگے میں سواری کی گنجائش دیکھ کر لپک کر اس میں سوار ہوتا ہے۔ شہر کی جامع مسجد کی ا طرف میں لگا کہنہ فروشوں اور سست مال بیچنے والوں بازار اس کی منزل ہے۔ اسے وہاں سے کچھ خریدنا نہیں ہے، اس کی بیوی بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی ہے۔ پانچ کا نوٹ اور کچھ آنے اس کی جیب میں بچے ہوئے، اور وقت گزاری کے لیے یہی اُسے بازار میں لے آئے ہیں۔ غلام عباس محض ایک دو کرداروں سے کہانی نہیں بنتے وہ تو زندگی کا سارا ہنگامہ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی کباڑیوں کی دکانوں کا منظر، بیڑیاں، گراموفون کے کل پرزے، آلات جراثیمی، ستار، بھس بھرا ہرن، بدھ کا نیم قد مجسمہ، سب اسی زندگی کے مظاہر ہیں۔ یہیں ایک دکان پر سنگ مرمر کے کڑکوں پر درجہ دوم کے کلرک کی نظر پڑتی ہے اور اس کی زندگی میں اول درجے کے خواب داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسے خواب ہیں جو اُسے پچھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ صارفی نفسیات کے تحت درجہ دوم کا آدمی اول درجے

کے نام نہاد خواب کس جھانے میں آکر بلا ضرورت خرید لیا کرتا ہے، اسے سمجھے کے لیے افسانے کا وہ حصہ پڑھیے جس میں مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑے ہوئے، سوافٹ ایک فٹ کے ٹکڑے کو شریف حسین دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ نفاست سے تراشے ہوئے اس مرمر کے ٹکڑے کی قیمت محض تین روپے ہے۔ قیمت مناسب تھی کہ اُس کی جیب میں پانچ روپے اور کچھ آنے تھے مگر وہ رکھ کر چل دیا کہ اس کی ضرورت کی چیز نہ تھی۔ مارکیٹ اپنے شکار کو اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دیتی، اس اکانومی کی بنیاد یہی ہے کہ اپنے صارف کی ضرورتوں کا تعین، صارف کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تو یہ اصول یہاں کام کر رہا تھا۔ شریف حسین نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا ”ہم ایک روپیہ دیں گے“۔ جواب آیا ”سوا بھی نہیں“ اور اس سے پہلے کہ گاہک نکل جاتا مارکیٹ کا فیصلہ آگیا ”لے جائیے“۔ تو یوں ہے کہ شریف حسین کی ضرورت کا تعین مارکیٹ نے کر دیا تھا اور وہ ایسا پتھر لے کر گھر آگیا، جس کی اُسے ضرورت نہ تھی، مگر اب اس کی زندگی میں اول درجے کا خواب بن کر دخیل ہو گیا تھا۔ سنگ مرمر پر شریف حسین نے اپنا نام کندہ کروایا اور رات کھلے آسمان تلے لیٹ کر ایسے ذاتی مکان کے خواب دیکھے جس کے صدر دروازے پر یہی نام والا کتبہ نصب ہونا تھا، مگر ہوا یہ کہ وہ مر گیا اور اُس کی قبر پر یہ کتبہ لگا۔

یاد رہے کہ دلی میں سرکاری ملازمین کے کوارٹروں میں غلام عباس رہا کرتے تھے اور اس افسانے کے آغاز کا منظر وہیں کا ہے۔ یہ کوارٹر کنٹ پلس نئی دلی کے نواح میں گورنمنٹ نے بنوائے تھے اور بقول غلام عباس، ایک مرتبہ وہ مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ تانگے پر حوض قاضی سے فتح پوری جا رہے تھے کہ انھیں ایک سنگ تراش کی دکان پر ایک پتھر نظر آیا جس پر بس ایک نام لکھا ہوا تھا۔ اسی سے انھیں لکھنے کا یہ خیال سوچا تھا۔ اس خیال کو انھوں نے محض سادہ سی کہانی میں نہیں رکھا، ایک افسانے میں ڈھال کر ہمیں زندگی کی گہری معنویت بھی سمجھا دی ہے، ایسی معنویت جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔

غلام عباس کے معروف افسانوں کے حوالے سے کہا جاتا رہا ہے کہ اُن کے بنیادی خیال ماخوذ تھے۔ خود غلام عباس چوں کہ تراجم کرتے رہے، اس باب میں ٹالسٹائی کے The Long Exile اور واشنگٹن ارونگ کے Tales from Alhambra سے علمی ادبی حلقوں میں توجہ بھی پائی (۸)۔ پھر وہ کچھ افسانوں کے بارے میں، خود بھی کہا کرتے تھے کہ وہ ماخوذ ہیں، جیسے ”جزیراں سنخواراں“ (۹)۔ یوں ان افسانوں کے بارے میں دُھند بڑھتی چلی گئی۔ غلام عباس نے اپنے بیانات میں اس دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن مقامات کو نشان زد کیا ہے، جہاں سے انہیں یہ افسانے سوچھے۔ ایسے ہی افسانوں میں سے ایک ”اوور کوٹ“ ہے۔ آصف فرخی کو انٹرویو دیتے ہوئے غلام عباس نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ وہ تاثیر، فیض اور پطرس کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلے اور وہ بھی یوں کہ جلدی میں شبِ خوابی کے لباس پر اوور کوٹ پہن لیا اور معقول صورت نظر آنے کے لیے گلے میں گلو بند لپیٹ لیا۔ پطرس گاڑی چلا رہے تھے اور باتوں باتوں ایسی گرم جوشی پیدا ہوئی کہ سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکراتے ہوئے بچی۔ بس اسی سے انہوں نے سوچا تھا کہ اگر ٹکڑا ہوگئی ہوتی اور ہسپتال جا کر اُن کا اوور کوٹ اتارا جاتا تو کیا ہوتا (۱۰)۔ خیر معاملہ کوئی بھی ہو میرے لیے

افسانہ ”اور کوٹ“ (۱۱) محض ایک واقعہ نہیں رہا، زندگی کرنے کے ایک قرینے کی علامت ہو گیا ہے۔ خوش پوش نو جوان کی جگہ ہم اپنے اپنے آپ کو رکھ کر دیکھیں، تو میری بات پوری طرح واضح ہوتی چلی جائے گی۔ غلام عباس نے بھی اس نو جوان کا پہلے لانگ شارٹ لیا ہے، اور پھر اس پر فوکس کرتے گئے ہیں؛ یوں کہ منظر نامہ کہانی سے کہیں بھی منہا نہیں ہوتا۔ کہانی کو علامت بنانے کا یہ قرینہ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں لکھنے والوں کی دسترس سے دور رہا حالانکہ غلام عباس اس بابت بہت کچھ بھگائے تھے۔ پلاٹ، کردار، منظر، ماحول اور کہانی کسی بھی عنصر کی تخفیف کے بغیر ایک علامتی کہانی لکھ دینا ممکن تھا اور ممکن ہے۔ میں نے اس افسانے سے یہی سیکھا ہے۔ بادامی رنگ کا اور کوٹ، کاج میں شریقی رنگ کا گلاب کا پھول، سر پر سبز ہیٹ، سفید سلک کا گلو بند اور چال میں بائکین؛ یہ ہے مرکزی کردار۔ یہاں کردار کا نام نہیں بتایا گیا ہے، جیسا کہ بعد میں کرداروں کو بے نام رکھنے کا چلن ہوا، مگر لطف یہ ہے کہ اس کردار کی شناخت قائم کی گئی ہے۔ اس کا طبقہ اور اس کے خواب، اس کی حسرتیں اور تمنائیں سب ہم پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ڈیوس روڈ سے مال پر اور وہاں سے چیرنگ کراس، ہاتھ میں چھڑی جسے بعد میں اس کے وجود سے الگ ہو جانا ہے، ٹیکسی والے لے کر آنا اور اس کا ”نو تھینک یو“، کہہ کر آگے نکل جانا، ادھ کھلا پھول تھوڑا سا اچھل کر کوٹ کے کاج سے باہر کیوں نکل آیا تھا، اور اسے واپس کاج میں جھاتے ہوئے نو جوان کے ہونٹوں پر خفیف سی اور پراسراری مسکراہٹ کیوں پھیل گئی تھی، اس سب کے کچھ معنی ہیں، مگر غلام عباس نے ایک ایک سطر کے معنی بعد میں ظاہر کرنے کے لیے سینت سینت کرمتن کے اندر چھپا کر رکھ دیے ہیں۔ افسانہ ایک اور جست بھرتا ہے، ایک اور نو جوان، اپنی فربہ جسم والی دوست لڑکی کے ساتھ اسی کھلے منظر نامے میں داخل ہوتا ہے، جو اپنی دوست کو سمجھا رہا ہے کہ وہ فکر نہ کرے ڈاکٹر اس کا دوست ہے، کسی کو کانوں کا خبر نہ ہوگی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

زندگی میں سب کچھ ٹھیک کہاں ہوتا ہے۔ غلام عباس نے اپنے اس افسانے میں یہی بتایا ہے اور یہ بھی کہ ہم ہر لمحے اپنے اندر کے عذاب اور اپنی غلاظتیں چھپانے کے جتن کرتے رہتے ہیں، مگر وہ چھپتے نہیں ہیں۔ ہم اس حقیقت کو بھول کر آگے بڑھتے ہیں اور اگلا لمحہ ہمارے باطن کو اندوھا کر سامنے رکھ دیتا ہے؛ یوں جیسے اس مست اور چیخ لڑکے کو کچل ڈالنے والے ٹرک کے زن سے گزر جانے اور شدید زخمی لڑکے کے ہسپتال میں آپریشن تھیٹر پر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے۔ باہر سے خوشنما رپیر میں لپٹی ہوئی زندگی کا اصل چہرہ یہی ہے جو ہم اسے وقفے وقفے سے چونک چونک کر دیکھنے پر مجبور ہیں۔ بہ ظاہر اس کہانی کا منظر نامہ قدیم ہے مگر اپنی معنویت کے اعتبار سے یہ آج کی کہانی ہے۔

ایسا ہی ہم ”فینسی ہیئر کٹنگ سیلون“ (۱۲) کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ تو آج کے اس وزیر خزانہ کی کہانی لگتی ہے، جس کے گھر سے حکومتی خزانہ برآمد ہو گیا تھا اور اس حکومتی سربراہ کی بھی جو ہمیں خواب دکھا کر اپنی سرمایہ کاری کا حجم بڑھائے چلا جاتا ہے۔ غلام عباس نے ایسا کیا ہے کہ تقسیم کے بعد کے زمانے میں، ایک چھوٹی سی چائے کی دکان پر چار جاموں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ انہیں ایک ہیئر کٹنگ سیلون الاٹ کروا دیا، جو تقسیم سے پہلے چالو تھا، مگر مالک کے ادھر چلے جانے کی وجہ سے اب اجڑا پڑا ہے۔ پھر چاروں کے بیچ

ایک خستہ ہال نشی لا بٹھایا۔ یہ چالاک نشی آج کی سیاست کا مرکزی کردار ہو گیا ہے۔ تو یوں ہے کہ ہم اسی نشی کے رحم و کرم پر ہیں۔ لیجیے صاحب اب ایک قدرے مختلف افسانہ۔ جی، میں غلام عباس کے افسانے ”ہمسائے“ (۱۳) کا ذکر کرنے جا رہا ہوں۔ اگرچہ اس افسانے کا بیانیہ بھی دھیمہ ہے مگر ہر منظر قاری پر یوں کھلتا ہے جیسے ہر منظر کو الگ سے فلما کر، اور اس کے فالتو حصے کاٹ کر باہم جوڑ لیا گیا ہو۔ منظر ایک پہاڑی پر کھلتا ہے، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں پہاڑی کی ڈھال پر ایک الگ تھلگ مکان ہے۔ جس طرح میں بیان کر رہا ہوں وہاں منظر منظر اس طرح لکھا ہوا نہیں ہے، بس پڑھتے ہوئے جو ذہن کے پردے پر تصویر بنتی ہے، اس کی ترتیب لگ بھگ ایسی ہی ہے۔ اس مکان کو لکڑی کی پتلی سی دیوار سے دو گھروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ کہانی ان گھروں میں بسنے والے دو الگ خاندانوں کی نہیں ایک بچے کی ہے جس کا دل محبت کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ گرمی کا زمانہ، لکڑی کا لمبا سا زینہ، بے توجہی کی شکار پھلواری کا اکیلا پھول، نیلی دھند میں بسا منظر، جیسے پانی میں عکس اور پھر اس منظر کا بدل جانا۔ اسی سے کہانی کا مزاج بدلتا ہے۔ آٹھ نو برس کا اکبر اپنے گھر سے نکلتے ہی کہانی کے منظر نامے کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اس کا بے اختیار ساتھ والے گھر کو یوں دیکھنا، جیسے وہ مٹھائی یا کھلونوں کی ایسی دکان ہو جو دکاندار اپنی کابلی کی وجہ سے وقت پر نہیں کھول پاتا۔ پھول توڑنا، اور ساتھ والے دروازے تک جانا، جھک کر پھول پیچھے چھپانا، پھر بے دھیانی میں اس کی ایک پتی نوچ لینا، پھر جاننے بوجھتے ایک ایک پتی نوچتے چلے جانا، یہ سب اس کے دل کی تصویریں ہیں۔ مگر یہ تصویریں یوں بدلتی ہیں جیسے اس پہاڑی مقام کا موسم، کبھی بادل پیازی رنگ کے ہو جاتے ہیں، کبھی پھوار برسنے لگتی ہے۔ ابھی ابھی دور اس سکول کا منظر صاف نظر آ رہا تھا جو گر جا گھر جیسا تھا، سکول بھی اور وہ مکان بھی جس کی انگنائی میں ایک عورت دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر پھیلا رہی تھی، کہانی کے آخر میں پہنچ کر کچھ بھی نظر نہیں آتا زمین اور آسمان پر ایک سیاہ چادر تن جاتی ہے۔ سب کچھ اس میں لپٹنے لگتا ہے، انسان، حیوان، شجر، حجر، اور اکبر بھی۔ صرف ننھے اکبر کا جسم نہیں اُس کی روح کو بھی۔ تو یوں ہے کہ غلام عباس نے اس کہانی کا بیانیہ اتنا پر لطف بنا دیا ہے کہ وہ ہماری روح سے کلام کرنے لگتا ہے۔

غلام عباس نے افسانوں کے تین مجموعے دیے (۱۴)، ان میں موجود ہر افسانے پر بات ہونی چاہیے مگر اس نشست میں ایسا ممکن نہیں ہے لہذا مجھے کہیں اپنی بات روک دینی ہے؛ یہیں روک سکتا ہوں مگر میرا دھیان محمد حسن عسکری کے ایک خط کی طرف چلا گیا ہے جو ۱۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ کو انھوں نے غلام عباس کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں عسکری نے جو لکھا اُنھی کے لفظوں میں مقتبس کر رہا ہوں:

”آپ نے ”اردو ادب“ کو جو افسانہ دیا ہے وہ منٹو کو بہت پسند آیا ہے۔ وہ تو ایک دن یہاں تک کہنے لگے کہ بس

عسکری صاحب میں تو افسانہ نگار ہوں ہی نہیں، اس افسانے کے سامنے میرا افسانہ ”کالی شلوار“ بکواس ہے۔ غرض

وہ آپ کے افسانے کی اکثر تعریف کرتے رہتے ہیں“ (۱۵)

کیا منٹو نے واقعی ایسا کہا ہوگا، یقین نہیں آتا مگر منٹو نے ۳ نومبر ۱۹۴۸ کو غلام عباس کو اپنے خط میں جو لکھا اُس کا یقین کرنا

ہی پڑے گا کہ یہ راست حوالہ ہے۔ منٹو نے لکھا تھا:

”تمھارا افسانہ ”دوسری بیوی“ (شاید عنوان کچھ اور ہے) خوب تھا۔“ (۱۶)

اور یہ بھی اضافہ کیا تھا: ”تمھارے قریب قریب سارے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں۔“ (۱۷)

منٹو کا خدشہ درست تھا، انھیں افسانے کا درست نام یاد نہ رہا تھا۔ جسے وہ ”دوسری بیوی“ لکھ گئے وہ ہونہ ہوا افسانہ ”اُس کی بیوی“ (۱۸) تھا۔ غلام عباس نے اسی قبیل کا ایک اور افسانہ بھی لکھا تھا؛ ”سمجھوتہ“ (۱۹)، وہی جس میں بھاگ جانے والی بیوی کے ایک روز خستہ حالت میں واپس آنے کو غلام عباس نے ایسے لفظوں میں لکھا کہ پڑھتے ہوئے مجھے ابکا ئی آگئی تھی۔ انھی کے الفاظ مقتبس کرتا ہوں: ”جیسے کتیا کیچڑ میں دوسرے کتوں کے ساتھ لوٹ لگا کر آئی ہو“ (۲۰)

مجھے یہ جملہ پڑھ کر شدید دکھ ہوا تھا۔ یہ جملہ اور اس سے بھی ایک اور شدید جملہ جو اسی افسانے میں پہلے پڑھا آیا تھا، جی وہی، جس میں اسی کردار سے کہلوا یا گیا ہے کہ: ”عورت کے معاملے پر سنجیدگی سے غور حماقت ہے“ (۲۱)

یہ ایسے جملے ہیں جو مجھے غلام عباس کے اس افسانے سے پرے دھکیل دیتے ہیں حالانکہ ایسا سوچنے والا، جو اس کہانی کا مرکزی کردار بھی ہے، خود جنسی کیچڑ میں لوٹ لگانے کے بعد واپس اپنی بیوی کے پاس لوٹ آتا ہے، اُسی بیوی کے پاس جو اس کی نظر میں باعصمت نہیں تھی۔ خیر، منٹو بھی اس افسانے کو کیسے پسند کر سکتے ہیں تاہم مجھے یقین ہے جس افسانے کو منٹو نے پسند کیا ہوگا، وہ ”اُس کی بیوی“ ہی ہوگا۔ صاحب، عجیب و غریب کہانی ہے یہ، ایک نوجوان، نسرین نامی طوائف کے کوٹھے پر موجود ہے اور بات بے بات اپنی مرحومہ بیوی نجمہ کو یاد کر رہا ہے۔ نسرین کے چہرے پر خفیف سا اضمحلال ہے اور وہ سوچ رہی ہے کہ کیسا مرد ہے جس کے پاس اپنی مرحومہ بیوی کے سوا کوئی اور موضوع ہی نہیں ہے۔ افسانے سے سچ سچ آگے بڑھتا ہے اور اس افسانے میں بیوی کا کردار نبھانے والی عورت بھی افسانہ ”سمجھوتہ“ والی بیوی کی طرح بے وفائکتی ہے مگر پڑھتے ہوئے کہیں اکتاہٹ نہیں ہوتی، حتیٰ کہ خریدے گئے بچے کچھ وقت میں پڑنے والی رات کے پچھلے پہر اچانک اپنی بے وفا بیوی کو یاد کرنے والا نوجوان سوتے میں سکی لیتا ہے اور ایک طوائف اسے چھاتی سے یوں چٹا لیتی ہے جیسے کوئی بچہ سوتے میں ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چٹا لیا کرتی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر مجھے دہرائینے دیجیے کہ غلام عباس کی اُن تخلیقی توفیقات کا اندازہ کیے بغیر جو اُن کے افسانے کو سیدھی سادی کہانی سے مختلف کر دیتی ہے، اُن کی حقیقت نگاری کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ زمان کے بہاؤ میں رخنے ڈالے بغیر ایسے قرینے سے کہانی لکھنا کہ اس کی جزئیات میں جادو بھرتا چلا جائے، یہ غلام عباس کی توفیقات کا ایسا علاقہ ہے جس نے انھیں اپنے ہم عصروں میں مختلف کیا اور ممتاز بھی۔ اور یہی سادہ مگر جادو بھرا قرینہ ہے کہ جس کے سبب غلام عباس اردو افسانے کا ایک مستقل باب ہو گئے ہیں۔

حوالہ جات اور حواشی

۱۔ غلام عباس، افسانہ ”اُس کی بیوی“، مشمولہ مجموعہ ”جاڑے کی چاندنی“، طبع اول، ۱۹۶۰ء، عباد اینڈ کامران پبلشرز، کراچی

۲۔ غلام عباس، افسانہ ”ہمسائے“، مشمولہ مجموعہ ”آئندہ“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور

- ۳۔ غلام عباس، افسانہ ”چکر“، مشمولہ مجموعہ ”آئندی“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور
- ۴۔ سویامانے یاسر، ”غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ“، طبع اول ۲۰۰۴ء، سنگ میل، لاہور
- ۵۔ سویامانے یاسر، ”غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ“، طبع اول ۲۰۰۴ء، سنگ میل، لاہور
- ۶۔ غلام عباس، افسانہ ”آئندی“، مشمولہ مجموعہ ”آئندی“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور
- ۷۔ غلام عباس، افسانہ ”کبتہ“، مشمولہ مجموعہ ”آئندی“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور
- ۸۔ سویامانے یاسر، ”غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ“، طبع اول ۲۰۰۴ء، سنگ میل، لاہور
- ۹۔ غلام عباس نے ”جزیرہ سخوراں“ آندرے مورووا کی طنزیہ تصنیف سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اکادمی ادبیات پاکستان سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والی کتاب ”اردو افسانے کی روایت“ میں لکھا ہے کہ ”پہلے یہ کتاب ہفتہ وار ”شیرازہ“ میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔ ”جزیرہ سخوراں“ پہلی بار کتب خانہ ہزار داستان، جدید پریس دہلی سے شائع ہوئی تھی۔
- ۱۰۔ یہ تفصیلات غلام عباس نے اپنے ایک انٹرویو میں آصف فرخی کو بتائیں۔ یہ انٹرویو آصف فرخی کی کتاب ”حرف من و تو“ میں شامل ہے جو پہلی بار ۱۹۸۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔
- ۱۱۔ غلام عباس، افسانہ ”اودر کوٹ“، مشمولہ مجموعہ ”جاڑے کی چاندنی“، طبع اول، ۱۹۶۰ء، سجاد اینڈ کامران پبلشرز، کراچی
- ۱۲۔ غلام عباس، افسانہ ”فینسی ہیئر کنگ سیلون“، مشمولہ مجموعہ ”جاڑے کی چاندنی“، طبع اول، ۱۹۶۰ء، سجاد اینڈ کامران پبلشرز، کراچی
- ۱۳۔ غلام عباس، افسانہ ”ہمسائے“، مشمولہ مجموعہ ”آئندی“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور
- ۱۴۔ غلام عباس نے جو تین افسانوں کے مجموعے ”آئندی“، مطبوعہ ۱۹۴۸ء، ”جاڑے کی چاندنی“، مطبوعہ ۱۹۶۰ء، اور ”کن رس“، مطبوعہ ۱۹۶۹ء ہیں۔
- ۱۵۔ محمد حسن عسکری کے اس غیر مطبوعہ خط کا حوالہ سویامانے یاسر نے اپنی کتاب ”غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ“ میں صفحہ ۶۴ پر دیا ہے۔ یہ خط ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا تھا۔ ان دنوں غلام عباس مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات میں کرنل مجید ملک کے ماتحت اسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ عسکری صاحب نے اس خط میں سلیم احمد کی نوکری کے لیے بھی سفارش کی تھی۔ ”صاحب ایک چھوٹا سا کام ہے۔ وہ یہ کہ میرے ایک دوست اور شاگرد ہیں سلیم احمد۔ ویسے وہ شاعر بھی ہیں، تو وہ کچھ روزگار قسم کی چیز چاہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کراچی ریڈیو سے انہیں ڈراموں میں پارٹ یا کوئی اور کام، بچوں کے فچر وغیرہ کا کام مل جائے؟ انہیں لکھ رہا ہوں کہ آپ سے جا کر ملیں۔ آپ ان سے زبانی بات کر لیں۔“
- ۱۶۔ سویامانے یاسر، ”غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ“، طبع اول ۲۰۰۴ء، سنگ میل، لاہور
- ۱۷۔ ایضاً
- ۱۸۔ غلام عباس کا افسانہ ”اس کی بیوی“، ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ”جاڑے کی چاندنی“ میں شامل ہے۔
- ۱۹۔ افسانہ ”سمجھوتہ“، غلام عباس کے افسانوں کے پہلے مجموعے ”آئندی“ میں شامل ہے۔
- ۲۰۔ غلام عباس، افسانہ ”سمجھوتہ“، مشمولہ مجموعہ ”آئندی“، طبع اول، ۱۹۴۸ء، مکتبہ جدید، لاہور
- ۲۱۔ ایضاً



اردو تنقید کے وسطی دور کا رنگ و آہنگ

جدید اردو تنقید کا باضابطہ آغاز تو ”مقدمہ“ (۱۸۹۳ء) ہی سے ہوتا ہے، مگر تاریخی اعتبار سے اولیت کا شرف محمد حسین آزاد کو حاصل ہے۔ اپنے انقلابی تنقیدی موقف کا اظہار انھوں نے ”مقدمہ“ سے ۲۶ برس پہلے یعنی ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں کیا تھا۔ اسی طرح ”آب حیات“ ۱۸۸۰ء میں اور ”سخن دانِ فارس“ کا پہلا حصہ ۱۸۷۶ء میں منظر عام پر آچکا تھا۔ حالی کی اولیت اس بات میں ہے کہ اردو میں نظری تنقید کا آغاز ان سے ہوتا ہے۔ اسی طرح عملی تنقید کی بنیادیں بھی حالی ہی نے فراہم کیں۔

جدید اردو تنقید کو مزاج کے اعتبار سے چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ابتدائی جدید تنقید، وسطی جدید تنقید، جدید تنقید اور مابعد جدید تنقید۔ ”آب حیات“ میں بات تذکرہ نگاری سے آگے بڑھ کر جدید اردو تنقید کی سرحدوں کے قریب جاتی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم جدید اردو تنقید کی باضابطہ ابتدا ”مقدمہ“ سے ہوتی ہے۔ زیر نظر مقالے میں جدید اردو تنقید کے دوسرے پڑاؤ کا جائزہ پیش کی نوآبادی بننے کے بعد عظیم میں تہذیبی انقطاع کا آغاز ایک فطری عمل تھا۔ رفتہ رفتہ ہم اپنی ادبی روایت سے کلتے گئے، یہاں تک کہ اس کا بڑا حصہ ہمارے لیے اجنبی بلکہ مضحکہ خیز بنتا گیا۔ نوآبادیاتی دور کی ضرورت کے مطابق نئی تعلیمی پالیسیاں بنیں اور نئی بوطیقا کی تیاری کی ضرورت محسوس ہوئی اور وقت نے ثابت کیا کہ غلبہ بالآخر اسی بوطیقا کا ہوا، جس کا آغاز محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور امداد امام اثر سے ہوتا ہے۔ تاہم اس دور میں تنقید بطور ڈسپلن قائم نہیں ہوئی۔

آزاد اور حالی ۱۸۵۷ء کے بعد والی صورت حال سے شدید متاثر تھے اور سرسید تحریک کے روح رواں۔ اسی لیے کچھ عرصہ سے آزاد اور حالی کی تنقید اور ان کی اصلاحی کوششوں کا نوآبادیاتی پس منظر میں جائزہ لینے کا رجحان ہوا ہے۔ آج زمانی بُعد کے باعث ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ آزاد اور حالی کی تنقیدات کے باعث ہم نے اپنے تہذیبی ورثے سے انصاف نہیں کیا اور مغربی معیارات سے اپنے اپنے آپ کو جانچا۔ ابتدائی جدید تنقید کے دور رس اثرات کے بارے میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن مختصر اُیوں بیان کرتے ہیں:

”آزاد، حالی اور شبلی، اردو کی جدید ادبی تنقید میں اپنی اپنی تین عہد آفرینی کتب کے ساتھ

معیاری اور قواعدی (Normative) اصول کار بن گئے ہیں۔ آب حیات نے جو

ادواری طریقہ کار اختیار کیا، شاعری کے عروج و زوال کے جو اصول دیئے۔۔۔ وہ بعد کے

مورخین ادب کے لیے معیاری نمونہ بن گئی۔ مقدمہ شعر و شاعری نے اصنافِ سخن اور مضامین

شاعری کے لیے جو معیارات قائم کیے وہی بعد میں بھی سند ٹھہرے۔ اسی طرح برصغیر

ہندوستان میں فارسی شاعری نے جو منفرد اسلوب اختیار کیا، جسے سبکِ ہندی کا نام دیا جاتا

ہے، شعرالجم میں اس کے بارے میں جو ناپسندیدگی اور کم نگری کا رویہ اختیار کیا گیا ہے، وہی

بعد کی تاریخ میں اس کا معیاری درجہ قرار پایا۔“ (۱)

اردو افسانے کی طرح اردو تنقید کو بھی آغاز میں ہی ایسے توانا افراد میسر آ گئے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے اپنی شناخت بنانا اور پھر قائم رکھنا ایک بڑا چیلنج بن گیا۔ مذکورہ بالا تین بڑے ناموں کے فوری بعد نقادوں کی ریل پیل نظر آتی ہے، مگر آج وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں، مباحث کا نہیں۔ اس دور کا سب سے بڑا مثبت پہلو فن تنقید کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے، تنقید کا دائرہ کار، اس کی اہمیت، تقابلی مطالعہ، اور تنقید بطور ڈسپلن کی اہمیت ایسے پہلو ہیں جن پر خصوصی توجہ دی گئی، اگرچہ یہ اور دیگر بحثیں چند انگریزی نقادوں کی مخصوص تحریروں بلکہ بعض اوقات چند جملوں کو مد نظر رکھ کر کی گئیں۔ اسی لیے ایک ہی مضمون یا کتاب میں متضاد باتیں بھی کہہ دی گئیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ اب حوالوں میں مغربی نقادوں کے ناموں میں کافی اضافہ ہو گیا۔ مغربی نقادوں اور ادب سے ذہنی مرعوبیت پہلے جیسی رہی۔ علامہ نیاز فتح پوری ہوں، محی الدین قادری زور، حامد اللہ افسر، یا عبدالقادر سروری، سب ہی مغربی نقادوں کے اقوال زریں پیش کرتے رہے۔ تاہم ان تمام کے ہاں مشرق و مغرب کے ’امتزاج‘ کی ابتدائی صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے وحید الدین سلیم، امداد امام اثر اور مہدی حسن افادی کے لیے ”مبتدعین“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالی، آزاد اور شبلی کے باعث تنقید میں ایک عمومی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ ادب میں اب ان تین حضرات سے معاملہ کیے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ ان کے فوری بعد ایک ایسی فضا بن چکی تھی جس میں ان سے اختلاف کرنا مشکل تھا۔ شاید اسی باعث کوئی اور پینل دماغ پیدا نہ ہو سکا۔

تنقید پر وحید الدین سلیم کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں ہے۔ ان کے مضامین کے مجموعے ”افادات سلیم“ میں بکھرے ہوئے تنقیدی افکار مل جاتے ہیں۔ وہ سرسید اور حالی سے بہت متاثر تھے۔ شاعری کو صرف قافیہ پیمائی نہ سمجھتے تھے، اسی لیے ان کے اندر غزل کے خلاف رد عمل تھا، تاہم فن شعر کے حوالے سے انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔

مہدی افادی مغربی ادب اور تنقید سے متاثر تھے لیکن حالی کی بجائے ان پر شبلی کا زیادہ اثر تھا۔ اسی لیے ان کے ہاں ذوقی اور وجدانی رجحان کا غلبہ ہے۔ مہدی افادی نے بھی تنقید پر کوئی کتاب تحریر نہیں کی۔ ان کے تنقیدی نظریات ان کے مجموعے ”افادات مہدی“ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان تینوں کے مقام کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی بہت اچھا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”یہ ٹھیک ہے کہ ان میں سے کوئی اتنا بڑا نقاد نہیں تھا کہ جس کی تنقید کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑتے۔۔۔ کسی

نئے رجحانات کی ابتداء ہوتی، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ عہد تغیر کے نقادوں کا تتبع کرنے والے تھے۔ انھوں نے

اپنی طرف سے بہت کم اضافہ کیا لیکن چونکہ انھوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا جو عہد تغیر کی تنقید سے شروع ہوا تھا

اور اس فضا کو برقرار رکھنے میں مدد کی جو اردو تنقید میں پیدا ہو گئی تھی۔“ (۲)

مہدی افادی نے متفرق موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ادبی معاملے میں وہ زیادہ تر معاصر ادب سے متعلق رہے۔ ان کے یہ تین

مضامین آج بھی اہمیت رکھتے ہیں: ”اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ“، ”شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر“ اور ”حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک“۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو تنقید کی عمومی فضا کو 'احد و ترجمے' سے عبارت کہا جاسکتا ہے، جبکہ ادبی تنقید میں حقیقی تراجم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ البتہ مغربی شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے خیالات کو اپنے شاعروں کی تنقید کے سلسلے میں پیش کیا گیا۔ اس رجحان کے نمائندہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری تھے۔ غالب پر ان کی مشہور تنقیدی تحریر 'محاسن کلام غالب' ان کے انتقال کے بعد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ وہ غالب کا موزانہ مشرق و مغرب کے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے کرتے ہیں اور اس طرح غالب کی عظمت ثابت کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کو تقابلی اور تاثراتی کہا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں جذباتیت کا غلبہ ہے، جس کا اندازہ دیوان غالب کے بارے میں ان کے مشہور جملے سے لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی 'روح تنقید' (۱۹۲۷ء) ان کے انگریزی ادب اور تنقید کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے اسی طرح حامد اللہ افسر کی 'نقد الادب' میں پیش کردہ خیالات مغربی مفکرین اور نقادوں سے مستعار ہیں۔ یہی حال عبدالقادر سروری کی 'دنیاۓ افسانہ' کا ہے جس کے متعلق کلیم الدین احمد اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں:

''۔۔۔ روح تنقید'' کی طرح ''دنیاۓ افسانہ'' بھی کچھ قدر قیمت نہیں رکھتی۔۔۔ اس میں افسانہ کے ظاہر سے بحث کی گئی ہے۔ اس کی روح سے کچھ بھی واقفیت نظر نہیں آتی۔ عبدالقادر صاحب نے افسانہ پر چند انگریزی کتابیں دیکھی ہیں اور ساری باتیں انھی کتابوں سے لی ہیں۔'' (۳)

اردو تنقید کے اس موڑ پر ایک مزاج تحقیق اور تنقید کا ایک ساتھ چلنا بھی ہے۔ ویسے بھی تحقیق تنقیدی شعور کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس انداز کے نقادوں میں مولوی عبدالحق سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد حافظ محمود شیرانی، پنڈت کیفی، محی الدین قادری زور، حامد حسن قادری، اور سید سلیمان ندوی کے نام اہم ہیں۔

عظمت اللہ خان اپنے دور کے جدید تعلیم یافتہ اور انگریزی ادب کے دلدادہ نوجوان تھے۔ 'سریلے بول' کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا جس کے دیباچے میں انھوں نے اردو شاعری پر کم و بیش وہی اعتراضات اٹھائے جو حالی پہلے اٹھا چکے تھے۔ عظمت اللہ ۱۸۸۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، یعنی ۱۸۵۷ء سے تیس برس بعد۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوآبادیاتی نظام اپنے پورے عروج پر تھا۔ اور 'نئی روشنی' سے مرعوب پہلی نسل سامنے آچکی تھی۔ عظمت اللہ کو علی گڑھ تحریک کی 'پروٹو ٹائپ پروڈکٹ' کہا جاسکتا ہے۔

وہ صرف غزل کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری اردو شاعری میں اصلاحات بلکہ انقلاب چاہتے تھے اور ان کا رویہ باغیانہ تھا۔ غزل پر ان کا اعتراض ریزہ خیالی اور قافیہ پیمائی کا ہے۔ مجموعی طور پر وہ کوئی نئی بات نہیں کرتے البتہ ان کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ وہ نئی نسل کے نمائندہ تھے۔ 'سریلے بول' کا دیباچہ پہلے ۱۹۲۳ء میں ایک رسالے میں شائع ہوا۔

'سریلے بول' کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ چند ایک ادیبوں کی تحریروں کے علاوہ وہ زیادہ تر اردو ناولوں اور شاعری کو تھوڑا بہت اس لیے پڑھتے تھے کہ دوستوں کی محفل میں اردو تحریروں کا مذاق اڑا سکیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی

اصلاح اور غزل کو جڑ سے اکھیڑنے کی جو بات کی وہ دراصل اردو شاعری کو مغرب کی عینک سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب کو اردو غزل کی مدافعت میں اولیت حاصل ہے۔ ”ہماری شاعری“ ۱۹۲۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں ادیب نے حالی کی طرف سے لگائے گئے اعتراضات کا جواب دیا۔ تاہم ادیب کے تنقیدی نظریات اور انداز تنقید کی تشکیل حالی ہی کے زیر اثر ہوتی ہے کیونکہ ادیب بھی شاعری کو مقصدی سمجھتے ہیں۔ بہر حال ادیب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ”مقدمہ“ کو اس کے پس منظر میں جاننے کی کوشش کی۔ تنقیدی اعتبار سے ”ہماری شاعری“ کو تنقید برتنقید کی اولین باضابطہ کتاب کہا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ”ہماری شاعری“ کے دیباچے سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی نظر کس قدر عمیق تھی:

”ایک طرف تو مغربی تنقید کی کورانہ تقلید نے ہم کو مشرقی مذاق شاعری سے بیگانہ کر دیا، دوسری طرف خواجہ حالی کی اصلاحی تحریک نے قدیم اردو شاعری کے خلاف بدظنی کی فضا پیدا کر دی۔ اُن [حالی] کا مقدمہ اور مسدس پڑھ کر بہت سے لوگ اساتذہ سخن کی سحر کاریوں اور معجزہ نگاریوں کو ہدیان اور خرافات سمجھنے لگے اور قابل اعتراض کلام کے ساتھ مایہ ناز کلام بھی بدظنی اور بد بینی کا شکار ہو گیا۔ اب نئے تعلیم یافتہ طبقے کا یہ حال تھا کہ کوئی شعر کو بے کار چیز اور شاعر کو بیکاری کا مشغلہ سمجھنے لگا، کوئی شعر اور غیر شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو گیا، کوئی اردو شاعری کو اعتراضوں کا نشانہ بنانے لگا۔“ (۴)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے وقت میں جب اردو دنیا میں آزاد و حالی کے ڈسکورس کا غلبہ تھا، ادیب کتنے پختہ تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جدید تنقید کی جن خامیوں کی طرف ادیب نے اشارہ کیا، بعد میں انہی بنیادوں پر سرور، عسکری اور فاروقی نے تفصیلی مباحث اٹھائے۔

ترقی پسند تحریک کے ساتھ جو تصور شعر سامنے آیا وہ ہماری شعری روایت سے مختلف بلکہ متضاد تھا۔ اس کے علاوہ ایک الگ رجحان بھی پیدا ہوا جسے تاثراتی / رومانی تنقید کہا گیا ہے۔ یورپی اور خاص طور پر انگریزی ادب میں ادوار بندی میں دور رجحانات کو آفاقی حیثیت حاصل ہے یعنی کلاسیکیت اور رومانیت۔ غالباً ہمارے ہاں بھی ابتدا میں اسی روش پر چلتے ہوئے ادوار بندی کے لیے کلاسیکیت، رومانیت نفسیاتی تنقید وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی گئیں۔ یہ ادوار بندی بہت سخت اور بے لچک اصولوں کی روشنی میں نہیں ہوتی، تاہم ان سے کسی دور یا ادیب کے رجحان کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ اردو تنقید کے اس ابتدائی دور میں زیادہ تر تنقیدی تحریریں صاحب تحریر کے مزاج، تعلیم، مطالعہ، ذوق وغیرہ کی مرہون منت ہوتی تھیں۔ اس لیے بہت سے نقادوں پر کوئی لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں۔ مثلاً مجنوں گورکھپوری کو تاثراتی تنقید اور ترقی پسند تنقید دونوں میں جگہ دی جاتی ہے اور کلیم الدین حسن عسکری کو بھی تاثراتی نقاد ثابت کرتے ہیں۔ تاہم ترقی پسند ادب اور تنقید کے واضح خدو خال آنے کے بعد سے لے کر اب تک زیادہ تر نقادوں کو کسی نہ کسی خانے میں ضرور رکھا جاسکتا ہے۔ رومانیت ایک آفاقی رجحان ہے اور ہمارے ہاں یہ تحریک کی شکل میں نہیں تھا۔ تاہم وزیر آغا اسے تحریک کا نام دیتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے ہے:

”سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، آل احمد، نیاز فتح پوری، عبدالرحمن بجنوری اور بعض دوسرے نثر نگار اصلاً اس رومانی نقطہ نظر ہی کے مبلغ تھے جو ادب پارے کو اس کی ماورائیت اور جمالیاتی عناصر کی میزان پر تولنے کے حق میں تھا اور اس سلسلے میں ذوق نظر اور وجدان کو رہنما اصول مانتا تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو اردو کی رومانی تحریک سرسید تحریک کا رد عمل بھی تھی کیونکہ جس شد و مد سے سرسید تحریک نے سوسائٹی اور اس کے مقتضیات کو بنیادی اہمیت دی تھی اسی قوت اور زور کے ساتھ رومانی تحریک نے تصویریت اور ماورائیت کے حق میں آواز بلند کی۔“ (۵)

تاثراتی تنقید میں سب سے بڑا اصول ذاتی پسند و ناپسند کا ہے۔ اس طرح کی تنقید کی سب سے بڑی مثال نیاز فتح پوری ہیں۔ تنقید پر نیاز کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ صرف مضامین ہیں جو رسالہ ”نگار“ میں چھپتے رہے ہیں۔ تاثراتی تنقید کی یہ خامی ہے کہ اس میں کوئی اصول نہیں بنائے جاسکتے۔ اس میں نقاد کی انفرادیت حاوی رہتی ہے۔ فراق اور مجنوں گورکھپوری کا شمار بھی تاثراتی نقادوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب تعریف یا تنقید کے لیے جواز بھی پیش کیا جانے لگا۔ فراق ”اندازے“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”میری غایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی ہے کہ جو فوری وجدانی، اضطرابی اور مجمل اثرات قدمائے کلام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کے پردوں پر پڑے ہیں، انھیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچا دوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے۔ میں اسی کو خلا قانہ تنقید یا زندہ تنقید سمجھتا ہوں۔“ (۶)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس چیز کو ”زندہ تنقید“ سمجھتے تھے۔ کلیم الدین ان کے درجنوں تاثراتی جملے نقل کر کے کہتے ہیں کہ اس قسم کی تنقید تذکروں میں مل بھی جاتی ہے۔ تاہم رومانی طرز تنقید کے نمائندہ عبدالرحمن بجنوری کو کہا جاسکتا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا شمار جمالیاتی اور ترقی پسند ہر دو طرح کے نقادوں میں کیا جاتا ہے۔

فراق کی تنقیدی کتابوں میں ”اردو غزل گوئی“، ”اندازے“، ”اردو کی عشقیہ شاعری“ اور ”حاشیے“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ فراق کو تاثراتی نقاد کہنا بجا ہے، مگر وہ صرف و محض یہ نہ تھے، انھیں نفسیاتی اور ترقی پسند نقادوں کی صفوں میں بھی رکھا جاتا ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ مارکس اور فرائیڈ ہر دو سے متاثر تھے۔ اگرچہ عمومی طور پر اس وقت ایسا نہیں تھا، ایک ادیب پر ان دو میں سے کسی ایک کا غلبہ ہوتا تھا۔ دونوں طرح کے نظام فکر متصادم خیال کیے جاتے تھے اور یہ بات کوئی ایسی غلط بھی نہیں کیونکہ ایک کا مرکز نگاہ داخل ہے تو دوسرے کا خارج۔ فراق کی بطور نقاد عطا کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی ان کی یہ عطا کم نہیں کہ ان کے ہاں پہلی مرتبہ اس طرح کا امتزاج نظر آتا ہے۔ لیکن اس امتزاج اور مغربی تنقید کے اثرات قبول کرنے کے دعوے کے باوجود ان کی تنقید کا انداز

توضیح و تشریح کا ہی ہے اور نہ ہی وہ نظری تنقید میں کوئی خاص اضافہ کر پائے، جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی۔ شعری اور نثری فن پاروں پر فراق کے تاثراتی جملوں سے کوئی اصول مرتب نہیں کیے جاسکتے کیونکہ تاثر ہر نقاد اور قاری کا مختلف ہو سکتا ہے۔
مجنوں گورکھپوری بعد میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔ اس کے باوجود ان کی تنقید میں ذوقی اور وجدانی عنصر ہمیشہ قائم رہا۔ فراق اور مجنوں کی تنقید میں وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی گئی اور انھوں نے مصنف کی زندگی اور ماحول کے اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ مجنوں کا رجحان ترقی پسند تحریک کی طرف ہو گیا۔

وسطی دور کو اردو تنقید کا کمزور ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کلیم الدین احمد کی سخت آرا بھی درست محسوس ہوتی ہیں۔ اپنے مجموعی رویے میں اس دور کے ناقدین اپنے پیش رووں سے آگے نہیں بڑھے، بلکہ انھی کے خیالات کی تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس دوسری نسل سے، جو انگریزی ادب سے نسبتاً براہ راست جڑی ہوئی تھی، بجا طور پر توقع تھی کہ ان کا انداز تجزیاتی ہوگا اور بات اخذ و ترجمہ سے آگے بڑھے گی اور تنقید میں نئے مباحث جنم لیں گے۔ ابتدائی دور میں چارقد آؤر شخصیات موجود تھیں، جنہیں آج بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وسطی دور میں بظاہر نقادوں کی ریل پیل نظر آتی ہے، مگر بات آگے بڑھانے والا کوئی نہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے تسلسل قائم رکھا، جس کا مستقبل میں ضرور فائدہ ہوا۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کو جدید اردو تنقید کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں تنقید بطور ایک ڈسپلن قائم ہوئی، کیونکہ اردو تنقید اب محض انگریزی (وہ بھی محدود معنوں میں) نہیں بلکہ مغربی ادب اور تنقید سے بھی، اور کافی حد تک کھلی آنکھوں سے، اثرات قبول کر رہی تھی۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کو قبلہ اول (انگریزی یا مغربی) سے منہ موڑ کے اپنا رخ روس کی سمت پھیرنے سے عبارت کہا جاسکتا ہے۔ اس تحریک کے ابتدائی ادبا اور نقاد مزاجاً تنقید کے وسطی دور سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں، یعنی مخصوص ادیبوں کے چند نظریات بلکہ بعض صورتوں میں محض اقوال کے سہارے، اخذ و ترجمہ کی مدد سے، اپنا نقطہ نظر بیان کرنا۔ ظاہر ہے یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا، اور بہت جلد وسعت نظری پیدا ہونا شروع ہوئی۔

حوالہ جات:

- ۱۔ عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر، اردو تنقید: چند منزلیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۳
- ۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۶
- ۳۔ اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۱۲۴
- ۴۔ مسعود حسن رضوی ادیب، ہماری شاعری، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۶-۱۳
- ۵۔ تنقید اور جدید اردو تنقید، ص ۲۱۰
- ۶۔ فراق گورکھ پوری، اندازے، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱



علی محمد فرشی

”ایک نظم زید کے نام“ کا تجزیاتی مطالعہ

”ایک نظم زید کے نام“ از آفتاب اقبال شمیم

جن کے ہمراہ چلتا ہوں

چلتا رہا ہوں، انھی کا وفادار ہوں

دال روٹی کی گردان میں

عمر کو جو بسر کرتے رہتے ہیں

رزق اور روزی کی ابجد سے

بنتے ہوئے جن کے ناموں کی رونق سے

یہ گاؤں یہ شہر آباد ہیں

میرے بیٹے ہیں وہ میرے اجداد ہیں

میرا جذبہ انھی کے قبیلے سے ہے

میری دانش انھی کے وسیلے سے ہے

کیا بتاؤں کہ گلیوں محلوں کی

یہ لڑکیاں

عشق کے قاف کی وہ پری زاد ہیں

جن کی دلدار یوں کے گلاب و سمن

چشم و لب اور جان و بدن کی

عبارت میں

لکھی ہوئی داستانوں میں

دل شاہ زادہ ہے گم نام صدیوں سے

بھٹکا ہوا

اور جیون امر ہے
 مجھے دکھ، جنم دکھ کا سہنا گوارا ہے
 اُن کے لیے
 ہم کہ جو رو وفا اور بے مہر صدیوں کی
 دوزخ میں ہیں
 کیا پتا کل نہ ہوں
 کیا پتا کل کا دیکھا ہوا خواب
 سچا نکل آئے، دنیا بدل جائے
 گلیوں محلوں کے
 لپے لپٹے، گلا کاٹتے، جیب کترے دنوں کو
 فلاں اور فلاں اور فلاں شہر کی
 تنگ دامانیوں کی سزا سے
 رہائی ملے
 میں زمیں زاد کیوں اُس سے شکوہ کروں
 خاک خود اپنا آئین ہے
 نامساوی کو ترکیب کے زور سے
 جو مساوی کرے
 کیسی مایوسیاں
 اس مرے خواب فردا کو تعبیر ہونا ہی ہے
 جھوٹ کو میرے سچ کی لڑائی میں
 تسخیر ہونا ہی ہے

آفتاب اقبال شمیم نے جب شاعری کے شہر میں قدم رکھا تو ترقی پسند تحریک اپنا ساز و سامان سمیٹ رہی تھی۔ میراجی اور راشد نظم کو پروپیگنڈے کی مشقت سے آزاد کر کے اسے آرٹ کے منصب پر فائز کر چکے تھے۔ میراجی کی سیادت میں حلقہٴ ارباب ذوق نے جدید نظم کے لیے جو راہیں متعین کی تھیں ان پر نئے سنگِ میل قائم ہو رہے تھے۔ یہاں اس مغالطے کا استرداد ضروری ہے کہ حلقہٴ

ارباب ذوق کی تحریک اپنی نہاد میں ترقی پسند تحریک کی ضد یا رد عمل تھی۔ جواز میں جو دلیل دی جاتی ہے وہ بھی بظاہر معقول لگتی ہے کہ حلقہ ارباب ذوق نے ترقی پسند تحریک کی 'خارجیت' کو داخلیت میں بدل دیا۔

ترقی پسندوں نے 'ادب برائے زندگی' کے نعرے کو اپنے حق میں خوب استعمال کیا تھا اور ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ نہ ماننے والوں کو 'ادب برائے ادب' کا قائل قرار دے کر ایک طرح سے مہمل اور بے مقصدیت کا اسیر قرار دے کر ادب بہ در کرنے کی کوشش کی تھی۔ منٹو جیسے ادیب کو ترقی پسندوں کے ہاتھوں جن اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ لہذا رد عمل میں بھی شدت پسندی کے احتمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ ہوا صرف یہ کہ ترقی پسند تحریک اپنا فعال کردار ادا کر چکنے کے بعد اپنے انجام کی جانب گام زن تھی، ایسی بڑی تحریکوں میں بے اعتدالی کے عناصر کا درآنا بھی کسی اچنبھے کی بات نہیں۔ مزید یہ کہ ایسی تحریریں جو ادب کے درجے تک نہیں پہنچ پاتیں، خود بہ خود زمانہ برد ہو جاتی ہیں، ان کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت نہیں ہوتی!

طرفہ یہ ہے کہ جو لوگ ادب کو تبدیلی کا ذریعہ قرار دیتے تھے وہ خود اسے فی جنم تبدیل ہونے سے روکنے پر مصر تھے۔ جب کہ ادب کا بنیادی وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ یکسانیت اور جمود کی تہ کو توڑے اور تازگی کو پنپنے کا موقع فراہم کرے۔ میراجی اور راشد نے نظم کا دنیا جہان دریافت کیا تھا، ترقی پسند تحریک کے آباد کردہ شہر کو مسمار کرنے کی سازش نہیں کی تھی۔ یہ درست نہیں کہ نئی نظم داخلیت کی کھڑکی سے زندگی کا نظارہ کرتی ہے بلکہ سچ یہ کہ یہ کائنات اکبر کو کائنات اصغر کی کھالی میں پگھلا کر نہ صرف زرخاں کو فن پارے کی شکل دیتی ہے اور قلم کو علم بنانے پر یقین نہیں رکھتی۔ اس سے انکار نہیں کہ اول اول کہیں کہیں بے اعتدالی کی لڑکھڑاہٹ بھی دکھائی دیتی ہے لیکن بعد میں آنے والے باشعور نظم نگاروں نے خاصی احتیاط کا مظاہرہ کیا۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظم 'خارجیت' اور داخلیت کی مثبت اقدار کے فنی امتزاج سے متشکل ہوتی ہے۔ اُس نے اجتماعی زندگی کو اپنی باطنی خرد افروز آنکھ سے دیکھا اور دردمند دل کے لہو سے سینچا پھر فن کی آنچ پر پخت کرنے کے بعد سپردِ صفحہ قرطاس کیا۔ یوں اس کی فکر مثبت نعرۂ انقلاب کی بجائے ایسے احساس کا سانچ بن گیا جو فن کا خاصہ ہے۔ اس کا یہ نظریہ فن اس کی نظموں کے پہلے مجموعے 'فردا نژاد'، جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا، سے لے کر تاحال، 'نادریافتہ' (کلیات) تک اس کی انفرادیت کو مستحکم کرتا دکھائی دیتا ہے۔

زیر بحث نظم 'ایک نظم زید کے نام' اپنے عنوان ہی سے قاری کو شاعر کی فکر کے مرکزے تک رسائی فراہم کر دیتی ہے اور ذہن خود بہ خود اُس کی دوسری کتاب کے عنوان 'زید سے مکالمہ'، جو طویل نظموں کو محیط ہے، کی طرف جست لگاتا ہے۔ زید کا یہ کردار 'فردا نژاد' میں شامل ایک نظم 'زید آ' سے شاعر کی فنی زندگی میں اُس کے ساتھ ساتھ منزلیں مارتا یہاں تک پہنچا ہے۔ اگر ہم سرسری بھی شاعر کے کلام سے گزریں تو 'زید' کا استعارہ شاعر کی فکری و فنی کلّیت کو آشکار کرنے کے لیے کافی ثابت ہوگا۔

'زید' کو شناخت کرنے کے لیے میں 'زید آ' کو نقل کر دوں تو بہت سا ابہام دور ہو جائے گا:

رات کے کھیت سے پھوٹی رُت کی خوشبو اڑی

جسم میں آہٹیں سی ہوئیں

نوجوان فصل کو کاٹنے کے لیے

دستِ آئندہ آگے بڑھا

خون میں ڈوب کر گولیاں گنگنا نے لگیں

روشنی سے سلگتے ہوئے چوک میں جراثیم

سر لٹائے لگیں

زید آ، ہم بھی شامل ہوں بیساکھ کے جشن میں

ورنہ اس جہل کی اوٹ میں چھپ کے بیٹھے ہوئے

کیسے بچ پائیں گے

سچ کی دو پہر

یلغار کرتی ہوئی ڈھونڈ لے گی ہمیں

ہم کہ آنکھوں کو اپنے ہی سائے سے ڈھانپے ہوئے

اور اپنے ہی پیچھے کھڑے

خود کو خود سے چھپانے کی کوشش میں مصروف ہیں

خود کلامی کی تکنیک میں لکھی ہوئی یہ نظم ’زید‘ کی پہلی جہت جو خود شاعر کی اپنی ہی شخصیت کا جمود ہے، کو مخاطب بناتی ہے لیکن موضوع کا خارجی حوالہ جو سیاسی سماجی جبر سے آمیز ہے، اس کردار کی دوسری جہت کو خارج کا نمائندہ بھی بناتا ہے۔ یوں داخلیت اور خارجیت ایک ہی حقیقت کے دو رخ قرار پاتے ہیں۔ نظم کا موضوع بھی اکہرا نہیں۔ سطح کا سوال تو یہ ہے کہ سیاسی سماجی جبریت کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے لیکن غفلت شعاروں کی روش ہے کہ بدلنے کا نام نہیں لیتی۔ ممکن ہے کہ نظم کا اکھوا یو بی آمریت کے خلاف عوامی تحریک سے پھوٹا ہوا یا ضیائی مارشل لا کے خلاف عوامی سیاسی مزاحمت سے، لیکن اس سے نظم کی کہانی کی دوامیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چونکہ نظم کی تخلیق کا زمانہ ہماری قومی تاریخ کے انھی دو سیاہ ادوار کو نشان زد کرتا ہے اس لیے لامحالہ دھیان ادھر جاتا ہے ورنہ نظم اپنی ساخت میں زمانی وسعت کا لامحدود قرینہ لیے ہوئے ہے۔ جیسا کہ منٹو کا ’نیا قانون‘ اپنی زمانی واقعیت سے جڑے ہوئے بھی اپنی علامتی حیثیت میں زمان و مکاں سے آزاد رہتا ہے۔

فردانزاد ہی میں شامل نظم ’لا‘ (ایک مکالمہ) میں ’زید‘ شاعر کے تخلیقی وجود، اُس کے سماجی کردار اور خارج میں فرد مع اجتماع کی کلیت میں ڈھل گیا ہے:

”آ چلیں، سامنے بائیں جانب کو مُڑتے ہوئے راستے پہ چلیں۔ کیوں، وہاں اُس طرف کیوں چلیں، اس طرف کیوں نہ جائیں۔۔۔ مگر سوچتا ہوں کہ یہ اور وہ ایک ہی راہ کے دو زمانے ہیں، دو حالتیں ہیں، صدی دو صدی کے شعور اور رفتار کے مظہروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں، اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ کیوں چلیں، اُس طرف موسموں کی ہوا۔۔۔ چھوڑ، ہم اڑتے پرزوں کے انبوہ سے کس لیے جا ملیں اور پھر زید کے تنگ جوتے مجھے کاٹتے ہیں۔ اُسے یا مجھے زرد آنکھوں کی تکلیف ہے۔ آئیں۔۔۔ آئیں بیٹھ جائیں، یہیں گھاس پر۔۔۔ جانتے ہو یہ پاؤں میں روندی ہوئی گھاس بجز زمیں میں اور زرخیز ماں اور قدموں کی گرمی کی اولاد ہے۔۔۔“

اسی (۸۰) کی دہائی کے اوائل تک سیاسیات اور سماجیات میں کیونز کم کو معاشی معاشرتی انصاف کے حصول کے لیے آئیڈیل سمجھا جاتا تھا۔ ادب میں ترقی پسند فکر کے نمائندہ لکھاری استبدادی قوتوں کے خلاف اسے نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔ اس نہج پر سوچنے والوں کی نیک نیتی پر شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ترقی پسندی نے اردو ادب کو نیا خون فراہم کیا، توانا اور مثبت فکر عطا کی۔ آفتاب اقبال شمیم کی فکری ساخت و پرداخت اسی نظریے کی آغوش میں ہوئی۔ لیکن ایک اکیلے شاعر کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک نظریے کے جوتے پہن کر آنکھیں بند کیے کسی ایک راستے پر چلتا رہے۔ جیسا کہ اس شاعر نے کھلی آنکھوں سے زمینی حقائق کا مشاہدہ کیا ہے اور اپنا راستہ ہٹ کر بنایا ہے۔ اس کی وابستگی اپنی زمین سے اور روندے ہوئے عوام سے ہے۔ نظم میں ”زرد آنکھیں“ سبز اور سرخ نظریات کو بہ طور ہتھکنڈ استعمال کرنے والی قوتوں پر عدم اعتماد کا مظہر ہیں۔ ایک ایسے وقفے کی علامت ہیں جہاں شاعر اپنی باطنی دانش سے راہ نمائی لیتا ہے۔ نظم آگے بڑھتی ہے تو ان دونوں بازوؤں پر کھل کر حملہ کرتی ہے:

”کس طرف! کس طرف!۔۔۔ میرے آقا! مجھے دائرے کے مسلسل سفر سے رہائی دلا۔ انگلیاں، انگلیوں پر لپیٹے ہوئے میں کہاں تک گرہ بندیوں سے نکلنے کی خواہش کروں اور لفظوں کی بارش میں بھیگے ہوئے، آنے والے خطوں کے مضامین بے معتبر نامہ بر کی زباں سے سنوں۔۔۔ اور رنگوں کی آلائشیں۔۔۔ سب منافق ہیں۔ ہر بات سچی بھی ہے اور جھوٹی بھی ہے“

دائیں بائیں کے دونوں دھڑوں کی منافقت اور دو بڑی غیر ملکی طاقتوں کے آلہ کاروں کے خلاف یہ ردِ عمل ایک خود بین و خود آگاہ دانش ور اور خود مختار شاعر کا کھرا تخلیقی نقطہ نظر ہے۔

اس تمہید طولانی کا مدعا یہ تھا کہ شاعر کے ابتدائی فکری و فنی سفر کے نشانات کو بھی ذہن میں رکھا جائے جن پر چل کر اُس نے اپنی شعری کائنات تخلیق کی۔

آفتاب اقبال شمیم کی دیگر نظموں کی طرح زبرِ بحث نظم بھی ابہام سے پاک ہے، اور مجھ ایسے شاعر کے لیے جو ابہام کون کی خوبی سمجھتا ہو، اس نوع کی نظم کو بحث کے لیے چننا ’ابہام‘ کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے وضاحت ضروری ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ نقاد کو

کسی خارجی منطق اور طے شدہ تنقیدی نظریے سے لیس ہو کر فن پارے سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہیے بل کہ فن پارے کو کھولنے کے لیے کلید بھی اسی فن پارے سے لینی چاہیے۔ میر کتنا ہی عظیم ہو اور اس کا نقاد خواہ کتنا ہی فاضل، اقبال کی تفہیم کے لیے میر پر قائم کیے ہوئے اُس کے تنقیدی اصول اور تکنیکی حربے ناکارہ ثابت ہوں گے۔ فیض مجھے پسند ہے تاہم میراجی اور راشد، بہ طور نظم نگار فیض سے زیادہ پسند ہیں۔ لیکن فیض کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر میں میراجی اور راشد کی شاعری کو ذہن سے نکال کر باہر نہیں رکھوں گا تو فیض سے بھی نا انصافی کروں گا اور خود سے بھی زیادتی کا مرتکب ٹھہروں گا کیوں کہ اس طرح میں فیض کے کلام سے فیض یاب نہیں ہو پاؤں گا۔ میں اقبال کو اردو نظم کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں جس کے ہاں ابہام نام کو نہیں۔ میرے نزدیک ابہام نہ کوئی خامی ہے نہ خوبی، بل کہ یہ تو موضوع کی غایت ہے، اُسلوب کی ضرورت ہے اور شاعر کے فنی میلان کا تقاضا!! ابہام کی موجودگی یا عدم موجودگی کو فن پارے کی داخلی منطق مان لیا جائے تو یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات فن پارے کی نامانوسیت کو بھی ابہام کی ذیل میں ڈال کر ہاتھ جھاڑ لیے جاتے ہیں جب کہ ہر اصل شاعر یا فن پارے کا اپنے نئے پن کے باعث نامانوس ہونا ایک لازمی امر ہے۔ غالب کی شاعری اپنے عہد کے لیے مبہم تھی آج نہیں ہے۔ غزل اور روانی نظم کے تربیت یافتہ قاری کے لیے جدید نظم نامانوس ہونے کی وجہ سے بھی مبہم ہو سکتی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظم ابہام سے پاک ہونے کے باوجود ناقدین کی ضروری توجہ سے محروم ہے تو اس کے معنی ما سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم من مانی اور تن آسانی کے اسیر ہیں۔

زیر بحث نظم شروع ہی میں اپنے موضوع کا دھاگا ہمیں تھما دیتی ہے اور ہم اس کے سہارے نظم کے اندر دور تک سفر کر سکتے ہیں۔ قدم قدم پر زبان کے تازہ اور تخلیقی استعمال سے جمالیاتی ذوق کو تسکین و توانائی حاصل ہوتی ہے اور شاعر کی محروم طبقات سے قلبی اور فنی وابستگی ہماری فکری لو کو فزوں کرتی ہے۔ نظم کا واحد متکلم بہ یک وقت شاعر کی ذات بھی ہے اور اصل فن کاروں کا استعارہ بھی:

”چشم و لب اور جان و بدن کی

عبارت میں

لکھی ہوئی داستانوں میں

دل شاہ زادہ ہے گم نام صدیوں سے

بھٹکا ہوا“

اعلیٰ ادب ہمیشہ معاشرے میں مروج منفی رویوں کے خلاف اور مثبت انسانی اقدار کی حمایت میں جدوجہد کرتا نظر آئے گا۔ مذہبی، سماجی، سیاسی صداقتیں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن ادبی صداقت غیر متغیرہ اصول کے طور پر ادب میں ہمیشہ رائج رہتی ہے۔ کون سا بڑا فن پارہ ہے جو محبت، انسان دوستی، وفاداری، رحم اور ایثار کی دشمنی پر قائم ہوا ہے؟ یہی وہ ”دل شہ زادہ“ ہے جو ”گم نام صدیوں سے“ انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار تاریخ کے تاریک جنگلوں میں، عظیم انسانی خواب کی تعبیر کی تلاش میں، سرگرداں

ہے۔ اس نظم کے شاعر نے اپنی ذات کو اسی ادبی روایت سے جوڑ کر اپنے وجود کے جواز کی دلیل دی ہے اور اپنے مقصد حیات اور نظریہ فن کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ ادبی روایت کی بات زیرِ قلم آگئی ہے تو اس کے مختلف دائروں کا ذکر بھی ناگزیر ہو گیا۔ ادبی روایت کا دائرہ اکبر تو انسان اساس (Anthropological) ہے۔ اس کے اندر مختلف تہذیبی و ثقافتی دائرے بھی موجود ہیں جو اپنی بوقلمونیوں کے باعث بہ آسانی شناخت کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے الگ تھگ نہیں بلکہ باہم پیوست ہیں۔ ادبیاتِ عالم کو ان کے تہذیبی و ثقافتی کوڈ کے ذریعے سے کھولا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ تہذیبوں و ثقافتوں کے باہمی لین دین کا عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے لیکن خیال رہے کہ یہ تقطیر سے گزر کر ادب کا جز بنتا ہے۔ ادب دخیل تصورات اور تمثالوں کو اپنی روح میں سمو لیتا ہے اور الفاظ کو چھان پھٹک کر ضروری تبدیلیوں کے بعد، اپنے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ بنا کر، اپنے وجود میں تحلیل کر لیتا ہے۔

زیرِ بحث نظم کا واحد متکلم، جو نظم کا پرسن بھی ہے اور پرسونا بھی، معاشی معاشرتی انصاف کے آدرش کا امین ہے لیکن وہ اپنے آدرش کے حصول کے لیے عوام کو، جن کی عمریں پیٹ کے تندور کا ایندھن بن جاتی ہیں، ظالموں اور غاصبوں کے تخت گرانے پر اکساتا ہے نہ ان کے تاج اُچھالنے کی ترغیب دیتا ہے۔

”جن کے ہم راہ چلتا ہوں

چلتا رہا ہوں، انھی کا وفادار ہوں

دال روٹی کی گردان میں

عمر کو جو بسر کرتے رہتے ہیں

رزق اور روزی کی ابجد سے

بنتے ہوئے جن کے ناموں کی رونق سے

یہ گاؤں یہ شہر آباد ہیں

میرے بیٹے ہیں وہ، میرے اجداد ہیں“

نظم کی یہ ابتدائی سطور واضح کر دیتی ہیں کہ شاعر کسی بلند سطح پر چڑھ کر تقریر نہیں کر رہا بل کہ اس کا ہونا نہ ہونا انھی عوام کے وجود سے وابستہ اور انھی کے ماضی و مستقبل سے پیوستہ ہے۔ خارج اور داخل کی حدود کو منافی ہوئی یہ سطور شعری جمالیات، تازہ اسلوب اور شاعر کی گہری دردمندی کے احساس کا ابلاغ اس قرینے سے کرتی ہیں کہ نظم قاری کے دل و دماغ میں تیز رفتار شارک کی طرح آگے بڑھنے لگتی ہے۔ ”دال روٹی کی گردان میں عمروں کا بیت جانا“، ”رزق اور روزی کے الف با“ سے انسانی وجود کی شناخت کا متعین ہونا“ ایک لمحے کو ہمیں کرب کی اُس چکی سے گزارتے ہیں، جس میں عامۃ الناس کی اکثریت مدتِ مدید سے پس رہی ہے۔ عین اس مقام پر جب درج ذیل دو مصرعے سامنے آتے ہیں تو قاری کی سلگتی ہوئی آنکھوں میں شاعر کی وابستگی کے باعث خوشی کے آنسو جھللا اٹھتے

ہیں۔

”میراجذبہ انہی کے قبیلے سے ہے

میری دانش انہی کے وسیلے سے ہے“

نظم نہ کسی آورد کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے نہ کسی تصنع کا شکار ہوتی ہے۔ بے ساختگی، فطری روانی، فنی تسلسل اور ”جذبہ“ اور ”دانش“ میں گندھی سطور میں ”قبیلے“ اور ”وسیلے“ کے قوافی کا بر محل ورود تخلیقی جواز کے ساتھ نظم کی فنی و فکری کلیت کو استحکام پذیر کرتا ہے۔

استبدادی قوتوں کے بنائے ہوئے جہنم میں شاعر کا وجود جمہور کا جز بن کر اذیت کے دن گزارتے ہوئے اس احساس سے بھی دوچار ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ شاید اس کی اپنی زندگی میں نہ پائے۔ مایوسی کے شعلوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے فرد کا یہ خوف دفعتاً ایک خواب گوں احساس سے امکان کا ایک روزن بناتا ہے:

”کیا پتا کل کا دیکھا ہوا خواب

سچا نکل آئے، دنیا بدل جائے

گلیوں محلوں کے

لُچے لُفنگے، گلا کاٹتے، جیب کترے دنوں کو

فلاں اور فلاں اور فلاں شہر کی

تنگ دامانیوں کی سزا سے

رہائی ملے“

”کل کا دیکھا ہوا خواب“ نظم کے زمان کا تعین کرتا ہے۔ یہ خواب ایک آزاد، خوش حال اور سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف کے امین معاشرے کا خواب تھا۔ یہاں نظم نے اپنے عمودی دائرے کے ساتھ ساتھ اپنے افقی دائرے کو بھی کشادہ کیا ہے۔ ایسا فن پارہ جس کی جڑیں زمین میں گہری نہ ہوں، خلا میں معلق تو ہو سکتا ہے آفاقی نہیں۔ اس نظم نے اسلوبیاتی سطح پر مقامیت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن یہ دونوں باہم دست و گریباں نہیں بل کہ شیر و شکر ہو کر نظم کی نامیاتی وحدت کا تخلیقی حصہ بنے ہیں۔ یوں یہ نظم مقامی ثقافت، شعری روایت اور آفاقی اقدار سے آمیز ہو کر ایک زندہ فن پارے میں ڈھل گئی ہے جو نہ صرف شاعر کی نمائندہ قرار پا کر اس کی انفرادیت کو مستحکم کرتی ہے بل کہ اردو کی بہترین نظموں میں بھی اعتماد سے رکھی جاسکتی ہے۔

نظم کو مختلف بندوں میں تقسیم نہیں کیا گیا لیکن بغور مطالعے سے یہ تین حصوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا حصہ معاشرے کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ دوسرا حصہ مزید دُشمنی اجزا میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے جز میں حالات کے تبدیل نہ ہونے کے خوف سے ایک کلائمکس قائم ہوتا ہے لیکن نظم پھرتی سے پینتر ابدل کر اُس شکجے سے نکل جاتی ہے اور خواب کا روشن دان کھول دیتی ہے یوں گھٹا ٹوپ میں امید کی

کرنیں نظم کو نیا منظر نامہ فراہم کر دیتی ہیں۔ نظم کا تیسرا حصہ نظم کا حاصل بھی ہے اور غزل کی زبان میں حاصل نظم بھی۔

”میں زمیں زاد کیوں اُس سے شکوہ کروں

خاک خود اپنا آئین ہے

نامساوی کو ترکیب کے زور سے

جو مساوی کرے

کیسی مایوسیاں

اس مرے خوابِ فردا کو تعبیر ہونا ہی ہے

جھوٹ کو میرے سچ کی لڑائی میں

تخیر ہونا ہی ہے“

نظم نے مصرع بہ مصرع ارتقا کرتے ہوئے قاری کو اب اُس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں اس ”خراب آباد“ سے نکلنے کی تدبیر کی ضرورت کا احساس خود بہ خود ٹھٹھٹھیں مارنے لگتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں تقدیر کے مروجہ مغالطے کو رد کیا گیا ہے، جو اسلامی تہذیب میں باقاعدہ منصوبے کے ساتھ اُس وقت راسخ کروایا گیا جب خلافت کو (جو جمہوریت ہی کی صورت تھی) آمریت میں بدلنے کی شروعات کا آغاز ہوا، کہ انسان مجبور محض ہے اور تاریخ کا پہیا چرخ نیلی فام کے تابع رہ کر گھومتا ہے۔ تقدیر کا یہ تصور قابض حکم رانوں کی ناجائز بادشاہت کو جواز بخشنے کے لیے، دام و درم پرست نام نہاد علما دین کے ذریعے عوام میں پھیلا یا گیا۔ ایسا نہیں ہے اس تصورِ تقدیر کے خلاف مزاحمت نہیں ہوئی۔ امام حسینؑ سے متعزلہ تک راست تصورِ تقدیر کو فروغ دینے کی ان گنت مثالیں صفحاتِ تاریخ میں روشن ہیں۔ اردو شاعری میں آمرانہ تصورِ تقدیر پر کاری ضرب اقبال نے لگائی تھی لیکن اقبال کا خواب اس سرزمین پر جس طرح مسمار کیا گیا اُس نے نہ صرف عوام بل کہ شعرا کو بھی مایوسی کے اندھیرے غاروں کی جانب دھکیل دیا۔ اقبال کے پاس درپیش خرابے سے نکلنے کا واضح راستہ موجود تھا جس کے باعث اس کے ہاں یقین محکم اور عملِ پیہم کا تسلسل عین فطری تھا۔ ہٹارے کے دوران میں فسادات نے انسان کی بہیمیت کا وہ کریہ چہرہ بے نقاب کیا کہ شاعر کو اُجالا داغ داغ ہی دکھائی دینا چاہیے تھا اور سحر شب گزیدہ! اقبال کی رجائیت کا یا سیت میں بدل جانا سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ بھی ہے اور عوامی محسوسات کا سادہ رد عمل بھی۔ پاکستان بنتے ہی جعلی کلیموں کی شکل میں جس معاشی کرپشن کی بنیاد رکھی گئی اس کا تسلسل آج تک نہیں ٹوٹا۔ پے در پے مارشل لاؤں نے ہماری قومی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ فوجی آمروں نے ہر بار قرونِ اولیٰ کے غاصبوں کی طرح تقدیر کے اسی منفی تصور کے ہتھکنڈے سے عوام کو گم راہ کرنے کی کوشش کی۔

اقبال سے آفتاب اقبال کی اس نظم تک آتے آتے بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ خیال رہے کہ زیرِ تجزیہ نظم ”میں

نظم لکھتا ہوں“ سے لی گئی ہے جو ۲۰۰۹ء میں منصہ شہود پر آئی۔ ”سرخ سویرا“ جو کئی نسلوں کی اُمیدوں کا چراغ تھا اس کی حیثیت اب، سرمایہ داری کی تند آندھی کے سامنے معمولی خذف ریزے سے زیادہ نہ تھی۔

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی روایت سے روشنی لی اور نظم کو صدیوں کا وسیع تناظر فراہم کر دیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ فردا نژاد میں شامل نظم ”لا (ایک مکالمہ)“ میں جب اُسے کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی تو اُس نے وہاں بھی دائمی حقیقت کی طرف رجوع کیا تھا:

”کس طرف! کس طرف!۔۔۔ میرے آقا!“

آفتاب اقبال شمیم کے کتنے ہی معاصرین صرف اس وجہ سے شاعری کی شہ راہ پر زیادہ دیر نہ چل سکے کہ اُن کے قدموں تلے نہ اپنی زمین تھی نہ سر پر اپنا آسمان۔ اپنی روایت کٹے ہوئے ادب کی دل دادہ صرف دیمک ہوتی ہے! روایت کوئی جامد شے نہیں بل کہ ایک زندہ اور متحرک قوت ہے۔ جس فن کار نے اُس کا ہاتھ تھاما وہ کبھی بھٹکا نہیں اور جس نے اُسے تخلیقی اضافے کے ساتھ آگے بڑھایا وہ کبھی مرا نہیں!

یہ فردا نژاد، زمیں زاد ادب اُس مقام پر آپہنچا ہے جہاں اُسے اپنے آقا سے کوئی شکایت نہیں۔ راست فکر شاعر تقدیر اور تدبیر کے دائروں کا الگ الگ تعین کرنے کی بصیرت سے معمور ہے۔

میں زمیں زاد کیوں اُس سے شکوہ کروں

خاک خود اپنا آئین ہے

نامساوی کی کوتر کیب کے زور سے

جو مساوی کرے

کیسی مایوسیاں

اس میرے خواب فردا کو تعبیر ہونا ہی ہے

جھوٹ کو میرے سچ کی لڑائی میں

تسخیر ہونا ہی ہے

وہ درپیش دگرگوں حالات کو انسانی بد اعمالیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ نظم نے اسی داخلی منطق سے یہ نکتہ فروزاں کیا ہے کہ اگر گنتی کے کچھ بد کردار افراد پورے معاشرے کو قعر مذلت میں پھینک سکتے ہیں تو معاشرے کی اجتماعی مثبت قوت اُس سے نکلنے میں کیوں کر ناکام رہ سکتی ہے۔

نظم کی ایک اور اضافی خوبی اس کی تائیدی فکر بھی ہے۔ مردانہ معاشرے کی جبریت میں عورت کا فعال وجود اپنے جمالیاتی و فور کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور زندگی کی مثبت قوت کو ہمارے داستانی ادب کی عظیم روایت سے مربوط کر کے خواب کو حقیقت میں بدل

دینے کی تخلیقی جہت سے مستنیر کرتا ہے:

”کیا بتاؤں کہ گلیوں محلوں کی

یہ لڑکیاں

عشق کے قاف کی وہ پری زاد ہیں

جن کی دلدار یوں کے گلاب و سمن

چشم و لب اور جان و بدن کی

عبارت میں

لکھی ہوئی داستانوں میں

دل شاہ زادہ ہے گم نام صدیوں سے

بھٹکا ہوا“

صدیوں سے بھٹکا ہوا یہ عشق شہ زادہ نظم کی آخری سطور میں تمام مایوسیوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور پورے تین سو سے بچ

کی فتح یابی کی بشارت دیتا ہے۔

میں آخری مرحلے میں ”زید“ کی Conceit کی گتھی کو سلجھانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ”زید“ کا کردار آفتاب اقبال شمیم کے

معاصر نظم نگار اور اُس کے یارِ غار احمد شمیم کے ہاں بھی موجود ہے، تاہم یہاں دونوں کی شعری کائناتوں میں اس Conceit کی

مماثلت اور تفاوت کے تقابلی مطالعے کا نہ کوئی محل ہے نہ جواز۔ یہ موضوع الگ مضمون کا متقاضی ہے، لیکن میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ

آفتاب اقبال شمیم کے ہاں یہ Conceit تخلیقی پیچ داری و فکری بلندی کے باعث سر بلند و سرخرو دکھائی دیتی ہے۔



وحید احمد کی نظم ”علاج بالمثل“ کا تجزیاتی مطالعہ

”علاج بالمثل“ از وحید احمد

نشتر زخم لگاتا ہے تو نشتر سے کھلواتا ہوں، سلواتا ہوں
 مہینیر نیل اتارتا ہے، تو مکے میں رسواتا ہوں، کھنچواتا ہوں
 پانی گرمی گھولتا ہے
 تو پانی کا ٹھنڈا پیالہ منگواتا ہوں
 جب شب زندہ داری میں مئے چڑھتی ہے
 تو صبح صبحی کی سیڑھی لگواتا ہوں
 عورت چہرہ دیتی ہے، تو عورت کو بلواتا ہوں، دکھلاتا ہوں
 اک عادت کے گھاؤ پہ دوسری عادت باندھا کرتا ہوں
 میں عورت کے زخم کے اوپر عورت باندھا کرتا ہوں

جب میں اس نظم کی قرأتِ اوّل سے گزرا تو میرے اعصاب پر اس طرح چھا گئی کہ، شہر ہستی کے بہت سے
 خوش کن اور ناخوش گوار مناظر و کیفیات کی مصروفیاتِ روزانہ کے اندر اتر کر بھی، اس کی آہنی دستِ گرفت سے باہر نہ
 نکل سکا۔ گویا ایک لمحہ کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ:

○ کہیں یہ قرطاس پر ترتیبِ حروف، جذب و واردات کے لہو میں گوندھی ہوئی، کیفیتِ ذہنی اور صلاحیتِ فیصلہ سے ابھی
 ہوئے کرب کی تجسیم تو نہیں، جو، جامد بھی ہے اور وقت کے اس دریا میں میرے اندر بہے جا رہی۔ اور میں یہ بھی سوچتا ہوں یہ کیسا دریا
 ہے۔ بہت عجیب دریا ہے۔ وہ دریا ہے جس کا پانی کبھی آگے کی طرف بہتا اور کبھی الٹا بھی بہنے لگتا ہے۔

○ کیا شاعر کی ذات ہی ہے جو اپنا فکری لبادہ اوڑھے، انتخاب کی داخلی اذیت کا احساس سمیٹے، قرأت کی صوتیاتی سحر
 آفرینیوں میں، قاری کے ساتھ معجزاتی ظہور پذیری کی صورت میں موجود ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر یہ کیفیت کیوں کر طاری ہو جاتی ہے جو
 قاری کو اس طرح اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

○ سوال یہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ سوال یہ ہے کہ اس نظم کے اندر ایسا کون سا احساس یا داخلی کرب ہے؟ جو اسی سمت ہی سفر

کرتا ہے جہاں اس کا حقیقی مقام ہے یعنی قاری کے دل میں ہی اپنی جگہ ڈھونڈتا ہے۔ اور پھر مزے کے بات یہ ہے کہ قاری بھی اسے اپنے دل میں جگہ دے کر یوں سنبھالے ہوئے پھرتا ہے جیسے یہ اس کے لئے ایک مقدس امانت ہو۔

○ اصل میں ہر وہ کیفیت جو انسانی واردات قلبی یا اسکی نفسیات سے قریبی رشتہ رکھتی ہو اور شعریاتی خوبیوں سے بھی متصف ہو آفاقی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ وحید احمد کی نظم ”علاج بالمثل“ انھی صفات سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدھی دل میں ہی جا گزین ہوتی ہے۔ اس کا محرکاتی پس منظر نفسیاتی مکتبہ فکر ہے۔

نفسیاتی حوالے سے جو گہری حسیت نظم کے رگ و پے میں لہو کی طرح گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے:

○ یہ ایک ذات یا ہستی کے رویے میں واردات، ردِ عمل اور فیصلہ کا اندرونی کرب ہے۔

○ ایسی صورتِ حال میں کرب فیصلہ آدمی کی ذات کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

○ نظم کے پلاٹ میں سٹی ہوئی کہانی اس کیفیت کا اظہار ہے جب نہ اپنے آپ پر دسترس رہے اور نہ درپیش آنے والے

حالات بس میں ہوں۔

○ اس مقام پر شخصیت کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

○ اس صورتِ حال کا سامنا زندگی میں کسے پیش نہیں آتا؟

○ ہر شخص ایسی صورتِ حال کو اپنے انداز سے لیتا ہے۔

○ ہر شخص کا ردِ عمل ایسی صورتِ حال میں مختلف ہوتا ہے۔

○ یہ اختلاف ہر آدمی کے مزاج کی بدولت ہی رونما ہوتا ہے۔

○ ذرا گہرائی میں اتریں تو اس کے مزاج کے پس منظر میں اس کا خاندانی اور معاشی حوالہ بھی موجود ہوگا۔

○ عام انسان (آدمی) ایسی صورتِ حال سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل زیادہ ہوتا ہے۔ بہ

نسبت خواص کے۔ اس لیے کہ اپنی عملی

زندگی میں وہ محرومیوں کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

○ خواص چونکہ زیادہ محرومیوں کا شکار نہیں ہوتے اس لیے ان کی ذات میں عمومی طور پر احساس کی وہ شدت موجود نہیں ہوتی۔

اس میں نظم کا پلاٹ، واردات اور معنویت استعارات دو مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ یہ سمتیں دو مختلف دبستانوں کی طرف

ورود کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک اس کی بالائی یا ظاہری سطح ہے۔ جس کا ماخذ نفسیاتی مکتبہ فکر ہے اور دوسری نظم کی، زیریں یا باطنی سطح ہے۔

جس کا پس منظر ایک فلسفیانہ مکتبہ فکر ہے۔ آئیے ان دونوں سطحات کا ذکر اختصاراً جائزہ لیں:

○ نظم میں شاعر نے ایک تو اتر کے ساتھ عادت کا ذکر کیا ہے۔

- پہلے یوں لگتا ہے کہ شاعر عمومی طور پر اپنی مختلف عادات کو حافظہ میں دہرا رہا ہے۔
- ایک خاص مقام پر جا کر احساس ہوتا ہے کہ یہ عادات کا عمومی تذکرہ نہیں ہے۔
- ذرا گہرے پچار سے دیکھا گیا تو کھلا کہ یہ باقاعدہ نظری وابستگی کے ساتھ ایک عملی رویہ کی اظہاری صورت ہے۔ یہ مقام اس وقت آتا ہے جب شاعر نظم کے پلاٹ کے کلائمیکس پر پہنچتا ہے۔ یہ لائن ملاحظہ کیجیے:
- ”اک عادت کے گھاؤ پہ دوسری عادت باندھا کرتا ہوں“
- یہاں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ عادات کا ذکر ایک نفسیاتی اصطلاح کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ یعنی انسان کی ذہنی زندگی قانون تطابق LAW OF ADAPTATION کے تحت عمل پیرا ہوتی ہے۔
- یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ جب بھی کسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ، خواہ اس کے لیے خوش کن ہو یا پریشان کن۔ اپنے مزاج، ذہنی استعداد اور حالات و وسائل کے مطابق اس صورت حال کو حیطہ دسترس میں لاتا ہے۔
- وہ خود کو اپنے ماحول ایڈجسٹ کرتا ہے۔
- یہ مرحلہ جب ایک بار طے ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لئے بہت حد تک مستقبل کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ جب آئندہ اسی طرح کی صورت حال اسے دوبارہ پیش آتی ہے تو سابقہ تجربہ ذہن کی MEMORY سے نکل کر جسمانی اعمال میں ڈھل جاتا ہے۔
- اصل میں یہ ڈھلنے کی صلاحیت کہ جسے نفسیات کی زبان میں PLASTICITY کہا جاتا ہے۔ وہ صلاحیت ہے جو کسی مادہ کو خود پذیریری عطا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر:
- ☆ آپ کوئی نیا جوتا پہنتے ہیں۔ تو وہ پاؤں پر درست نہیں آتا لیکن بار بار کے استعمال سے ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ پاؤں پر درست آ جاتا ہے۔
- ☆ بار بار کے استعمال سے قلم میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔
- گویا دوسرے الفاظ میں عادت ایک میکائیکی عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لیے اسے علم نفسیات میں SECONDARILY AUTOMATIC ACTION کہا جاتا ہے۔ کہ ابتدا میں جو عمل اولیٰ حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک خودکاری عمل کا روپ دھار کر ثانویت میں بدل جاتا ہے۔
- ثانوی خودکاری عمل کی بڑی وجہ حافظہ کی طاقت بھی ہے۔ جو طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے غیبت میں چلا جاتا ہے لیکن ضرورت پڑھنے پر اپنی سابقہ تمام تر لوازمیت کے ساتھ سطح ظہور پر آ جاتا ہے۔ اس طرح وہ حالی صورت کو بھی سابق صورت احوال میں

ڈھال دیتا ہے۔

○ اگر آپ غور کریں تو اس کی سائنسی توجیح بھی موجود ہے کہ جب عصی مراکز بار بار ایک ہی مہج میں سے گزرتے ہیں۔ تو اس تکراری عمل سے ان اعصابی مراکز میں LASTICITY کی صلاحیت کی وجہ سے، یعنی ڈھلنے کی وجہ سے راہیں بن جاتی ہیں۔ عضویاتی حوالے سے انھی راہوں کو ہم عادات کہتے ہیں۔

○ شاعر نے نظم کے شروع سے ایک صورت حال بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق اپنے ایک باریکے گئے فیصلہ کی روشنی میں اپنے دوسرے تجربات کی سائنسی توجیح پیش کر دیتا ہے۔ آپ شروع سے آخر تک نظم کی قرأت میں سے گزر کر دیکھیں تو ایک ہی عادت کی مماثلت نظر آئے گی۔ یعنی LAW OF ADAPTATION، یہ مماثلاتی حسن نظم کا جمالیاتی اور تکنیکی وصف ہے۔

نظم کے ابعاد کی دوسری اہم جہت عادت کے پس منظر سے جھانکتا عمل اور رد عمل کا عکس ہے۔ بلاشبہ شاعر نے قانون فطرت کے تحت آدمی کے وجود سے مشکل ہونے والی عادات کو ماحول اور صورت حال کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کیلئے ”عقلیت“ کو بہ روئے کار لانے کے عمل کی بہت اچھی وضاحت کر دی ہے جس میں عمل اور رد عمل ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ یہ ایک طرح ازالہ کی صورت بھی ہے لیکن یہاں جو سب سے اہم چیز، شاعر دکھانا چاہتا ہے۔ وہ ہے عادت کا گھاؤ جو شاعر کی شخصی، قلبی اور روحانی واردات کا حقیقی تجربہ ہے۔ یہ بہت ہی کرب انگیز مرحلہ ہے۔ اور اس امر کی وضاحت یہ ہے کہ ایک میکانیکی عمل کے پس منظر میں بھی کچھ ایسے احساسات بھی ہوتے ہیں جو زخم زخم کر جاتے ہیں۔ اس داخلی تجربہ کو محسوس کرنے کے لیے نظم کی یہی لائن: اب دوبارہ: اس زاویہ سے دیکھیں اور آخری لائن پھر سے ملاحظہ ہو:

اک عادت کے گھاؤ پہ دوسری عادت باندھا کرتا ہوں

میں عورت کے زخم کے اوپر عورت باندھا کرتا ہوں

ذرا غائر نظر سے دیکھیں تو ایک اور مکتبہ فکر بھی اسی پس منظر سے جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ ایک فلسفیانہ مکتبہ فکر EXISTENTIALISM ہے۔ اس مکتبہ فکر کی بنیادیں درحقیقت GERMAN ROMANTISISM میں پیوستہ ہیں۔ اصل میں یہ اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ”عقلیت“ کی تحریک کے رد عمل میں انفرادیت کے نام پر ایک فکری تحریک تھی۔ جو باقاعدہ فلسفیانہ تحریک تو نہیں تھی لیکن فلسفہ پر اس کے اثرات بھی بہت گہرے ہیں۔ ڈنمارک کے الہیات دان SOREN KIERKEGARD اور جرمنی کے اخلاقیات دان FRIEDRICK NIETZSHE اس کے حقیقی بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں باقاعدہ فلسفی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے فلسفہ کو متاثر کیا۔ بہت سی فلسفیانہ مباحث سے بچتے ہوئے ان کی تعلیمات سے جو اہم افکار سامنے آئے۔ (موضوع کے حوالے سے) وہ یہ ہیں:

○ اچھے حکمرانوں پر FORMS حکومت کرتے ہیں۔ اور اچھے شہریوں پر HABITS حکومت کرتی ہیں۔

○ اس نظم کی لفظیات اور اس کے پس منظر سے جھانکتی ہوئی نظری مباحث سے وحید احمد بتانا یہ چاہتے ہیں کہ وہ چاہے اچھا حکمران ہو یا اچھا شہری اس کے اندر ایک آدمی ضرور موجود ہے۔ اس پر چاہے FORMS حکومت کریں یا HABITS، اس کے باطن سے جذبات نچو نہیں ہو سکتے۔

○ عقلیت کے استعمال کے باوجود، ازالہ کے عمل و ردِ عمل کی کاوش کے باوصف، وقت اور شخصیت کے اندر کا زیاں ہوتا رہتا ہے۔
○ عادات کے استوار ہونے کے بعد بلاشبہ، وہ، ایک میکانیکی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن اس صورت کو عمل میں ڈھلنے کے لئے فیصلہ کے جس کڑے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے وہ عادت کا گھاؤ ہے۔
○ عادت کا گھاؤ ہر بار فیصلہ کے خنجر سے شخصیت کو مجروح کرتا چلا جاتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے نظم نے بہت ہی اچھوتے پہلو کا انتخاب کیا ہے۔ عادت کا گھاؤ اردو شاعری میں پہلی بار وحید احمد ہی لے کر آئے ہیں۔ ”علاج بالمثل“ وحید احمد کی فنی پختگی اور تکنیکی مہارت کا ہی نہیں ان کے وسیع مطالعہ، جذب کی بیانی مہارت اور نظم گوئی کے طبعی رجحان کا بین ثبوت ہے۔ نظم کے اندر دو لائینیں نظم کی باقی لفظیات سے بہت برتر سطح کی ہیں۔ اور امیجری، علامتی حسن و لسانی چاشنی کے حوالے سے بھی نظم کی دیگر تمام لائنوں سے برتر سطح پر موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ دو لائینیں دوسری نشست کی مشمولہ ہیں لیکن روانی و تسلسل اور موضوعی وابستگی نے انہیں نظم کے واحدے میں شامل کر رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جب شب زندہ داری میں مئے چڑھتی ہے

تو صبح صبح کی سیڑھی لگواتا ہوں

”علاج بالمثل“ ایک ایسی آزاد نظم ہے جسے نہ صرف ایک شاہکار نظم کہا جاسکتا ہے جو وحید احمد کی نمائندہ نظموں میں شامل ہے بل کہ، اسے، اردو ادب کی شاہکار نظمیں شاعری کے انتخاب میں شامل نہ کیا گیا تو نا انصافی ہوگی۔



یا سراقبال

برصغیر کی موسیقی میں ٹھمری کی روایت

ارون ایڈمن لکھتے ہیں:

"موسیقی کی ایک عجیب و غریب صفت یہ ہے کہ اصوات کے اس بے کار دائرے میں جو بھی داخل ہوتا ہے، محسوس ہو جاتا ہے، حالانکہ صدا ہائے موسیقی سوائے باہمی روابط کے ہر چیز سے غیر متعلق ہوتی ہیں۔ سوال یہ کہ اس کی تاثیر عالمگیر کیوں ہے؟"

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موسیقی انسانی جذبات و احساسات سے اتنی مربوط ہے کہ براہ راست انسانی جذبات و احساسات کو متاثر کرتی ہے، اس ربط میں جتنی گہرائی ہے اتنی ہی نفاست ہے۔ موسیقی سر، لفظ اور تال کے ایک ایسے نظام پر مشتمل ہے جو نہ صرف ہمارے ذوق سماعت کو متاثر کرتا ہے بلکہ ہمارے جسم کے ہر حصے پر اثر انداز ہو کر ہمارے تخیل میں احساس اور جذبے کی تصویریں بناتا ہے۔ دنیا میں برصغیر وہ واحد خطہ رہا ہے جہاں تہذیبی تغیرات بتدریج رونما ہوتے رہے ہیں۔ ان تغیرات نے جہاں زبان و ادب کو متاثر کیا ہے وہاں فنون لطیفہ میں بھی یہ تہذیبی تغیرات شیر شکر ہوتے رہے ہیں۔ تہذیبوں کے امتزاج سے علوم فنون میں ترقیاں و تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ جب مسلمان اس خطے میں وارد ہوئے تو اپنے ساتھ ترقی یافتہ تہذیب بھی لائے۔ جس نے مقامی تہذیبوں سے مل کر ایک نئی تہذیب کو پروان چڑھایا۔ تہذیبوں کے اس سنگم میں فن موسیقی نے نئی نئی کردٹیں بدلیں۔ کیوں کہ فنون لطیفہ میں موسیقی وہ واحد فن تھا جو مسلم حکمرانوں اور فنکاروں کی توجہ کو مرکوز بنا رہا۔ عربی، ایرانی، تورانی اور افغانی موسیقی جب یہاں کی مقامی موسیقی پر اثر انداز ہوئی تو ایک نئی موسیقی وجود میں آئی جو پہلے سے موجود موسیقی سے کافی حد تک توانا اور اثر انگیز تھی۔ اپنی دلکشی اور اثر انگیزی کی وجہ سے جلد عوام میں مقبول ہونے لگی۔ دربار کی سرپرستی میں تکمیل کے مدارج تیزی سے طے کرنے لگی۔ یہی وہ موسیقی تھی جو مسلم سنگیت کاروں کی کوششوں اور مسلم فرمانرواؤں کی قدر شناسی کے نتیجے میں پروان چڑھی مسلمانوں سے قبل یہاں کی موسیقی مندروں تک محدود تھی۔ موسیقی مذہبی امور اور عبادات کی بجا آوری کا ایک اہم ذریعہ سمجھی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی اصناف موسیقی پھند، پر بند، گیت، دوہا، اشلوک، دھور و اور پد تک محدود تھیں اور یہ تمام اصناف موسیقی مذہبی عبادات کے طریقے سمجھے جاتے تھے۔ مسلمان سنگیت کاروں نے ان اصناف کی تراش خراش کر کے نئے نئے اضافے کیے۔ مثلاً دھور و اور پد کی بندشوں کو ملا کر دھور پد وضع کیا۔ جب امیر خسرو کا زمانہ آیا تو ہندوستانی موسیقی کی شکل ہی بدل گئی، خسروی اختراعات کے نتیجے میں خیال، قول، ترانہ، نقش، بسیط اور تروٹ جیسی اصناف موسیقی سامنے آئیں۔ یہاں تک کہ یہ سفر دھور پد سے غزل گائیکی تک طے گیا۔

موسیقی کی ہر صنف نے خواص و عام میں اپنے مخصوص آہنگ کے ساتھ اپنا چلن برقرار رکھا ہے۔ برصغیر کی موسیقی یہاں کے

تہذیبی تغیرات سے بے حد متاثر رہی ہے۔ کبھی دھڑکا زما نہ رہا تو کبھی خیال نے اس کی جگہ لے لی، کبھی ٹھمری کا چلن رہا تو کبھی قوالی جیسی صنف روحانی تشفی کا ذریعہ بنی۔ یہاں تک کہ گیت، غزل اور پٹپٹ جیسی اصناف موسیقی کا دور آگیا۔ یہ تمام اصناف اپنے تہذیبی ساخت و پرداخت کے سائے میں پروان چڑھیں۔ لیکن تہذیبی و معاشرتی سرگرمیوں کا جتنا اثر ٹھمری پر پڑا اتنا دیگر اصناف موسیقی پر نہیں پڑا۔ ٹھمری اپنے خالص تہذیبی و معاشرتی رنگ کی پیداوار تھی اور یہی وجہ ہے کہ اسے نہ صرف دربار کی سرپرستی حاصل رہی بلکہ عوام نے بھی اسے خوب پذیرائی بخشی۔ ٹھمری کے بارے میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

"در بار او دھ میں جب مردانگی کو زوال اور نسوانیت کو عروج ملا اور بادشاہ اور رعایا کے اعصاب پر عورت سوار

ہو گئی تو ٹھمری نے جنم لیا۔" [مضامین موسیقی: ص-78]

اس دور کے لکھنوی معاشرے کی جو صورت حال تھی اور جس طرح کی تہذیب وہاں پروان چڑھ رہی تھی ٹھمری پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس دور میں ٹھمری اور دربار کو بے حد سراہا گیا اور عوام میں ان اصناف کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ ان دونوں اصناف کا آپس میں گہرا ربط ہے بس فرق صرف تال کا ہے۔ دونوں میں جسمانی لذت اور منظر کشی کا عنصر شامل ہے اور دونوں کا انداز گائیکی پوربی ہے۔

اصطلاحات موسیقی میں ٹھمری کا ماخذ ٹھک بتایا جاتا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ رقص و تال بتائی جاتی ہے۔ اس کی باقاعدہ ابتدا والی لکھنؤ و اجد علی شاہ جو موسیقی کے بہت بڑے رسیا تھے اور اختر پیا تلخیص کیا کرتے تھے، کے عہد میں ہوئی۔ اس دور کے معروف مغنی صادق علی خان سے اس صنف کی بنیاد رکھی تھی۔ ٹھمری کی مقبولیت میں و اجد علی شاہ کی سرپرستی اور دلچسپی کو بڑا عمل دخل ہے۔ ٹھمری خالص عورتوں کا گانا ہے جس میں عورت کی طرف سے جذبات و احساسات اور آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے غنائی اسلوب میں خاص قسم کا لوچ پایا جاتا ہے۔ ہر بول کو بنا کر اور اس کے بھاؤ بتا کر گایا جاتا ہے۔ بول کی تصویر ہاتھوں، آنکھوں، ابروؤں اور گردن کی جنبشوں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹھمری کی گائیکی میں راگ اور شاعری دونوں کا بصری تصور ایک ساتھ سامع کے تخیل میں ابھرتا ہے۔ ٹھمری آہنگ میں رومانوی جذبے اور احساس کو بنیاد بنا کر بول پیش کیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس کے بیشتر مضامین جنسی ہوا کرتے تھے۔ بعد میں اس کو حقیقی، بھر و وصال کے اظہار کا قرینہ سمجھ کے گایا جانے لگا۔ بعد میں عورتوں کی اس روش کو مردوں نے بھی اپنا لیا لیکن چوں کہ نرت بھاؤ بتانے کی گنجائش مردوں کے لیے نہیں تھی اس لیے مرد فنکاروں نے محض آواز کے مختلف اندازوں سے اس کی کو پورا کر دیا۔ لوچ دار اور پک دار لے میں پوربی اور پنجابی بولوں کو اس انداز سے گا کر پیش کیا کہ جسمانی لذت کا احساس ہونے لگا۔ یہ صنف لکھنؤ، بنارس اور پنجاب میں خوب پروان چڑھی۔

ٹھمری کی شاعری میں اظہار صنف نازک کی طرف سے ہوتا ہے اگر مرد گائیک بھی ٹھمری گائے تو وہ انداز ایسا رکھتا ہے کہ رومانیت کا اظہار اس طرح لطیف پیرائے میں کرتا ہے کہ گائیکی کے دوران اس کا مردانہ پن اس کے انداز پر غالب نہیں آتا۔ ٹھمری سے پہلے کی اگر اصناف کا جائزہ لیا جائے تو ان اصناف کی شاعری میں لفظ پر سر اور راگ کی پیش کش کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ لفظ اور معنی کا

رشتہ معطل رہتا تھا۔ بعض اصناف تو ایسی تھیں کہ ان میں بامعنی لفظ ہوتے بھی نہیں تھے چند مہمل لفظوں کی ترتیب کو تال میں میں باندھا جاتا تھا جیسے ترانہ ہے۔ ترانہ میں چند مہمل لفظ ہوتے ہیں جن کی بندش کو ایک تال میں باندھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

نادر در تو م دیرے دیرے دھیم تانا نانا نانا
دھیم تانا نانا تادا رے تا، تادارے تا

راگ گجری توڑی میں یہ ترانہ یک تالہ (12 ماترے) میں گایا جاتا ہے اس تال کے بول یہ ہیں:

دھن دھن دھاگے تٹ کٹ تن نا کٹا، دھاگے تٹ کٹ دھن نا دھن

اس تال کی اگر تقطیع کی جائے تو اس کے بول 12 ماتروں کے وزن پر اترتے ہیں۔

اسی طرح ابتدا میں کئی ایسی اصناف موجود تھیں جن میں اصل مقصد راگ کی پیش کش سمجھا جاتا تھا بولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی موسیقی صرف مخصوص طبقے تک محدود تھی اور وہی ان اصناف کی گائیکی سے حظ اٹھا سکتا تھا جو موسیقی کے قواعد و ضوابط کے بارے میں جان کاری رکھتا تھا۔ موسیقی عوام میں اس وقت جگہ پانے لگی جب لفظ اور اس کے معانی کو مقدم جان کر گایا جانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ کلاسیکی موسیقی کی نسبت نیم کلاسیکی موسیقی عوام میں جلد مقبول ہونے لگی۔ نیم کلاسیکی موسیقی میں ٹھمری، دادرا، گیت اور غزل بڑی مقبولیت کی حامل ٹھہریں۔ ان اصناف میں بولوں کو بامعنی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ بولوں میں جتنی معنوی گہرائی ہوگی اتنی تاثیر بڑھے گی اور سامع پر اتنا ہی گہرا اثر پڑے گا۔ برصغیر کی موسیقی میں ٹھمری گائیکی کی روایت بہت چاندانظر آتی ہے۔ عوامی طبقے نے دھروپ اور خیال کی نسبت اسے خوب سراہا ہے۔ اگر نیم کلاسیکی موسیقی کی اصناف کا جائزہ لیا جائے تو ٹھمری وہ پہلی صنف تھی جس نے عوام میں سب سے پہلے جگہ پائی اور ایک لمبے عرصے تک دنیائے موسیقی پر راج کیا۔ اس کی بنیادی وجہ ٹھمری کو ملنے والا وہ مخصوص تہذیبی و سماجی ماحول تھا جس کے اندر یہ صنف پروان چڑھتی رہی۔

ٹھمری گائیکی رقص سے بہت گہری مناسبت رکھتی ہے۔ گاتے وقت مغنی ہاتھوں کے اشارے سے اور چہرے پر موضوع کی مناسبت سے خاص قسم کے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی شعری ساخت بھی خیال کی طرح استہنائی انداز پر مشتمل ہوتی ہے۔ مغنی مرکبوں اور تانوں سے اس کے استہنائی، امترہ کو مزین کر کے پیش کرتا ہے اور موضوعی تاثر پیش کرنے کے لیے مختلف غنائی ارادے بناتا ہے اور ان غنائی ارادوں سے لفظوں کی مختلف معنوی تعبیریں ابھارتا ہے۔ ٹھمری کو خیال کی مختصر شکل بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ بنیادی طور پر دونوں کی شعری اور غنائی ساخت پر داخت ایک جیسی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خیال میں ٹھمری کی نسبت سروں کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور راگ کی صحت اور شکل کا بھی زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ دوسرا خیال میں ہر قسم کی تان کا استعمال ہوتا ہے جبکہ ٹھمری میں یہ قید ہے کہ صرف بول تان اور پھرت تان کا استعمال ہو اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ زیادہ لمبی تانوں اور گمک کے زیادہ پھیلاؤ سے ٹھمری گائیکی بے اثر ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے گویے ٹھمری کو اس کے مخصوص آہنگ کے ساتھ پیش نہیں کر پاتے۔

جیسا کہ اس کی ابتدا صنف نازک کے حلقوں سے ہوئی یہی وجہ ہے کہ ٹھمری گائیکی میں نسوانی آوازیں بہت تھیں جبکہ مردانہ آوازوں میں اس کی ابتدا بعد میں ہوئی۔ مردانہ آوازوں میں استاد بڑے غلام علی خاں کا نام نمایاں ہے۔ شام چوراسی گھرانے کا بھی ٹھمری گائیکی میں بہت بڑا کردار رہا ہے۔ استاد سلامت علی خان کی گائی ہوئی ٹھمریاں جذبے اور احساس میں گندھی ہوئی ہیں۔ استاد بڑے غلام علی نے ٹھمری گائیکی کو جس انداز سے نبھایا ہے اور ٹھمری کا جو مقام متعین کیا ہے کوئی دوسرا متعین نہ کر سکا۔ ذیل میں استاد بڑے غلام علی خان کی آواز میں گائی ہوئی معروف ٹھمریوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چند معروف نسوانی ناموں کا بھی ذکر پیش نظر رہے گا تاکہ ٹھمری کی روایت اور اس کے مخصوص آہنگ کو سمجھا جاسکے۔

یاد پیا کی آئے۔۔۔

یہ دکھ سہ نہ جائے

بالی عمر یاسن رے بھریا

جو بن بیتا جائے۔۔۔ ہائے رام

راگ بھینا شدرج (Bhinna shadaj) میں اس کی بندش ہے راگ بھینا شدرج جس کو کئی دیگر معروف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اس راگ کا ٹھاٹھ بلاول ہے، وادی سرمدھم (ما) ہے اور سم وادی سرکھرج (سا) ہے اس راگ کے گانے کا وقت آدھی رات کا بتایا جاتا ہے۔ انجم شیرازی صاحب نے اپنی کتاب مبادیات موسیقی میں اس ٹھمری کا راگ مانڈ بتایا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے۔ اس راگ کے کئی اور بھی نام ہیں بہر حال مانڈ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اس راگ کو کوٹشک دھنی اور ہنڈولی جیسے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ حوالے کے لیے ذیل میں ایک Statement ملاحظہ کریں:

Bhinna shadaj is an adav-jati raga with the following swara profile:

Saa,Gaa,Maa,Dhaa,Ni Saa

The Rishab(rikhab)and Puncham are varjit.It is Known by several other names:kaushik dhawni, Hindoli, audav Bilawal and Bhookosh.

(See Raga vyakarana by Vimalakanta Roy Choudhury Vani Prakashan,

1998and Raga nidhi by B.Subba Rao(Music Acadmy, Madras)

یہ تو اس ٹھمری کے متعلقہ راگ کے بارے میں چند گزارشات تھیں تاکہ متعلقہ راگ کی روشنی میں اس ٹھمری کو سنا اور سمجھا جاسکے۔ استاد بڑے غلام علی خان کی گائی ہوئی یہ ٹھمری اپنے اندر ٹھمری گائیکی کی تمام رعنائیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ خاں صاحب کا غنائی انداز اور راگ کا رچاؤ ٹھمری کی تاثیر کو بڑھادیتے ہیں۔ استاد بڑے غلام علی خان کو ٹھمری گائیکی پر مکمل دسترس حاصل تھی، خوبصورت مرکبوں، تانوں

اور بہلاؤں سے جس طرح سے ٹھمری کے بولوں کو آراستہ کر کے پیش کیا ہے بے مثال ہے۔ خاں صاحب نے اس ٹھمری کو گاتے ہوئے اس طرح بولوں کی پیش کش کی ہے کہ سامع کے تخیل میں نہ صرف بولوں کی امیجری بنتی نظر آتی ہے بلکہ راگ کے بصری تصور کو بھی ساتھ ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ٹھمری کے بولوں میں جدائی کی گہری کسک اور وصال کی شدید تڑپ پائی جاتی ہے۔ بولوں میں پائی جانے والی ان کیفیات کو راگ کے بصری تصور سے ابھارا گیا ہے۔ جس سے ٹھمری سامع کے تخیل میں پراثر انداز ہو کر اس کے اپنے جذبات و احساسات کا حصہ بنتی نظر آتی ہے۔ استاد بڑے غلام علی خان کی یہی انفرادیت اس کی ہر ٹھمری میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی گائی ہوئی ایک اور ٹھمری ملاحظہ کریں:

”آئے نہ بالم کا کروں سجنی، تڑپ تڑپ بیتی موری تم بن ریتیاں“

اس ٹھمری کو راگ کروانی میں گایا گیا۔ راگ کا ٹھاٹھ کروانی ہے اور یہ سمپورن راگ ہے۔ اس راگ کو گانے میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ وادی سر اس راگ کا رکھب ہے اور سم وادی سر پنچم ہے۔ انجم شیرازی صاحب کی مبادیاتِ موسیقی میں بھی اس ٹھمری کا راگ بھیرویں بتایا گیا جو درست نہیں ہے۔ راگ کروانی میں پیش کی گئی اس ٹھمری میں بلا کا غنائی حسن موجود ہے۔ اور اس کی معنوی تاثیر بھی بڑی توانا ہے۔ اس ٹھمری میں سروں کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ طرح طرح کی غنائی تراکیب میں بولوں کو ادا کیا گیا ہے۔ بڑے غلام علی خان کے غنائی اسلوب کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ ٹھمری گاتے ہوئے وہ بہت آزاد رہتے تھے۔ ٹھیکے کی لے پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ کوئی بھی بول متعلقہ ٹھیکے کے وزن سے باہر ادا نہیں ہوتا تھا۔ لے کاری اور راگ داری سے نہ صرف خود حفظ اٹھاتے تھے بلکہ سازندے بھی گانے بجانے کے اس عمل سے لطف اٹھاتے تھے۔ یہی ایک پختہ کار فنکار کی علامت ہوتی ہے کہ وہ جس فن کو پیش کر رہا ہوتا ہے اس کی اصل روح سے خود تو آشنا ہوتا ہی ہے ساتھ ساتھ سامعین کے لیے بھی یہ سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔ استاد بڑے غلام علی کے ساتھ ساتھ شام چوراسی گھرانے نے بھی ٹھمری کی روایت کو زندہ رکھا اور اسے خوب نبھایا۔ استاد سلامت علی خان کی آواز میں گائی ہوئی ٹھمریاں اس روایت میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ نسوانی آوازوں میں دیکھا جائے تو بیگم اختر بائی فیض آباد والی کو بھی ٹھمری گائیکی میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی اکثر غزلیں ٹھمری انگ میں گائی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر مومن خان مومن کی گائی ہوئی غزل ”وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو“ بیگم اختر بائی کے ہاں لفظ کی ادائیگی بہت صحت مند نظر آتی ہے اور بولوں کو خوبصورت تان مرکبوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ گاتے ہوئے راگ کا پھیلاؤ بہت واضح نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ گوہر جان بھی ٹھمری کی روایت میں ایک اہم نام ہے انھوں نے خیال، ٹھمری، دادر، کجری، غزل اور گیت جیسی اصنافِ موسیقی کو خوب گایا بلکہ 1902 میں کلکتہ میں پہلی بار گراموفون کا آغاز ہوا تو گوہر جان نے مرزا غالب کی غزل: ”یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا“ پیش کی اور غزل کے اختتام پر گانے والی کی نسوانی آواز گونجی:

"مائی نیم از گوہر جان"

گوہر جان کے بعد عنایتی بائی ڈھیر والی نے بھی ٹھمری انگ کو خوب نبھایا۔ برصغیر کی موسیقی میں ٹھمری کی روایت اتنی مضبوط رہی کہ اس نے نیم کلاسیکی موسیقی کی ہر صنف کو متاثر کیا۔ غزل، ڈپے، گیت کی اگر ابتدائی گائیکی دیکھی جائے تو ان پر ٹھمری انگ کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ کئی اور بھی نام ہیں جنہوں نے ٹھمری کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں نئے نئے غنائی تجربات کا اضافہ کیا۔

آخر پر اس حقیقت کے ساتھ گفتگو سمیٹتا ہوں کہ بہت سی چیزیں وقت اور تہذیب کے دھارے میں گم ہوتی رہی ہیں۔ ہر چیز اپنے مخصوص تہذیبی ماحول میں پروان چڑھتی ہے۔ جب تک اس کو اپنی تہذیبی فضا میسر رہتی ہے وہ سماج میں زندہ رہتی ہے اور جب تہذیب کوئی نئی کروٹ بدلتی ہے تو نئے کلچر میں نئی چیزوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں لے لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ٹھمری کو اس کا مخصوص تہذیبی ماحول میسر رہا تو سماج میں اس کی روایت زندہ رہی۔ آج ٹھمری گانے اور سننے والوں کی تعداد پاکستان میں تو نہ ہونے کے برابر ہے البتہ بھارت کی کچھ ریاستوں میں آج بھی نئی نسل ٹھمری انگ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ جات:

- 1۔ موسیقی ہند، کے۔ ایل۔ رلیارام، مرکٹائل پریس، لاہور، 1930
2. The lost world of Hindustani Music written by kumar Prasad Mukhar ji, university press, Karachi Oxford
- 3۔ برصغیر کی موسیقی، عنایت الہی ملک، مجلس ترقی ادب، لاہور 2009
- 4۔ راگ درپن کا تنقیدی جائزہ مع متن و ترجمہ، رشید ملک، مجلس ترقی ادب، لاہور 1998
- 5۔ مضامین موسیقی (شاہد احمد دہلوی) مرتب: عقیل عباس جعفری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی، 2011
- 6۔ سر سنسار، پروفیسر شہباز علی، غلام مصطفیٰ پرنٹنگ پریس، لاہور، 2002
- 7۔ مبادیات موسیقی، انجم شیرازی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2005

رفیع الدین ہاشمی

داستانے ازدکن آوردہ ام

(بھارت کا ایک سفر)

میری عمر کے پاکستانیوں نے جب ہوش سنبھالا اور برعظیم کی تاریخ کا مطالعہ کیا تو عمر کے ساتھ جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا، بھارت میں مسلم آثار کو دیکھنے کا شوق بھی بڑھتا گیا کیوں کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر اپنے سیکڑوں سالہ دور حکومت میں یہاں کے چپے چپے پر اپنی تہذیب و ثقافت اور حکمرانی کے نقوش ثبت کیے۔ قلعے، مسجدیں، مقبرے، مزار، محلات، عمارات، کنویں اور باولیاں، سڑکیں اور شاہراہیں، پھر رسوم و رواج، ادب و آداب، طور اطوار، لباس اور پوشاک، کھیل اور تماشے، میلے ٹھیلے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اب بھی مسلمانوں کے اثرات سے خالی ہو۔ انگریزوں نے دلی پر قبضہ مستحکم ہونے کے بعد مسلم عہد حکومت کی بہت سی عمارتوں، مسجدوں اور مقبروں کو وسیع پیمانے پر گرا دیا۔ اس کے باوجود دلی میں اب بھی مختلف ادوار کی چھوٹی بڑی بسیوں بلکہ شاید سیکڑوں یادگاریں باقی ہیں۔ (گو، موجودہ بھارتی حکومت کی اشیر باد سے بعض لوگ اور پارٹیاں باہری مسجد کے انہدام کے بعد باقی آثار اور یادگاروں کو بھی مٹانے کے درپے ہیں۔)

لیکن مجھ ایسوں کے لیے بھارت کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور مجبوریاں حائل رہیں اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد اُن پابندیوں میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔

کئی سال بعد ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن کی طرف سے عالمی اقبال سیمی نار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس پہلے دعوت نامے کے بعد، ایک ایک دو دو سال وقفوں سے ادبی کانفرنسوں اور سیمی ناروں کے دعوت نامے ملنے لگے۔ ۱۹۸۶ء سے اب تک تیس اکتیس برسوں میں تقریباً تیس دعوت نامے ملے ہوں گے جو مختلف شہروں سے تھے۔ دہلی، علی گڑھ، احمد آباد، حیدرآباد، پٹنہ، کلکتہ، بنگلور، رائے بریلی، اعظم گڑھ اور لکھنؤ مگر افسوس ہے کہ میں صرف دو بار بھارت جاسکا۔ اور ان دوسفروں میں بھی صرف تین ہی شہروں (دہلی، حیدرآباد اور بھوپال) کی زیارت کر سکا۔ سب سے زیادہ قلق سری نگر نہ جاسکے کا ہے۔

سری نگر کے ذکر سے تصور میں کشمیر کی وادیوں، کوہساروں اور جھیلوں کی تصویریں بننے لگتی ہیں اور اقبال کا یہ شعر ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

مرغان سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

دراصل نادیدہ کے تصور میں بھی ایک رومان ہوتا ہے۔ ”آتش چنار“ کا نظارہ تو ہم نے کئی بار ایبٹ آباد میں کیا (یہ کئی سال

پہلے کی بات ہے) مگر ”وادی لولاب“ کیسی ہوگی۔۔۔۔۔ شاید شمالی علاقہ جات کے بعض مناظر کی طرح۔۔۔۔۔ مگر نہیں، ان

سے فرد تر۔ علامہ اقبال کو فقط ایک ہی بار کشمیر جانا نصیب ہوا مگر ان کی ساری عمر کشمیر کو ”کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں“ کی کیفیت میں گزری۔ کلام اقبال کو پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حسین حیات کسی نہ کسی عنوان یا کسی نہ کسی حوالے سے (ساقی نامہ۔ کشمیر۔ غنی کشمیری۔ ملا ضیغم لولابی کی بیاض آب ولر۔ آتش چنار۔ وادی لولاب۔ ایران صغیر۔ سیاہ چشمان کشمیری۔ پیرک اندرابی۔ ولر کے کنارے۔ نطہ گل) وہ کشمیر کو یاد کرتے رہے۔

اقبال اکیڈمی کے مذکورہ بین الاقوامی سیمی نار میں سات حضرات (ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر جمیل جالبی، عبدالرؤف عروج، انتظار حسین، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور راقم مدعو تھے مگر صرف عقیل صاحب اور راقم ہی شریک ہو سکے البتہ اقبال کا سیاسی کارنامہ کے مصنف محمد احمد خاں اور معروف سیرت نگار مصباح الدین ثقلیل صاحبان اپنے طور پر حیدر آباد گئے تھے اور سیمی نار میں شریک ہوئے۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء: میں تقریباً نو بجے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم پُرجوم اور افراتفری۔ مسافر زیادہ، جگہ کم۔ برادرم تحسین فراقی اپنے ایک دوست فاضل صاحب کو ساتھ لائے تھے۔ ان کی وساطت سے امیگریشن اور کسٹم کے مراحل آسان۔ پاسپورٹ پر Exit کی مہر لگنے کے بعد، میں ریل کے درجہ اوّل میں بیٹھ گیا۔ سامان ایک درمیانے سے اچھی اور کتابوں کے دوکارٹونوں پر مشتمل تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے مسافر آنا بند ہو گئے۔ لوگ مع سامان بہت آچکے تھے۔ بچے اور بچیاں، جوان اور بوڑھے، باپردہ خواتین (بعض صرف بادوپیٹہ)، ان کے ساتھ چھوٹے بڑے اچھی، گھڑیاں بلکہ بڑے بڑے گھڑاں اور ساتھ ہی چیخ پکار، شور و غوغا، بہت ذہنی کوفت ہوئی۔ ٹی ٹی نے ازراہ کرم مجھے متصل کوپے میں بٹھا دیا جو کسی سابق ریلوے افسر کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں کل پانچ افراد تھے۔ ریل تقریباً ایک بجے روانہ ہوئی اور تین چار گھنٹے کا یہ عرصہ اخبارات و رسائل پڑھنے، اونگھنے اور ہجائیاں لینے (رات دیر سے سویا تھا اور صبح بہت جلد اٹھ گیا۔ سفر میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے) اور پلیٹ فارم پر آنے والے مسافروں کے مشاہدے میں گزرا۔

ریل، لاہور ریلوے اسٹیشن سے چلی تو واہگہ سے آگے دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ اور پکی ہوئی گندم کے سنہری کھیت دور تک چلے گئے تھے۔ ایک جگہ کھیتوں میں سُروں کے ریوڑ نظر پڑے۔ ریلوے افسر کی بیوی نے منہ بنا کر ناک کے آگے پلور رکھ لیا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم حدودِ وطن سے نکل کر بھارت میں داخل ہو گئے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ریل گاڑی اٹاری جا کھڑی ہوئی۔

بھارت کا یہ پہلا سفر تھا مگر بھارتی سرزمین پر، میں دوسری بار قدم رکھ رہا تھا۔

یہ الگ قصہ ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ کے بعد جنگ بندی (ceasefire) ہوئی تو بھارتی قصبہ کھیم کرن (بعض روایات کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت اسی قصبے میں ہوئی، مگر اُن کے مداحین اس کی تردید کرتے ہیں۔) پاکستانی فوج کے زیر قبضہ تھا۔ ہمیں وہاں جانے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ اب اٹاری اترتے ہوئے، گویا میں بھارت کی سرزمین

پر دوسری بار قدم رکھ رہا تھا۔ حکم ہوا: مسافر، ریل سے سامان اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیں، ریل خالی کر دیں۔

دلی سے لاہور آنے والی ریل ابھی نہیں پہنچی تھی۔

لمبی لمبی قطاریں۔ پہلے گیٹ پاس، پھر نمبر لگا، پھر ہیلتھ کی مہر، ناواقفوں سے ۱۰،۵ روپے ہتھیلیا لیے۔ ایک جگہ پاسپورٹ کا اندراج، ۲۰ روپے رکھوا لیے۔ یہ سب ”غیر سرکاری“ فنڈ۔

ایک سردار جی سامان کی پڑتال کر رہے تھے۔ قطار میں لگا، باری آئی تو کتابوں کے ڈبے میز پران کے سامنے رکھ دیے۔
”کیا اے اپناں وچ؟“

”کتاباں۔“

”اچھا، کھولو، دکھاؤ۔“

دیکھ کر کہنے لگے: ”ایہیں کتاباں؟“

میں نے کہا: ”دوستاں لئی لے جا رہا ہوں، تجھ تھائف اے“

کچھ رد و قدح کے بعد کتابیں ”پاس“ ہو گئیں۔

مجھے مشفق خواجہ یاد آ گئے ہیں۔ شاید ۱۹۸۷ء میں مشفق خواجہ اور ان کی بیگم بھارت کے دورے پر گئے۔ تاریخی آثار دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی جمع کرتے رہے۔ کچھ تحفے میں ملیں بہت سی خریدیں۔ تقریباً دس بارہ بوریاں کتابوں کی بن گئیں۔ اب یہ پاکستان لے جائیں تو کیسے؟ ہوائی جہاز میں تو ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ فکر مند تھے مگر ڈاکٹر خلیق انجم نے انھیں اطمینان دلایا کہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ خواجہ صاحب کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ساتھ دہلی کے اندر گاندھی ہوائی اڈے پر گئے۔

سامان کے کاؤنٹر پر ایک سردار جی براہمان تھے۔ وہ بورلیوں پر معترض ہوئے۔ خلیق انجم نے ذرا سے جھک کر ان کے کان میں کہا: ”آپ کو پتا نہیں یہ پاکستان کے بہت بڑے صحافی اور لکھاری ہیں۔ خالصتان تحریک کی حمایت میں مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔“ یہ سننا تھا کہ سردار جی نے کہا: ”جاؤ، جاؤ، لے جاؤ، لے جاؤ۔“

ساڑھے تین بج گئے، بھوک لگ رہی تھی۔ سوا تنڑا کمار پوریاں تل رہا تھا۔ چائے بھی میسر تھی مگر سوا تنڑا کمار کی بنائی ہوئی پوریاں کھانے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ بسکٹ اور چنوں پر گزارا کیا جو مسافر نے گھر سے نکلتے وقت ازراہ احتیاط بیگ میں رکھ لیے تھے۔

پلیٹ فارم پر ”کرنسی تبدیل“ کے کئی کاؤنٹر نظر آئے۔ سو روپے کے ۸۵ بھارتی روپے۔ بعد میں پتا چلا سو کے سولنے چاہئیں تھے۔ (پھر غچہ دے گئے، پہلے ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے، پھر اقوام متحدہ میں پنڈت نہرو کی دُہائی اور جھوٹے وعدے کے ذریعے، کہ ہم کشمیر میں استصواب کرائیں گے، اور پھر معاہدہ تاشقند کے ذریعے)۔

دو خط لکھے تھے کہ دہلی سے ریل آ گئی۔ خط لاہور جانے والے ایک پاکستانی کو دیے کہ لاہور جا کر پوسٹ کر دیں۔ شام چھ

بجے دہلی والی ریل میں بیٹھ گیا۔ اناری تا دہلی درجہ اول کا ٹکٹ ۱۸۰ روپے۔ قلی پچیس روپے۔ ریل پتا نہیں کب چلے گی؟ ساڑھے نو بجے اوپر کی برتھ پر لیٹ گیا۔ دو گھنٹے بعد ریل چل پڑی۔ رات بھر جاگتا سوتا رہا۔ امبالے رکی، فجر کا وقت تھا۔ ریل کا غسل خانہ ہماری ریلوں کے غسل خانوں سے کشادہ۔ نماز فجر، تلاوت۔۔۔ مشاہدہ کرنے لگا۔ کرنال، کوروکشتیر، پانی پت (حالی یاد آئے)، سونی پت۔ ریل تقریباً ساڑھے دس بجے دہلی کے ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئی۔

پرانی دہلی کا سمیر ہوٹل، بلی ماراں، کراہیہ: ایک شب دروز پچاس روپے۔ ۱۶/۱۷ اپریل کو دہلی میں کچھ دوستوں سے ملاقاتیں اور کچھ مشاہدات (ان کا ذکر دہلی کے احوال میں آگے چل کر ہوگا)۔

۱۷ اپریل کی شام ۵ بج کر ۵۰ منٹ پر ایرانڈیا کی پرواز IC 540 سے روانہ ہو کر ۸ بجے شب حیدرآباد پہنچا۔ اتفاق سے عین اسی وقت سری نگر سے آنے والی پرواز سے ڈاکٹر شکیل الرحمن بھی حیدرآباد ہوائی اڈے پہنچے تھے۔ انتظار گاہ میں باہمی تعارف ہوا۔ میں نے گذشتہ شب اقبال اکیڈمی کے نائب ناظم محمد ظہیر الدین صاحب کو تار دیا تھا کہ ایرانڈیا کی پرواز سے حیدرآباد پہنچ رہا ہوں۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ تار انھیں نہیں ملا۔ رحیم قریشی صاحب اور خواجہ ناصر الدین صاحب شکیل الرحمن صاحب کو لینے آئے تھے، اچانک مجھے پا کر بہت خوش ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں، مجھے بھی انھوں نے پریذیڈنٹ ہوٹل پہنچا دیا۔ اگر وہ نہ ملتے تو سخت پریشانی ہوتی کیوں کہ ہوائی اڈا شہر سے تقریباً پچاس میل کی دوری پر واقع تھا۔ مسافرات کے ٹھکانے سے بے خبر، کہاں جاتا۔

پر پریذیڈنٹ ہوٹل معظم جاہی روڈ پر قلب شہر میں واقع تھا۔ کمر نمبر ۵ میں مقیم۔ دیر ہو چکی تھی، ہوٹل کا کچن بند ہو چکا تھا مگر چائے میسر آ گئی۔ کچھ اور کی ضرورت بھی نہ تھی اور بھوک نہ تھی کیوں کہ جہاز میں کچھ کھا لیا تھا۔

۱۸ اپریل: نماز فجر کے بعد افضل گنج تک سیر کے لیے گیا۔ موسیٰ ندی کے کنارے جھگیاں انتہائی غلیظ، مکیں مفلوک الحال۔ فٹ پاتھوں پر بہت لوگ سو رہے تھے۔ عثمانیہ ہسپتال کے سامنے کالا کسی زمانے میں خوب صورت پارک رہا ہوگا۔ اب تو ایک گوشے میں چند قبریں ہیں خستہ حالت میں اور ارد گرد غلاظت۔۔۔ فاتحہ پڑھی اور واپس۔

ناشتہ کمرے ہی میں مل گیا۔ سہمی نارسہ پہر میں شروع ہونے والا تھا۔ معلوم ہوا پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر عبدالحق اور معین الدین عقیل بھی پہنچ گئے ہیں۔ اسلوب صاحب سے خط کتابت تو تھی، اب ملاقات باعث مسرت۔ ان کی تحریروں سے ان کی شخصیت اور مزاج کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ ملاقات سے قربت کا احساس بڑھ گیا۔ سہمی نار کا مفصل پروگرام موصول ہو گیا۔

معروف محقق، نقاد اور مترجم جناب حسن الدین احمد صاحب سے ملاقات مقصود تھی۔ عقیل صاحب نے فون کیا۔ انھوں نے گاڑی بھیج دی۔ ان کے مکان ”عزیز باغ“ میں تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات رہی۔ حسن الدین احمد کا تعلق حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ ان کے دادا نواب عزیز یار جنگ ولا ریاست میں اونچے مناصب پر فائز رہے۔ محقق اور جامع الکمالات شخصیت تھے۔ بیسیوں کتابوں کے مصنف۔ دو جلدوں میں تاریخ النوائط لکھی۔ لغت آصفیہ ۱۴ جلدوں میں مرتب کی، صرف ’ج‘ تک ہو

سکی۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ حسن الدین احمد کی وضع دار شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ میں نے انھیں اپنی دو کتابیں پیش کیں۔ انھوں نے بھی اپنی چار تصانیف تصانیف عنایت کیں۔ دادا کی طرح وہ بھی ایک محقق اور سکالر ہیں۔ ”انگریزی نظمیں کے منظوم اردو تراجم“ پر انھوں نے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اپنے مقالے کے علاوہ انھوں نے منظوم تراجم کو مرتب کر کے دس جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ عزیز ولا سے نکل کر ہم حتمی بک ڈپو پر گئے، چند کتابیں خریدیں۔ وہاں سے مکہ مسجد میں نماز جمعہ۔ قطب شاہی عہد کی یہ تاریخی مسجد پتھر کی ہے۔ مسجد میں صفائی عنقا۔ وضو کے لیے تالاب ہیں، استنجائے گندے۔ شامیانے کم، نمازی زیادہ۔ گرمی تھی مگر کئی لوگ شیروانی میں ملبوس، حتیٰ کہ ایک بھکاری بھی شیروانی پہننے بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ گداگر بہ کثرت۔

نظام عثمان علی کے پوتے شہزادہ مخرجاہ نماز جمعہ پڑھنے آئے ہوئے تھے۔ ساتھ ترکی ٹوپوں والے ذاتی محافظ گریہ سرکاری پولیس کے ماتحت تھے۔ مسجد سے نکل کر بالکل قریب ہی چار مینار دیکھا۔ چار سو سالہ پرانی یادگار، پُر شکوہ اور عالی شان۔ اس کے ایک کونے میں ہندوؤں نے ایک مندر بنالیا ہے۔

عقیل صاحب نے عقب میں ایک کہنہ کتاب فروش کی دکان تلاش کی۔ دام زیادہ تھے تاہم چند کتابوں کی فرمائش لکھوا کر واپس ہوئے۔ کچھ دیر آرام کیا، بعدہ، سب مندوبین جلسہ گاہ پہنچے۔ نمائش کا افتتاح ہو چکا تھا۔ جگن ناتھ آزاد اور دیگر مندوبین سے ملاقات ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت سید مظفر حسین برنی نے کی۔ اُن دنوں وہ صوبہ بہار کے گورنر تھے۔ اسٹیج پر وزیر اعلیٰ بھی براجمان تھے۔

اس اجلاس کی مفصل کارروائی ”اقبال پر ایک یادگار اجتماع“ کے عنوان سے مجلہ اقبالیات لاہور (جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء) میں لکھ چکا ہوں۔ افتتاحی اجلاس کی ایک دو باتیں قابل ذکر ہیں: ایک یہ کہ آغاز ”ترانہ ہندی“ (سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا) سے ہوا، جسے مقامی فائن اکیڈمی کے فن کاروں نے سازوں کی مدد سے گایا۔ ”ہندی ہیں ہم“ کے ٹکڑے کو بطور خاص تین مرتبہ گایا گیا۔ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ این ٹی رامارائو کی سہ لسانی (انگریزی، تیلگو، اردو) تقریر بہت دل چسپ تھی۔ تقریر کے بعد انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں ”ترانہ ہندی“ ”ہندوستانی بچوں کا قومی گیت“ اور ”نیا شوالہ“ کے بعض اشعار لہک لہک کر پڑھے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ان کے ہندی زدہ لہجے نے محفل کو شگفتہ بنا دیا۔ انھوں نے بعض مصرعے اس انداز سے پڑھے کہ سامعین کو لطف دے گئے، مثلاً:

☆ جس نے ”ججاجیوں“ کو دشتِ عرب سے چھڑایا

☆ مٹی کو جس نے ”جر“ کا اثر دیا تھا

☆ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ”جرہ“ دیوتا ہے

برنی صاحب کی صدارتی تقریر طویل اور اُکتا دینے والی تھی۔ خاص طور پر اسلوب صاحب بہت منعّض تھے۔ کہنے لگے:

جب مجھے پتا چلا کہ سسی نار میں برنی صاحب بھی آرہے ہیں تو میں نے شمولیت کا ارادہ منسوخ کر دیا مگر دہلی سے حیدرآباد کی بکنگ کراچکا تھا، چلا آیا۔

۲۰ اپریل (اتوار) کو سہ پہر کے اجلاس میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ علی سردار جعفری تقریر کر رہے تھے کہ عقب سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور آگے بڑھ کر نہایت پھرتی سے سردار جعفری کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈال دیا۔ پھر اسی تیزی سے مڑ کر بھاگ گیا۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے لپکے مگر وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ منتظمین کی کوشش سے اس شرمناک حرکت کی خبر، ایک آدھ کے سوا کسی اخبار نے نہ شائع کی۔ اجلاس کے دیگر مقررین اور منتظمین نے اس کی مذمت کی۔

نوجوان کی اس حرکت کا پس منظر یہ ہے کہ ان دنوں بھارتی حکومت نے کچھ ایسے عالمی قوانین منظور کیے تھے جو شریعت اسلامیہ سے متصادم تھے۔ مسلمان اس کے خلاف پورے بھارت میں احتجاج کر رہے تھے مگر ترقی پسند گروہ حکومت کا مؤید تھا۔ سردار جعفری ترقی پسندوں میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹ اپریل کو پہلے سیشن کی صدارت گوپال ریڈی نے کی تھی، انھوں نے تیگلو میں اقبال کے منتخب کلام کا ترجمہ کیا ہے۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے ”اقبال بحیثیت شاعر“ پر زور دیا۔ اس سیشن میں بھی ”سارے جہاں سے اچھا۔۔۔“ کی لے نمایاں رہی۔ سسی نار کے سامعین میں دکن کے دور دراز علاقوں سے والوں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے محبان اقبال شامل تھے۔ سکول کالجوں کے اساتذہ، ریلوے کے ملازم، ڈاک خانے کے انسپکٹر، انجینئر اور دیگر ملازمین۔ معلوم ہوا، پر بھنی (حیدرآباد سے ۲۱۰ میل دور) میں بھی کچھ عقیدت مندوں نے اقبال اکادمی قائم کر رکھی ہے۔

سسی نار کے مندوبین میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر ثار احمد فاروقی سے تو ملاقات تھی۔ باقی اصحاب کی زیارت پہلی بار ہوئی۔ شمس الرحمن فاروقی، عبدالستار دلوی، ممنون حسن خاں، آفاق احمد، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، کلکیل الرحمن، عمر کٹی وغیرہ۔

سسی نار ختم ہوا تو دہلی واپسی میں تین روز باقی تھے۔ ظہیر الدین صاحب نے ہمیں حیدرآباد کے قابل دید مقامات دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ چنانچہ صبح ناشتے کے بعد انھوں نے ہمیں وجیہ الدین احمد کی راہ نمائی میں حیدرآباد کی سیاحت پر روانہ کر دیا۔ وہ خود بہت دنوں سے چھٹی پر تھے۔ آج دفتر میں حاضری ضروری تھی۔ وجیہ الدین احمد ہمیں ایک موٹر میں لے چلے۔ وجیہ صاحب مقامی اوپن یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار تھے۔ میری طرح تھے تو دھان پان مگر مہمانوں کی خاطر تواضع اور رہنمائی میں انھوں نے کمال مستعدی دکھائی۔ دن بھر مختلف یادگاریں دیکھنے میں گزرا۔ ان میں مکہ مسجد، چار مینار، سالار جنگ میوزیم، جامعہ عثمانیہ، قطب شاہی مقبرے، قلعہ گول کند اور بعض ڈیم شامل تھے جن میں بارش کا پانی ذخیرہ کر کے حیدرآباد شہر کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

یوں تو سبھی یادگاریں قابل دید تھیں لیکن سالار جنگ میوزیم نوادرات و عجائبات سے معمور تھا، جہاں ہم ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی

گزار سکے مگر جی چاہتا تھا کہ کم از کم ایک دن یہاں بسر کیجیے۔ ایک جگہ ایک بہت بڑا کلاک بنا ہوا تھا۔ بنانے والے نے ایسی تکنیک سے بنایا تھا کہ ہر گھنٹے کے موقع پر کلاک کے عقب سے ایک آدمی نمودار ہوتا تھا اور وقت کی مناسبت سے دو بجے ہوں تو دو دفعہ، تین بجے ہوں تو تین دفعہ، علیٰ ہذا القیاس، بارہ بجے تک گھنٹا بجاتا تھا، جس طرح اسکولوں میں ٹن ٹن کی گھنٹی بجاتے ہیں۔ سالار جنگ میوزیم کیا چیز ہے۔ اس کے مفصل تعارف کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مختصر یہ کہ میوزیم کی وہ عمارت ۳۵ کمروں پر مشتمل تھی جس میں ۳۵ ہزار اشیائے نمائش کے لیے رکھی ہوئیں تھیں۔ مختلف ممالک کے لباس، جوتے، فرنیچر، برتن، گھڑیاں، قالین، تصویریں، پلنگ، کمبل، پتکے، آلات زراعت، جنگی اسلحہ اور ہتھیار، الماریاں، چو لھے، کھیلوں کا سامان اور مصوری کے نمونے (ان میں عبدالرحمن چغتائی کے فن پارے بھی ہیں) وغیرہ۔ ایک ایک چیز کے دس دس پندرہ پندرہ نمونے اور اقسام۔ (میوزیم اب غالباً کسی اور عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔) نواب سر سالار جنگ نے جو ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم بھی تھے، اپنے ذوق کی تسکین کے لیے دنیا بھر میں گھوم پھر کر یہ نوادرات جمع کیے تھے۔

ان کا اصل نام میر یوسف علی خاں تھا۔ والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لیے جاگیر Court of Ward کی حیثیت سے حکومت کی نگرانی میں چلی گئی اور ایک انگریز مسٹر ڈملاپ اس کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ پھر بالغ ہونے پر وہ اپنی جاگیر کے مالک بنے۔ کچھ عرصہ چیف منسٹری کی آبائی خدمت بھی انجام دی۔ سالار جنگ کو بچپن ہی سے نوادرات خریدنے کا شوق تھا۔ سیر سیاحت کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران مختلف علاقوں سے طرح طرح کے نوادرات خریدے اور کتابیں فراہم کر کر کے میوزیم میں جمع کرتے رہے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ تین منزلہ عمارت بنائیں، ہر منزل کے ۱۰۰ کمرے ہوں، مجوزہ عمارت کا نقشہ بنا، زمین منتخب ہوئی مگر عملاً ابھی کچھ نہ کر پائے تھے کہ اللہ میاں نے بلا لیا۔

جب سالار جنگ فوت ہوئے تو حکومت اور ورثا کے درمیان کئی سال کشمکش رہی، ایک عارضی کمیٹی نے انتظام سنبھالا جس کے تحت سالار جنگ کے مکان کے بڑے حصے میں میوزیم تو قائم رہا مگر صدر کمیٹی نے کتب خانے کو نظر انداز کر دیا۔ خدا بھلا کرے، انجمن ترقی اردو اور نواب علی یار جنگ کا جن کی توجہ سے کتب خانہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ میوزیم مع کتب خانہ نشیب و فراز سے گزرتا رہا۔ کئی سال بعد یہ مرکزی حکومت کی تحویل میں چلا گیا جس نے میوزیم کے لیے ایک عالی شان عمارت کی منظوری دی۔ یہ بہت ہی نایاب ذخیرہ ہے، دس ہزار تو قلمی کتابیں ہیں اور دو ہزار ایسے مخطوطے ہیں جن کا کوئی اور نسخہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ (نصیر الدین ہاشمی، ہمساری زبان، یکم فروری ۱۹۵۹ء)

شہر میں گھومتے ہوئے کچھ دور تک ہم موسیٰ ندی کے کنارے بھی چلے۔ ندی کے کنارے بعض نہایت شاندار عمارات واقع ہیں، جیسے سرکاری ہسپتال یا کتب خانہ آصفیہ (سٹیٹ سنٹرل لائبریری) وغیرہ۔ نظام کے محلات دور سے دیکھے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے مجھے مولانا ظفر علی خان یاد آئے جنھوں نے موسیٰ ندی کی ۱۹۰۸ء کی طغیانی کے بعد حکومت کے قائم کردہ افضل گنج کے لنگر خانے کا

نہایت عمدہ انتظام کیا تھا۔ موسیٰ ندی کا یہ سیلاب بہت ہول ناک تھا جس نے بڑی تباہی مچائی تھی۔ روایت ہے کہ تقریباً ۱۵۱۰ ہزار لوگ اس طغیانی کی نذر ہو گئے۔ ۱۹۰۰ ہزار مکانات منہدم ہوئے۔ تقریباً ۸۰ ہزار افراد بے گھر ہو گئے اور تین کروڑ روپے (اس زمانے کے تین کروڑ) کا مال و اسباب برباد ہو گیا۔ عمارتوں کی چھتوں، اونچے پلوں اور درختوں پر پناہ لیے ہوئے لوگ بھی سیلاب میں بہہ گئے۔ جونہی سیلاب ختم ہوا حکومت نے کئی جگہ لنگر خانے کھول دیے۔ مولانا ظفر علی خان اس زمانے میں حیدر آباد میں مقیم تھے۔ انھیں محلہ افضل گنج کے لنگر خانے کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ کچھ سرکاری ملازمین ان کی اعانت کے لیے بھیجے گئے۔ یہ لنگر خانہ ۱۵ دن قائم رہا۔ ۵ ہزار آدمیوں کو دو وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ ظفر علی خان شاعر، مقرر اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ منتظم بھی ثابت ہوئے۔ انھوں نے کمال لیاقت و قابلیت اور حسن تدبیر و تنظیم سے لنگر خانے کو چلایا۔ حکومت کے ہندو مسلم اور انگریز عہدے داروں نے ان کی تعریف کی۔ ظفر علی خان نے تیس صفحات پر مشتمل رپورٹ مرتب کر کے رپورٹ کار گزاری لنگر خانہ افضل گنج کے نام سے شائع کر دی۔ راقم نے اپنی کتاب تفہیم و تجزیہ (لاہور ۱۹۹۹ء) میں اس رپورٹ کے حوالے سے ظفر علی خان کے کارنامے کا تعارف کرایا ہے۔ عنوان ہے: ”حیات ظفر علی خان کا ایک ورق“۔

مجھے بانگ درا کی نظم ”گورستان شاہی“ کے حوالے سے قطب شاہی بادشاہوں کے مقابر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ یہ مقابر شہر سے دس کلومیٹر باہر واقع ہیں۔ علامہ اقبال نے رات کی چاندنی میں مقبروں کا نظارہ کیا تھا۔ حیدر آباد میں ان کے میزبان سراج کبر حیدری تھے۔ اقبال لکھتے ہیں کہ اکبر حیدری: ”مجھے ایک شب ان شاندار، مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر، میرے دل پر ایسا اثر کیا، جو کبھی فراموش نہ ہوگا“۔ بانگ درا کی نظم ”گورستان شاہی“ علامہ کے اسی سفر کی یادگار ہے۔ ہم دوپہر کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ فضائیں تمازت تھیں۔ گھوم پھر کر مقبرے دیکھے۔ سب مقبروں کا انداز ایک جیسا تھا۔ ادھر ادھر عام لوگوں کی قبریں بھی تھیں۔ درمیان میں اورنگزیب عالمگیر کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی ہے۔ میں درخت کی سائے میں ایک قبر کے کنارے بیٹھ گیا۔ ”بانگ درا“، کھولی، نظم ”گورستان شاہی“ دیکھنے لگا۔

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دُور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مال
جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادہٗ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

ماحول میں خاموشی تھی۔ مقبرے اونچی جگہ واقع تھے اور دونوں اطراف نشیب میں جنگل نظر آ رہا تھا۔ قبروں کی زیارت یوں بھی عبرت دلاتی ہے اور علامہ بھی کہہ رہے تھے:

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادہٗ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

یہاں دنیا کی بے ثباتی، اور حکمرانی وجاہ و منصب کی بے حیثیتی کا احساس ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ وہ عظمت کی جتنی بلندیوں تک بھی چلا جائے، آخر کار اسے مٹی ہی میں مل جانا ہے۔

دکن کے قابلِ دید مقامات میں سے ایک اور قابلِ دید چیز قلعہ گول کنڈا ہے جو ایک زمانے تک قطب شاہی حکومتوں کا صدر مقام رہا۔ یہ شہر سے گیارہ کلومیٹر باہر واقع ہے۔ چار پانچ صدیاں پرانا قلعہ، پانچ میل کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ۹ دروازے اور ۵۲ کھڑکیاں ہیں۔ فیصل پر ۴۸ برج ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر ۸ ماہ یہاں مقیم رہا۔ موسم گرم تھا اور وقت پختہ دوپہر، مسلسل چڑھائی، اوپر کے محلات تک پہنچنے میں تو ٹنڈھال ہو گیا مگر چاروں طرف کا نظارہ خوب تھا۔ کھیت، جنگل اور کہیں کہیں آبادی۔ ایک دوسرے کو قطع کرتی سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک، کاریں اور موٹریں بلندی سے ماچس کی ڈبیاں معلوم ہوتی تھیں۔ قلعے کی بناوٹ میں خاص بات یہ ہے کہ معماروں نے نیچے کے داخلہ دروازے سے لے کر چوٹی کے محلات تک راستوں، دیواروں اور گنبدوں کی بناوٹ ایسی رکھی ہے کہ اگر نیچے کھڑے ہوئے تالی بجائیں تو اس کی آواز چوٹی تک پہنچتی ہے اور اگر چوٹی پر کسی خاص جگہ تالی بجائیں تو آواز نیچے سنائی دیتی ہے جو اسٹھ میٹر بلند ہے۔ ایک کتابچے میں بتایا گیا ہے۔ The most remarkable feature of this fort is the system of acoustic, where-by a clapping of the hands at the entry meter high gate can be heard at the top of the Fort some 6

کہا جاتا ہے کہ تالی کی مختلف طرح کی آوازوں کے کوڈ مقرر کیے گئے تھے جن کے ذریعے پیغام رسانی ہوتی تھی۔
قدیم عمارتوں اور قلعوں، خاص طور پر مغلوں کی تعمیرات میں اس طرح کی ڈیوائس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

بالکل زمانہ حال کی ایک مثال تو سامنے کی ہے۔ خانوادہٗ سرسید احمد خاں کے ایک بزرگ، آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور عربی زبان و ادب کے فاضل، ڈاکٹر سید عابد احمد علی، تقریباً آٹھ برس تک گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل رہے۔ کالج کے وسیع کیمپس میں مسجد نہ تھی۔ یہ چیز انھیں کھلتی تھی۔ پروفیسر صاحب زادہ عبدالرسول صاحب کے بقول: ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ مملکتِ خداداد

پاکستان میں کسی تعلیمی ادارے کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اس میں ایک نہایت شاندار مسجد موجود نہ ہو۔ انگریزوں نے برصغیر میں جہاں بھی تعلیمی ادارے قائم کیے، ان کے ساتھ خوبصورت گرجے بھی قائم کیے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں کسی تعلیمی ادارے میں گرجے یا مسجد کی محض موجودگی طلبہ کے لاشعور اور انداز فکر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سرکار سے اجازت لے کر طلبہ پر ایک روپیہ ماہوار مسجد فنڈ عائد کر دیا جو فیسوں کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ کچھ مخیر حضرات نے عطیات دیے۔ خیال رہے کہ اس زمانے میں کسی گورنمنٹ کالج میں مسجد کا تصور، خیال خام تھا لیکن ڈاکٹر صاحب عزمِ صمیم رکھتے تھے۔ حکومت سے اجازت حاصل کر کے مسجد تعمیر کی۔ مسجد کی محراب، مسجد قرطبہ کی محراب طرز کی تھی۔ اس محراب کا ڈیزائن ایسا تھا کہ اس میں کھڑے ہو کر جو کلمات کہے جائیں وہ، مسجد کے مسقف حصے اور صحن میں ہر جگہ، بلکہ مسجد سے باہر بھی سنے جاسکتے تھے۔ اگر مسجد کے احاطے میں داخلے کے دروازے پر کھڑے ہو کر بات کی جاتی یا کوئی کلمہ ادا کیا جاتا تو محراب میں آواز صاف سنائی دیتی تھی حالانکہ اتنے فاصلے پر آواز کسی تار کے بغیر نہیں پہنچتی۔ افسوس ہے کہ چند برس قبل مسجد کا محراب توڑ کر مغربی رخ پر مسجد میں توسیع کی گئی اور اس کے نتیجے میں محراب کی یہ نادر خوبی ختم ہو گئی۔ اسے اب ”جامع عابد“ کا نام دیا گیا ہے۔ اگر گول کنڈا سے قطب شاہی مقابر کی طرف جانا چاہیں تو بائیں گھوم کر جاتے ہیں۔ گول کنڈا اسے مغرب کی طرف جانے والی سڑک گنڈی پیٹ تالاب پر بننے پل سے گزرتی ہے۔ دراصل یہ بہت لمبی جھیل ہے۔

ان دونوں میں تاریخی آثار دیکھنے کے علاوہ، بعض اداروں (جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ آصفیہ، ادارہ ادبیات اردو اور آندھرا پردیش سٹیٹ آرکائیوز) جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کی موجودہ عمارت ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔ دو منزلہ عمارت میں نیچے کی منزل ہندو فن تعمیر اور اوپر کی عمارت مسلم فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس کی کھڑکیاں مسجد قرطبہ کی محرابوں کی طرز پر ہیں۔ دیواریں، موسمی اثرات سے بچانے کے لیے ساڑھے تین فٹ دبیز ہیں۔ شعبہ اردو میں ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر مرزا علی اکبر بیگ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، اشرف رفیع، اور بیگ احساس اور شعبہ اسلامیات میں ڈاکٹر انور معظم سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب حضرات سیسی نار میں بھی آتے رہے۔ کیمپس بہت وسیع ہے۔ کالج آف ایجوکیشن، آرٹس کالج، لاکالج، انجینئرنگ کالج، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز کے درمیان ٹیگور آڈیٹوریم واقع ہے۔ یونیورسٹی کتب خانے کا حوالہ جاتی سیکشن خاصا بڑا ہے۔ مگر پاکستانی کتابیں بہت کم ہیں۔ ایک لائبریرین نے کہا ہم پاکستانی کتابوں کے لیے ترستے ہیں۔ وائس چانسلر کے دفتر پر بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔

خیرت آباد کے پنج گٹھ روڈ پر ادارہ ادبیات اردو کی عمارت تو خوب صورت ہے مگر انتظام اچھا نہیں ہے۔ میوزیم نادر مخطوطات، فرامین، سکوں، ہتھیاروں اور کتبوں پر مشتمل ہے۔ دیکھ بھال کا انتظام معقول نہیں ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جانے کتنے جتنوں سے یہ نوادرجع کیے ہوں گے۔ عقیل صاحب نے بتایا ہے کہ اب یہ ادارہ ایک نئی عمارت میں منتقل ہو چکا ہے اور اس کی حالت بہت بہتر ہے۔

آندھرا پردیش سٹیٹ آرکائیوز کا چکر بھی لگایا، وہاں سے حوالے کی چند کتابیں خریدیں۔ داؤد اشرف اور نکیل احمد صاحبان

سے ملاقات ہوئی، دونوں حضرات نے آرکائیو سے نادر چیزیں نکال کر شائع کی ہیں۔ شکیل صاحب کی اقبال پر نئی تحقیق تو اقبالیات پر اہم اضافہ ہے۔

کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد کا بہت بڑا کتب خانہ ہے۔ کچھ وقت وہاں گزرا۔ اندازہ ہوا کہ پاکستان کی نسبت وہاں کے طلبہ و طالبات میں لائبریری میں بیٹھ کر کام کرنے کے رجحان زیادہ ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کے بعض حصے رات ۱۲ تک کھلے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کے بعض ادبی اکابر کا ذکر کتابوں، رسالوں میں پڑھا تھا، کبھی زیارت نہ ہوئی تھی۔ گزشتہ ۵، ۶ روز میں وقت نکال کر ہم نے کئی لوگوں سے ملاقات کی۔ اقبال اکادمی کے بانی خلیل اللہ حسینی گواہ ایک روز سیسی نار میں کچھ دیر کے لیے آئے تھے، مگر ہم نے بھی اُن کے ہاں حاضری دی۔ نوجوانوں کو مطالعہ اقبال کی طرف راغب کرنے، پھر اقبال اکادمی کا قیام اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔ سیسی نار کی ایک نشست کے دوران، اجازت لے کر، ہم نے دکن کے معروف اقبال شناس جناب غلام دستگیر رشید کے ہاں بھی لال ٹیکری میں اُن کے مکان پر حاضری دی۔ اُن کی عمر اسی (۸۰) سال ہے۔ دکن میں فروغ اقبالیات میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ حیدرآباد میں ایک زمانے تک ہفتہ وار درس اقبال دیتے رہے۔ فرمایا: میں کلام اقبال کی ترتیب کے مطابق درس دیا کرتا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بھی ذکر کیا۔ دکن میں مسلمانوں کے موجودہ حالات پر بات ہونے لگی۔ کہنے لگے: قاسم رضوی کی جذباتیت اور جلد بازی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ مسلمانوں سے غلطیاں ہوئیں، کوئی قوم زوال پذیر ہو تو ایسا ہوتا ہے۔ مولانا مودودی کا ذکر آیا، کہا: وہ اسمبلیوں کے مخالف تھے اور ملازمتوں میں جانے کو غلط سمجھتے تھے، اس لیے میں اور مولانا مناظر احسن، اُن سے الگ ہو گئے۔

اسی طرح معروف محقق حسینی شاہد اور ان کی بیگم زینت ساجدہ سے بھی ان کے گھر میں مختصر ملاقات کی۔ وہ ماں صاحب پیٹ کے علاقے میں رہتے تھے۔ عقیل صاحب تو حیدرآباد کے بہت سے لوگوں سے ربط و ضبط رکھتے تھے۔ بعض حضرات میرے نام سے بھی واقف تھے چنانچہ بہت سے کرم فرماؤں نے دعوت طعام، چائے کے لیے گھر بلانا چاہا، مگر ہم نے طے کر لیا کہ کسی دعوت میں نہیں جائیں گے۔ مگر ہمارا یہ عزم برقرار نہ رہا۔ بزرگ محقق اکبر الدین صدیقی ایک روز ہوٹل تشریف لے آئے اور ایک شام دعوت کے لیے اصرار کیا۔ وہ اس پیرانہ سالی میں رکشا پر آئے تھے، ہم انکار نہ کر سکے اور دوسرے دن ان کے ہاں حاضری دینی پڑی۔

ایک سہ پہر اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے سیسی نار کے مندوبین کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ مختصر سا مشاعرہ بھی ہوا۔ اسی شب سیسی نار کے نائب صدر شاہ عالم صاحب نے نظام کلب میں مندوبین کو عشاءِ دیدہ۔ بعدہ ”ہب اقبال“ میں رات گئے دیر تک کلام اقبال گایا جاتا رہا۔ طبیعت مضلل تھی، نہ جاسکا۔ صبح عقیل صاحب نے بتایا: سماں باندھ دیا۔ یہاں بہت سے حیدرآبادی رؤسا سے ملاقات ہوئی۔ بعض دوست ہوٹل میں آتے رہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثرعلیل تھے مگر زحمت کر کے ملنے آئے۔ چند تصانیف عنایت کیں ان میں کتابیات دکن و دکنیات بھی تھی جسے راقم کی درخواست پر استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے مقتدرہ قومی زبان

اسلام آباد سے شائع کر دیا۔ بعض ازاں اثر صاحب سے خط کتابت جاری رہی۔ جامعات کے تحقیقی مقالات سے متعلق انھوں نے قیمتی معلومات مہیا کیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر یوسف اعظمی بھی تشریف لائے۔ دعوت طعام سے تو معذرت کی مگر تصانیف بصد مسرت قبول کیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس ان حضرات کو تحفہ دینے کے لیے اپنی کتابیں نہیں تھیں۔ لاہور پہنچ کر، مقدور بھر تحائف دوستوں کو روانہ کیے۔

میرے دوست محمد رفیع الدین فاروقی (متعلم ایم فل) ایک روز نواب مرزا داغ (”شاعرِ ضرب“ اور امیر مینائی کی قبریں دکھانے لے گئے۔ اس طرح فاروقی نے وہ کمرہ (کوٹھری) بھی دکھائی جس میں ابو محمد مصلح کے جاری کردہ رسالے ترجمان القرآن کا دفتر قائم تھا۔ بعد ازاں یہ رسالہ ان سے مولانا مودودی نے لے لیا۔ قیاس ہے کہ اس دفتر میں مولانا کی آمد و رفت رہی ہو گی۔ اس کمرے پر ”عالمگیر تحریک قرآن“ کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ ابو محمد مصلح کی صاحبزادی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ترجمان القرآن کی جلد اول اور قرآن اور اقبال طبع اول کا نسخہ عنایت کیا۔ قیمت دینا چاہی، کہا: یہ تحفہ ہے۔

اگلے روز عقیل صاحب علی الصبح کسی دوست کے ساتھ بیدر، اودگیر اور اورنگ آباد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اودگیر ان کی جائے ولادت ہے، جس کی زیارت کے لیے ان کا اشتیاق قدرتی تھا۔ جی تو میرا بھی بہت چاہتا تھا کہ اورنگ آباد (اورنگزیب عالمگیر کا مدفن اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کا شہر ولادت) دیکھوں مگر یہاں حیدر آباد میں مجھے کچھ زیادہ ضروری کام تھے اس لیے باز رہنا پڑا۔

ڈاکٹر گیان چند سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس زمانے میں حیدر آباد کی سنٹرل یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ سسی نار میں بطور مقالہ نگار مدعو تھے مگر سوسائے اتفاق سے وہ صرف ایک روز ہی سسی نار میں آ سکے کیوں کہ چند روز پہلے ان کے پاؤں میں چوٹ لگی تھی اور وہ چلنے پھرنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ یوں ملاقات، جو ہم دونوں کی خواہش تھی کہ طویل ہونی چاہیے، بہت مختصر رہی۔ ان کی قیام گاہ دور تھی اور سسی نار کے بعد حیدر آباد میں میرا قیام صرف تین روز تھا۔

پہلے دو روز حیدر آباد کے قدیم تاریخی آثار و مقامات دیکھنے اور صوبائی محکمہ آثار قدیمہ کے دفاتر میں بعض اقبال دوستوں سے ملاقاتوں میں صرف ہو گئے۔

سسی نار کی مختصر ملاقات میں، گیان چند مجھے سنٹرل یونیورسٹی کیمپس میں واقع اپنے مکان پر مدعو کر گئے تھے اور میں نے حاضر ہونے کا وعدہ بھی کر لیا تھا مگر وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ میرے پاس صرف ایک دن آخری بچا ہوا تھا۔ کام دو تھے:

۱۔ ڈاکٹر گیان چند سے ملاقات

۲۔ اقبال اکیڈمی کے کتب خانے سے کتابیات اقبال کے لیے معلومات، حوالوں اور لوازمے کا حصول۔

یہ دونوں کام بہت اہم تھے۔ ایک شب پہلے تو میں شش و پنج میں رہا، پھر میں نے کتب خانے سے استفادے کو اولیت دینے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ درست ثابت ہوا کیوں کہ اکیڈمی کا کتب خانہ دوبارہ دیکھنے کا آج تک موقع نہیں ملا جبکہ گیان چند صاحب سے

ملاقات کا موقع چند سال بعد لاہور میں نکل آیا۔

اقبال اکیڈمی کے کتب خانے پہنچا۔ ذخیرہ اقبالیات دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کتب خانے میں بیٹھ کر کام مکمل کر لینا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ لوگوں کی آمدورفت اور ملاقاتوں میں کام نہیں ہو سکتا تھا، جن جن کتابوں سے معلومات اخذ کرنا مقصود تھا، وہ سب ظہیر الدین صاحب نے الگ نکلوا کر میرے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا دیں۔ میں پورا دن کتابوں، رسالوں اور کتابچوں کے کوائف نوٹ کرتا رہا، حتیٰ کہ شام پڑ گئی۔ سوچا تھا کہ اگر شام کو وقت نکلا تو گیان چند سے ملنے چلا جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ سنٹرل یونیورسٹی کیمپس خاصا دور ہے۔ اب ممکن نہ تھا کہ ڈاکٹر گیان چند سے ملاقات کے لیے جاؤں۔ ابھی مجھے اپنا سامان بھی باندھنا تھا، سو میں نے اسی شب میں ہوٹل ہی سے انھیں خط لکھ کر وعدہ خلافی کی معذرت چاہی۔ اپنی محرومی پر اظہار افسوس کیا اور جواباً ان کا ۵ مئی ۱۹۸۶ء کا خط موصول ہوا جس میں انھوں نے ملاقات نہ ہونے پر اپنے قلق کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ”تمام مندوبین میں صرف آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا کیوں کہ آپ محققین اقبال میں بلند مقام رکھتے ہیں“۔ یہ گیان چند کی بڑائی تھی۔ اسی خط میں انھوں نے لکھا کہ ”مجھے یقین ہے کہ آپ سے کبھی نہ کبھی پھر ملنا ضرور ہوگا“۔

ان کی توقع یا پیش گوئی کوئی دس گیارہ برس بعد ۱۹۹۷ء میں اس وقت پوری ہوئی جب وہ اپنی نیگم کے ہمراہ چند روز کے لیے لاہور آئے۔ ہماری ایک ملاقات تو ڈاکٹر گیان چند کے اعزاز میں دی گئی اس دعوت استقبالیہ میں ہوئی جس کا اہتمام مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے ناظم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ دوسری بار راقم اور ڈاکٹر تحسین فراقی ان کی قیام گاہ (محمد طفیل مرحوم کی ”نفوش منزل“ واقع نیو مسلم ٹاؤن) پر جا کر ان سے ملے۔ جاوید طفیل ان کے میزبان تھے۔

۲۴ اپریل علی الصبح میں تیار ہو گیا۔ ظہیر الدین صاحب اتنی دیر تک آگئے۔ انھوں نے مجھے ایک اور ساتھی کے حوالے کرتے ہوئے رخصت چاہی کیوں کہ اگر وہ مجھے ریلوے اسٹیشن تک پہنچانے آتے تو ان کا دفتر بروقت پہنچنا ممکن نہ تھا، چنانچہ ان سے الوداع ہو کر ہم سکندر آباد ریلوے اسٹیشن پہنچے، جہاں سے ریل پر سوار ہونا تھا۔

ریلوے گارڈ سے برتھ کی درخواست کی۔ گارڈ نے کہا: کوئی دو گھنٹے بعد فلاں اسٹیشن (نام بھول گیا) سے برتھ مل جائے گی۔ ریل سبک رفتار تھی۔ دو گھنٹے بعد، دو قلی آئے اور انھوں نے میرا سامان دوسرے ڈبے میں منتقل کر دیا، جہاں برتھ مل گئی۔ یہ کام انھوں نے بلا معاوضہ کیا تھا۔ یہ ان کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ میں برتھ پر لیٹ گیا، اوگھتا سوتا رہا۔

حیدر آباد میں تقریباً ایک ہفتہ گزار کر، میں واپس جا رہا تھا۔ خیال آیا۔ حیدر آباد کی ریاست ہندوستان میں سب سے بڑی مسلم ریاست تھی۔ مگر اب یہ نابود ہو چکی ہے۔ نابودگی کا مختصر قصہ یہ ہے کہ جون ۱۹۴۷ء میں ریاست نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ تقسیم کے بعد بھارت سے ایک تین سالہ معاہدہ کیا مگر بھارت نے معاہدے کی مسلسل خلاف ورزیاں کیں تو ریاست حیدر آباد نے ۲۱ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ سے رجوع کیا۔ بھارت نے ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حملہ کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا۔ چند سال بعد اس

کے تین حصے کر کے، دوسرے صوبوں میں ملا دیا۔ اب مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں۔ بھارت کے بعض دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی حالات تشویش ناک ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا اندازہ مجھے دورانِ قیام ایک روز ایک دوست کے گھر فسادات کے دنوں کی بعض تصاویر دیکھ کر ہوا تھا۔ تصاویر سے بالکل واضح تھا کہ پولیس جانب دار ہے مسلمانوں کے مکانوں، دکانوں اور پٹرول پمپوں کو فساد کی آگ لگا دیتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اتنی دیر سے پہنچتا ہے کہ سب کچھ جل چکا ہوتا ہے۔ یاد آ یا کہ ریاست حیدرآباد کے مخدوش مستقبل کا اندازہ علامہ اقبال نے نصف صدی پہلے کر لیا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی ایک روایت ملتی ہے۔ وہ علامہ سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہم چند دوست علامہ کی خدمت میں حاضر تھے باتیں ہو رہی تھیں۔ ”کسی نے بزرگ عظیم میں مسلمانوں کے مستقبل کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے یہ کہہ دیا: ”لیکن حیدرآباد کا انجام کیا ہوگا؟“ ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر انگریزی میں جواب دیا: ”حیدرآباد فنا ہو کر رہے گا (Hyderabad must go under) اس لیے کہ حیدرآباد کے مسلمانوں نے تبلیغ اسلام کے فریضے کو صد ہا برس تک فراموش کیے رکھا“۔ (اقبال کی شخصیت اور شاعری ص ۴۳)

مجھے یاد آ یا کہ مولانا مودودی نے بھی ایک خط میں ریاست حیدرآباد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً اسی طرح کے خیالات ظاہر کیے تھے۔ مولانا کی زندگی کا بہت سارے صحنوں میں گزرا تھا۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے کسی شخص نے مولانا سے چند استفسارات کیے۔ مولانا نے طویل خط میں جوابات دیے۔ اس میں تقسیم ہند کے نتیجے میں دہلی، مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے اخراج (قتل و غارتگری) کے اسباب کا ذکر کیا اور اسی خط میں مزید لکھا کہ یوپی، بہار وسط ہند کے مسلمانوں کے سر پر تباہی منڈلا رہی ہے حالانکہ یہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی عظیم الشان جاگیریں، حیدرآباد کی پائیگا ہوں سے کئی گنی زیادہ بڑی جاگیریں قائم رہی ہیں اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے ہیں لیکن عیاش، دنیا میں انہماک، فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار اور انحصار، اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرز عمل سے اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی۔ نمک کے برابر ہے اور دلوں کو مسخر کرنے کی بجائے معاشی اور سیاسی دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا کرتے رہے۔

علامہ اقبال نے تو مسلمانوں کی تباہی کا صرف ایک ہی سبب بتایا تھا ”تبلیغ اسلام کے فریضے“ سے غفلت پر مولانا نے ”اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل کے ساتھ تباہی کی بہت سی دوسری وجوہ کی نشان دہی بھی کی ہے۔

میں حیدرآباد کے خیالات میں غلطیاں و پیچاں اور ریل گاڑی فرارٹے بھرتے ہوئے بھوپال سے قریب تر ہو رہی تھی۔ الوداع حیدرآباد، الوداع دکن !!



نجیہ عارف

جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال

اوسفر ڈکی گلیاں:

”ہمارے ہاں ان قومی مجرموں کے خلاف غداری کے مقدمے چلائے جا رہے ہیں، جنہوں نے ۱۹۷۱ میں پاکستان آرمی کا ساتھ دیا تھا۔“

اس نے بنگالی لہجے کی انگریزی میں جوش سے کہا۔

”غداری کے مقدمے؟ پاکستانی آرمی کا ساتھ؟ یہ کیسے؟ پاکستانی آرمی تو اس وقت خود انہی کے ملک کی فوج تھی۔ اپنے ملک کی فوج کا ساتھ دینے پر غداری کا مقدمہ کیوں؟“

”جی نہیں۔ پاکستانی فوج غاصب اور دشمن تھی۔ وہ ہماری حفاظت نہیں، ہماری بے آبروئی پر مامور تھی۔ پاکستانی فوج نے ہزاروں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا، لاکھوں خواتین کی بے حرمتی کی، ہمارے گھروں کا تقدس پامال کیا۔ ہم پر ناقابل بیان ظلم توڑے۔“

”اور اس ظلم میں خود بنگالیوں نے بھی پاکستانی فوج کا ساتھ دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کچھ سٹپٹائی۔

”سب نہیں، کچھ تھے ایسے غدار۔ ایسے غداروں کی سزا موت ہونی چاہیے۔ ہماری حکومت یہ قانون منظور کر رہی ہے۔ ہم ان غداروں کو سزائے موت سنائیں گے۔“

”اور ملتی بہنی کے لوگوں کو؟“

”ملتی بہنی کے لوگوں کو کیا؟“

”کیا ان پر بھی غداری کے مقدمے چلیں گے جنہوں نے خود اپنے ملک کی بجائے، دوسرے ملک کی فوج کا ساتھ دیا؟“

”جی نہیں، وہ غدار نہیں تھے، وہ تو Freedom fighter تھے؟ انہیں تو ایوارڈ دیے جائیں گے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں، انہوں نے قوم کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔“

”مگر انہوں نے بھی تو مغربی پاکستانیوں کو، جو اس وقت ان کے اپنے ہم وطن تھے، قتل کیا تھا، ان کی خواتین کی عزتیں پامال کی تھیں۔ عام شہریوں کے گھر جلائے تھے، لوٹ مار کی تھی۔“

”انہوں نے اپنی قوم کی حفاظت کی تھی۔ انہوں نے غداروں کو مارا تھا۔“

”کیا عام شہری، عورتیں اور بچے بھی غدار تھے؟ کیا مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص غدار تھا؟“

”وہ ہمارے freedom fighters تھے۔ انھوں نے ہمیں آزادی دلائی۔“

اب کے اس کی آواز میں پسپائی کے آثار تھے مگر وہ ان پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی اور اس کوشش میں اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی، اس میں جوش کا عنصر غالب آتا جا رہا تھا۔

نوشی اور یاسر کی ہشت ہشت، اب باقاعدہ کہنی ما کر چپ کرانے کی حد تک پہنچ چکی ہے۔

”باجی، باجی!“ نوشی نے سرگوشی میں کہا اور میرے پہلو میں کہنی چھوئی۔

سامنے یاسر آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارے کر رہا تھا کہ سیاسی گفتگو منع ہے۔

”دیکھو روی! غصہ نہ کرو، میں تمہیں جھٹلانا نہیں چاہتی، میں تو سمجھنا چاہتی ہوں۔ مجھے حقائق جاننے سے دلچسپی ہے، اس لیے کہ میں نے مغربی پاکستان میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جو سولہ دسمبر کا ذکر آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔ میں نے اسلام آباد کے کالجوں میں بنگالی اساتذہ کی یادوں کی شمعیں روشن دیکھی ہیں۔ میں نے وہ ادب پڑھا ہے جو بنگال کی سندرتا کی محبت اور یاد سے جگمگاتا ہے۔ میں نے شدت درد سے پھٹ جانے سینوں سے اٹھتی ہوئی آہیں دیکھی ہیں۔ میں نے بہاری کیمپوں میں بے وطنی، لاچاری اور دکھ کی آنچ پر پکھلتے ہوئے انسانی اجسام دیکھے ہیں۔ میں نے مسعود مفتی کی کتابوں میں مشرقی پاکستان کے انہدام کے روح فرسا مناظر بھی دیکھے ہیں اور دوسری طرف احمد سلیم کی گفتگو میں آئینہ دکھانے کی کوشش بھی محسوس کی ہے۔ وہی احمد سلیم، جنہیں کچھ دیر بعد بنگلہ دیشی حکومت سے بنگلہ دیش دوست ہونے کا قومی اعزاز ملنے والا ہے۔ سو میری پیاری! میرا تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ میں فوج کی بھی نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے کہیں سے کوئی وظیفہ، اعزاز یہ یا لفافہ نہیں ملتا۔ میں تو پاکستان کی ایک عام شہری ہوں۔ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو میری عمر سات سال تھی۔ میں ان اسباب کی چشم دید گواہ نہیں ہوں، جنہوں نے اس صورت حال کو جنم دیا۔ میں اور میری نسل کے لوگ حقائق جاننا چاہتے ہیں۔ ہم صرف ایک طرف کی نہیں، دوسری طرف کی بات بھی سننا چاہتے ہیں۔ مگر آپ لوگ بھی تو ہماری مدد کریں۔ ہمیں بتائیں کہ حقائق کیا تھے؟ خود بھی ذرا دور کھڑے ہو کر تاریخ کا جائزہ لیں۔ ہمیں بھی یہ موقع دیں۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں۔ ہم تو ہم سفر تھے، ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔ یہ جدائی کی دیوار کس نے اٹھادی، کیسے اٹھادی۔ چلو اب سیاست دانوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور استحصالی طبقوں کے حوالے سے نہیں، میرے اور تمہارے حوالے سے اس دوری کو سمجھنے کو کوشش کرتے ہیں۔“

اب وہ ذرا دھیمی پڑ گئی۔ میز کے ارد گرد بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی بھی سانس میں سانس آئی۔

”تم روز صبح مجھے ناشتہ بنا کر دینے پر اصرار کرتی ہو، میرے لیے پراٹھا بناتی ہو، میں بھی جب تمہیں یاسر سے بحث میں شکست کھاتے دیکھتی ہوں تو تمہاری مدد کو لپکتی ہوں۔ تمہیں میں پاکستانی لگتی ہوں لیکن مجھے تو تم بھی پاکستانی لگتی ہو۔ بالکل اپنی۔ تمہیں ایسا نہیں لگتا؟“

سامنے ہی عزیز ریٹورنٹ کے بنگلہ دیشی مالک، خاموش بیٹھے ٹک ٹک ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور وہ مکمل غیر

جانب داری کا تاثر دینا چاہتے تھے۔ ہم ان کے مہمان تھے۔ وہ ہم پر خصوصی نوازشوں کی بارش برسا رہے تھے۔ ان کا ریستوران شرقی اوکسفرڈ کے عین قلب میں مرکزی شاہراہ، کولی روڈ (Cowley Road) پر واقع ہے اور تقریباً ربع صدی سے قائم ہے۔ اسے اپنی کارکردگی کی بنا پر برطانوی حکومت سے کئی اعزاز مل چکے ہیں اور انھیں فخر تھا کہ ان کے ریستوران کو کئی عظیم اور نامور شخصیات کی میزبانی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ہمیں یہاں بنگلہ دیش کی رومی لے کر آئی تھی۔ اسی کی وجہ سے یہاں ہمیں خصوصی سلوک کا مستحق سمجھا جا رہا تھا۔ گفتگو میں ذرا سے وقفے کو غنیمت سمجھ کر انھوں نے فوراً کھانا میز پر چنوا دیا۔

یہاں اوکسفرڈ میں، میں اپنی بہن کے ساتھ اس کے دفتر کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میری بہن ایک بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیم میں ملازمت کرتی ہے۔ اس کے ادارے کا ہیڈ آفس اوکسفرڈ ہے۔ ان دنوں وہ کسی تربیتی پروگرام کے سلسلے میں اوکسفرڈ آئی ہوئی تھی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور میں بھی ایڈنبرا سے واپس آتے ہی اوکسفرڈ پہنچ گئی۔ مجھے یہاں بولٹن لائبریری کے آرکائیوز کی تلاش لینا تھی۔ دن بھر نوشتی اپنے دفتر میں مصروف رہتی اور میں صبح سے شام، بلکہ کبھی کبھی تو رات نو دس بجے تک لائبریری میں گھسی رہتی۔ رات کو کھانا ہم سب اکٹھے کھاتے۔ یہ گیسٹ ہاؤس بین الاقوامیت کا بہت خوب صورت مظہر تھا۔ یہاں بنگالی، افریقی، برطانوی، ہندوستانی، انڈونیشی، ہر قومیت کے لوگ تھے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ دن بھر یہ دفتر میں رہتے، رات کو کبھی اکیلے اکیلے مل کر کہیں کھانا کھانے چلے جاتے، جو لوگ کسی دوسرے شغل کے تمنائے ہوتے وہ اپنی راہ لیتے۔

یہاں جو چند دن گزرے وہ کئی اعتبار سے بہت اہم تھے۔ خاص طور پر بولٹن لائبریری میں گزرا ہوا وقت تو میرے پورے دورے کی جان تھا۔ پہلے دن جب میں بس میں بیٹھ کر سٹی سینٹر پہنچی اور پوچھتے پچھاتے اوکسفرڈ یونیورسٹی کی طرف جانے والی گلیوں میں چلنے لگی تو مجھے اپنا پہاڑی گاؤں انگہ یاد آ گیا جس کے نیلے پتھروں سے بنے ایک پرانے مکان کی موٹی موٹی دیواروں پر، کانس پر سبے پیتل کے گلاسوں اور طشتیوں پر، سیاہ لکڑی کی پرچھتیاں پر اور لالین کی مدھم روشنی میں کمرے کی چھت پر، کبھی ریٹتی اور کبھی دوڑتی بھاگتی، میرے بچپن کی یادوں کی پرچھائیاں، حافظے کے مال گودام میں اب تک سانس لیتی ہیں۔ اوکسفرڈ کی ان گلیوں میں چلنے والی سرد ہوا قدیم زمانوں کی باس سے یوں بوجھل ہے کہ قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ قدیم کی خوشبو جانے کیوں مجھے اس قدر شدت سے اپنی جانب کھینچتی ہے، بے اختیار کر دیتی ہے۔ ایسے لگتا ہے میں کسی گزرے ہوئے زمانے کی کوئی بھولی بھٹکی صدا ہوں جو غلطی سے وقت کی سرحد پار کر کے، حال میں آ گئی ہے۔ وقت کی یہ پہیلی، ماضی، حال اور مستقبل کی حد بندیوں کا یہ اسرار ابھی مجھ پر منکشف نہیں ہوا۔ شاید کسی پر بھی نہیں ہوا۔ یا شاید کسی کسی پر ہو جاتا ہو۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میں اس لکیر کو پھلانگ جاؤں گی۔ اپنے اسی شعور کے ساتھ، اسی جسم کی زندگی میں۔

پتھروں کے فرش پر پتھر کی حویلیوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ، جن میں بڑے بڑے لکڑی کے پھانک لگے ہیں، اور جن کی بغل سے چھوٹی چھوٹی سی گلیاں سرنگوں کی طرح نکلتی ہیں، میں رک رک کر گزرتی تھی۔ ایک گلی تو اتنی تنگ تھی کہ صرف ایک آدمی اس میں سے گزر

سکتا تھا۔ ان میں سے اکثر گلیاں صرف پیدل چلنے والوں کے لیے ہیں۔ گاڑیاں یا تو گزر ہی نہیں سکتیں، یا پھر ان کے راستے رکاوٹیں لگا کر بند کر دیے گئے ہیں۔ اب یہاں صرف پیدل راگیر ہی نظر آتے ہیں جن میں سے اکثر طلبہ ہیں۔ کہیں کہیں یہ گلیاں نیم چھتی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ کبھی ان پر قوس کی شکل کا پل سا بنا نظر آتا ہے جو گلی کے دونوں طرف کی عمارتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیتا ہے۔ یہ سارا ماحول جدید طرز حیات کے منافی ہے۔ ہر شے ایک دوسرے میں گتھی ہوئی، ساتھ جڑ جڑ کر چلتی ہوئی، ٹھہری ٹھہری، وقار اور تمکنت سے قیام پذیر، کئی موڑ مڑ کر میں اچانک اس چوک میں پہنچ گئی جہاں بورڈ سٹریٹ پر لائبریری کی مرکزی عمارت ہے۔

بودلین لائبریری پورے یورپ کی قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے اور اس کا آغاز چودھویں صدی میں سینٹ میری چرچ کی عمارت میں ایک چھوٹے سے پایہ زنجیر ذخیرہ کتب سے ہوا۔ ان دنوں کتابوں کی حفاظت اور انھیں کتاب چوروں کی دست برد سے بچانے کے لیے پایہ زنجیر لائبریریوں (chained libraries) کا رواج عام تھا۔ ہر کتاب کو زنجیر سے باندھنا دشوار اور مہنگا تھا، لیکن قیمتی اور ضخیم نسخوں کو ضرور لوہے کی زنجیر کی مدد سے الماری سے پیوست رکھا جاتا تھا۔ بودلین لائبریری شروع ہی سے اہم اور نادر نسخوں کا مرکز رہی اور اس کی حفاظت کا ہمیشہ خاص اہتمام کیا جاتا رہا۔ اسی روایت کی پیروی میں آج بھی لائبریری سے استفادہ کرنے کے ہر خواہش مند کو حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ کتابوں سے کوئی بدسلوکی روا نہیں رکھے گا۔

میں جب بہت بڑے اور شاندار قدیم دروازے سے گزر کر اندر کے وسیع و عریض احاطے میں داخل ہوئی، جس کے چاروں طرف دیواروں پر تجسمے نصب تھے تو ہر نووارد کی طرح بہت مرعوب ہو گئی۔ اس عمارت کا شکوہ اور جلال کسی دربار کی شان و شوکت سے کسی طرح کم نہیں۔ ایک طرف لگے بڑے سے بورڈ پر عمارت کا نقشہ اور ہدایات موجود تھیں مگر پھر بھی مجھے دو تین لوگوں سے پوچھنا پڑا۔ اس عمارت کا احاطہ چاروں طرف سے دروازوں سے گھرا ہوا ہے، پوچھتے پاچھتے، اونچی چھتوں والے برآمدوں اور چوڑے چوڑے زینوں سے گزرتے میں بالآخر اس کمرے میں پہنچی جہاں مجھے اپنے لیے لائبریری کے پیشل کونکیشن تک رسائی کا اجازت نامہ حاصل کرنا تھا۔ ای میل کے ذریعے میں پہلے ہی یہاں اپنی آمد کا مقصد اور اپنی دلچسپی کا محور بتا چکی تھی۔ ایک کلک کی دیر تھی، کمپیوٹر کے ذریعے سارا ریکارڈ سامنے آ گیا۔ کاغذی کارروائیاں ہوئیں اور ایک سنجیدہ صورت خاتون نے حلف نامہ میرے سامنے رکھ دیا۔

”اسے پڑھیے!“ اس نے کام چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں نے جلدی جلدی کاغذ پر نظریں دوڑائیں اور اس کی طرف دیکھا۔

”براہ کرم پڑھیے!“ اس نے پھر اصرار کیا۔

”پڑھ لیا ہے۔“

”جی نہیں، باوا زبلند پڑھیے!“

”جی؟“

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ میری انگریزی کا امتحان لینا چاہتی ہے تاکہ یقین کر سکے کہ میں نے حلف نامہ پڑھ کر سمجھ لیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ اس لائبریری کی قدیم روایت تھی کہ ہر نووارد کو نایاب کتب اور مخطوطات رکھنے والے اس مخصوص شعبے سے استفادہ کرنے سے پہلے، اس کی تمام املاک کے تحفظ اور احترام کا حلف باوازد بلند دہرانا پڑتا ہے۔ اس نے میری گھبراہٹ دیکھ کر مجھے تفصیل سے سمجھایا۔

میں نے اسے حلف نامہ پڑھ کر سنایا تو وہ خوش ہو گئی لیکن میں جو پہلے ہی مرعوب تھی، اور بھی مرعوب ہو گئی۔ بظاہر اس رسمی کارروائی کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے لیکن یہاں آج بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بولڈن لائبریری یوں ہی تو دنیا بھر میں اپنے نایاب ذخائر کی وجہ سے قابل احترام نہیں ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق اندر جا کر ہوئی۔ نایاب ذخائر پر مشتمل یہ حصہ ایک علیحدہ عمارت کے کونے میں واقع ہے جہاں داخل ہونے کے خاص آداب ہیں۔ اندر جا کر اور چھت تک چنے ہوئے کیٹلاگ دیکھ کر احساس ہوا کہ یہ آداب کتنے ضروری اور اہم ہیں۔ اس حصے میں قدیم مخطوطات اور کتب محفوظ ہیں۔ کیٹلاگ کی مدد سے ان کے نمبر تلاش کیجیے اور ایک فہرست بنا کر عملے کو دے دیجیے۔ تھوڑی دیر میں عملہ آپ کو مطلوبہ مواد فراہم کر دیتا ہے۔ اب کاؤنٹر سے سفید فوم کے بنے ہوئے رحل اٹھا لیجیے اور ان پر رکھ کر ان قیمتی کتب کو کھولیں۔ کاغذ اڑتا ہے تو اس پر ہاتھ یا پنسل رکھنے کے بجائے سفید مومی موتیوں کی مالا اٹھائیے اور صفحے کے درمیان رکھ دیجیے۔ صفحات کو الٹتے ہوئے خاص احتیاط کیجیے۔ اگر کچھ نفل کرنا چاہیں تو اپنی کاپی یا کاغذ پر پنسل سے رقم کرنا ہوگا۔ پین یا مارکر کمرے میں لانے کی اجازت نہیں ہے۔ اب ایک اجازت اور بھی محققین کو مل گئی ہے؛ اب وہ کمرے سے ان مخطوطات یا کتب کی تصاویر بھی بنا سکتے ہیں لیکن اس کی دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ فلیش لائٹ استعمال نہ کی جائے اور دوسری یہ کہ جس جس اور جتنے صفحات کی تصاویر بنائی جائیں، ان کا اندراج ایک فارم پر کر کے اپنے دستخط اور تاریخ ثبت کر کے عملے کو دے دیا جائے۔ اس فارم میں کچھ حلیہ بیانات بھی لکھے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر ان کی تصدیق کرنا لازمی ہے۔ ان بیانات سے اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ مطلوبہ مواد صرف علمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا اور اسے کسی تجارتی سرگرمی کا حصہ نہیں بنایا جائے گا۔ بظاہر یہ سب اہتمام ایک رسمی کارروائی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ کوئی آپ کے بیانات کی تصدیق نہیں کرتا لیکن آنے والوں کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص جگہ پر آئے ہیں جہاں ایسی دولت رکھی ہے جس کی حفاظت لازمی ہے۔

بولڈن لائبریری اس زمین دوز گوشے میں ہفتہ بھر گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ رات کو جب میں تھکی ماندی کمرے میں پہنچتی تو گردن کا درد اور پٹھوں کا اکڑاؤ بتاتا کہ دن بھر کسی بے آرامی میں گزارا ہے لیکن لائبریری میں پہنچ کر درد یاد رہتا، نہ وقت گزرنے کا احساس ہوتا۔ کسی ندیدے، بھوکے کی طرح حریص نظروں سے میں لائبریری کے گوشے گوشے کا جائزہ لیتی رہی۔ کیٹلاگز کے ورق الٹ الٹ کر اپنی تاریخ کے گم شدہ ابواب تلاش کرتی رہی۔ اکثر تو میں بھول ہی جاتی کہ میں کس خاص موضوع پر مواد تلاش کر رہی ہوں۔ یوں بھی لکیر کی طرح سیدھے رستے پر چلنا میری فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ مجھے شاہراہیں چھوڑ کر ادھر ادھر کی کچی پکی پگڈنڈیوں پر اتارنا زیادہ پسند

ساتھ لائی تھیں‘۔

میں کہتی رہ جاؤں گی کہ وہ باہر سے ضرور آئے تھے لیکن اس مٹی میں رچ بس گئے تھے۔ گنگا و جمن میں نہا کر ان کی کایا کپ ہو گئی تھی۔ ان کی زبان، ان کی تہذیب، ان کا جمالیاتی ذوق ہندوستان کی فضاؤں کے رنگ میں رنگا گیا تھا۔ انھوں نے اس مٹی میں اپنے بیج ڈال دیے تھے اور یہیں کی آب و ہوا میں پھلے پھولے تھے۔ صدیوں اسی آسمان کے نیچے پناہ گیر رہے تھے۔ یہاں اپنے گھر بنا لیے تھے اور ان گھروں سے دل لگا لیے تھے۔ انسان کی پوری تاریخ ایسی ہی ہجرتوں سے بھری ہے۔ انسانی قبیلے ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے ہیں اور ایک وطن سے نکل کر دوسری سرزمینوں کو وطن بناتے رہے ہیں۔ تہذیبیں اسی طرح بنتی، بدلتی اور پھلتی پھولتی رہی ہیں۔

لیکن یہ دوسرے تو یہاں گھر بنانے نہیں آئے تھے۔ وہ اس مٹی میں رل مل نہیں گئے تھے۔ وہ تو جلد کی رنگت کے فرق سے ہی رہا نہ ہو پائے۔ نسلوں کا امتیاز ہی نہ بھلا سکے۔ وہ جو مساوات اور جمہوریت کے دعوے دار تھے، خود اپنے رویوں میں عدم مساوات اور غیر جمہوری طرز عمل کی مثال بنے رہے۔ ان کی خوش اخلاقی مصنوعی اور مربیانہ تھی اور ان کا عدل و انصاف صرف دوسرے فریقوں کے لیے تھا۔ جب وہ خود فریق ہوتے تھے تو نہ مساوات کا تصور کام آتا نہ عدل و انصاف بروئے کار آتا۔ انھوں نے یہاں اپنی نمائندگی کرنے والا ایک ایسا خود غرض طبقہ پیدا کر دیا تھا جو ان کے جانے کے بعد بھی ان کے مفادات کے تحفظ میں مصروف ہے۔

میں بار بار خود کو اس ادھیڑ بن سے نکالنے کی کوشش کرتی لیکن تاریخ کے اس مدفن میں ہر طرف سے کوئی نہ کوئی ندا آتی جو مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی۔ بار بار مجھے یاد دلاتی کہ میں محض ایک فرد نہیں ہوں، جس کا ایک نام اور ایک تاریخ پیدائش ہے، ایک زمانہ ہے۔۔۔ میں ان کتابوں کے بوسیدہ اوراق کے ذرے ذرے سے لپٹے ہوئے زمانوں کی روح ہوں۔ میری زندگی کا دامن ازل کے رستے پر دور تک پھیلا ہوا ہے۔ میرے سینے پر ہر ہزیمت کا داغ ہے، ہر شکست کا اضمحلال ہے، ہر ہجرت کی تکان ہے اور تمام تر ترک شدہ زمینوں اور زمانوں کی یاد ہے۔

شاید اسی یاد کا بوجھ تھا جو ہر شام کو میری گردن کے پٹھوں کے تناؤ کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔

بودھن لائبریری میں غیر متعلق چیزیں تو میں نے چھان ماری تھیں لیکن اپنے تحقیقی کام سے متعلق ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی۔ اردو کے مخطوطات کی تعداد کم تھی اور ان میں میری ضرورت کی چیزیں نہیں تھیں۔ آخر میں نے عملے کے ایک رکن سے پوچھا کہ اردو زبان کے ذخائر کی کوئی اور فہرست بھی ہے یا نہیں؟

”اردو؟“ اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ اسے معلوم تک نہیں تھا کہ اردو بھی کوئی زبان ہے۔ اس خیال سے مجھے اس قدر وحشت آمیز حیرت ہوئی کہ خود کو سنبھالنے میں کافی دیر لگی۔

گویا میں جس زبان میں اپنی ذات کے عمیق ترین گوشوں کا اظہار کرنے کی متمنی تھی، جس زبان کے ذریعے ہم اپنی شخصیتوں کا تعین

کرنے اور ان کی نموکا اہتمام کرنے کے عادی ہیں، جس زبان کو ہم اپنی شناخت کا وسیلہ سمجھتے ہیں، یہ شخص اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اردو کیا ہے؟ کوئی زبان ہے، قوم ہے یا ملک ہے؟ مجھے بے اختیار نکاراگوا کا ایک اجنبی یاد آ گیا جو کئی سال پہلے سیول کے ایک مہمان خانے میں مجھے ملا تھا۔ ہم اکثر ایک ہی وقت پر کمپیوٹر روم میں آ کر اپنی ڈاک دیکھا کرتے۔ ایک روز اس سے تعارف کا مرحلہ آیا تو اس نے بتایا کہ وہ نکاراگوا کا رہنے والا ہے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس وقت تک مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ دنیا میں نکاراگوا نام کا بھی کوئی ملک ہے۔ اس کی آنکھوں کی مایوسی آج میرے اندر اتنی تو مجھے احساس ہوا کہ میری کم علمی نے اسے کس کرب میں مبتلا کیا ہوگا۔

اردو سے ناواقف اس شخص نے سوچ سوچ کر بتایا کہ فلاں کونے میں ایک کیٹلاگ موجود ہے جہاں ایسے ذخائر کی فہرست ہے جن کا مکمل تعارف حاصل نہ ہو سکا۔ میں بصد شوق اس طرف لپکی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی ہے کہ ان میں سے بیشتر مخطوطات اردو کے تھے۔ اس ذخیرے میں موجود نواد کا اندراج کسی کیٹلاگ میں نہیں ہے۔ ان کی کوئی مطبوعہ فہرست بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے سبھی کا رڈ پڑھ ڈالے اور جہاں جہاں کوئی نشان ملا، ان کے نمبر نوٹ کر کے عملے کے حوالے کر دیے تاکہ وہ متعلقہ نواد فراہم کر دیں۔

باری باری یہ نواد مجھ تک پہنچنے لگے اور پہلا ہی مخطوطہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ تھا جس میں اس کی ایک رنگین روغنی تصویر بھی موجود تھی۔ یوسف خان کمبل پوش کا نام اردو دنیا کے لیے نیا نہیں۔ انھیں اردو میں انگلستان کے پہلے سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ”عجائب فرنگ“ کے عنوان سے معروف ہونے والا ان کا سفر نامہ جس کا اصل عنوان ”تاریخ یوسفی“ ہے، کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس ایک سفر نامے کے علاوہ کمبل پوش کی اور کوئی تحریر دستیاب نہ تھی اور اکثر محققین اس بات کا گلہ کرتے تھے۔ لیکن یہاں میرے سامنے ان کا ایک دوسرا سفر نامہ مخطوطے کی صورت میں کھلا پڑا تھا جس میں واجد علی شاہ کے لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کے سفر کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ کمبل پوش ریاست اودھ کی شاہی فوج کے رسالہ سلیمانیہ میں صوبے دار کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے انگریز مربی و محسن پکتان میگنس کی کمان میں اپنے رسالے کے ہمراہ مختلف مہمات پر جاتے رہتے تھے۔ اس سفر نامے میں انہی مہمات کے دوران ہونے والے مشاہدات و تجربات کو بیان کیا گیا تھا۔ یہ محض ایک شخص کا سفر نامہ نہیں، ایک عہد کی داستان ہے۔ ایک مٹتے ہوئے عہد کی، ایک مضلل ہوتے ہوئے اقتدار کی، ایک منہدم ہوتی ہوئی تہذیب کی۔ میرے لیے اس سفر نامے میں دلچسپی کے کئی سامان تھے۔



ماچسٹر، لندن اور کیمبرج

۲۹۔ اگست ہم نے لندن جانا تھا اور ہماری پہلی منزل پر ہماری میزبان ”لینا“ تھی۔ اس کا فلیٹ ۲۹ اگست کو خالی ہو رہا تھا، مگر ہم نے تین دن پہلے کے ٹکٹ کٹوا لیے۔ عجیب بات کہ یہ لانگ ویک اینڈ تھا۔ اس پیر کو یعنی ۲۸ اگست کو بینک ہالی ڈے تھا اور سارے دفاتر بند رہنا تھے۔ لانگ ویک اینڈ پر ہجوم کے باعث ٹکٹ مہنگے ہو جاتے ہیں۔ عام حالات میں جو ٹکٹ دس پونڈ کا تھا، وہ تیس پونڈ میں یک رہا تھا۔ ایسا ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے، مگر اسے ناجائز منافع خوری کہا جاتا ہے۔ یہاں ناجائز منافع خوری جیسی تیسری دنیا کی اصطلاحات مروج نہیں ہیں۔ ہم ٹکٹ لے چکے تو احساس ہوا کہ ہمیں ۲۶ کو نہیں ۲۹ کو جانا ہے تو ٹکٹ تبدیل کروائے جو خوشی تبدیل کر دیئے گئے۔ انھوں نے مہربانی یہ کی کہ ہم سے کوئی مزید رقم طلب نہ کی۔ اگرچہ ہمیں شکایت یہ رہی کہ ہم اس دن کے مہنگے ترین مسافر تھے۔ ٹکٹ کے مطابق ہم نوبے سے پہلے نیشنل کوچ اسٹیشن پہنچ گئے۔ ہم اسٹیشن کا لفظ ریل کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اس لیے یہ اصطلاح ہضم کرنے میں دو تین منٹ صرف کیے۔ ہم وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئے تھے جبکہ ہماری کوچ نے ساڑھے ۹ بجے کوچ کرنا تھا۔ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں تھے، آن لائن ٹکٹ موبائل میں تھے۔ عملے کے ایک شخص کو موبائل پر آن لائن بکنگ دکھائی تو اس نے ایک بند دفتر کے باہر انتظار کا کہا۔ یہ بھی کہا کہ یہ ۹ بجے کھلے گا۔ ہم منتظر تھے کہ اچانک نوبے کسی خود کار نظام کے تحت دروازہ اوپر اٹھنے لگا۔ دروازہ کھلا تو پہلے کھڑے ہوئے شخص نے اندر بیٹھے ملازم سے مکالمہ شروع کیا۔ مکالمہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کے انداز میں چلتا رہا۔ بات لمبی چلی۔ آخر کو انتظار ختم ہوا اور ہم ٹکٹ کا پرنٹ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

اگلی منزل بس ٹرمینل پر مسافروں کی لائن میں لگنا تھا۔ راستے میں ایک بیٹنج پر ایک سردار جی بیٹھے نظر آئے۔ انھوں نے برنگھم جانا تھا۔ ان کی بس کچھ تاخیر سے آرہی تھی۔ شاہینہ بولی: ”شکر ہے یہاں بھی بسیں لیٹ آتی ہیں۔“ میں نے شکرانے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ سردار جی سردارنی اور چھوٹے سردار کے ساتھ جا رہے تھے۔ یہ کابل سے لندن آ آباد ہوئے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ پنجابی میں بات کر کے خوش ہو رہے تھے اور ہم بھی پنجابی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ لوگ مدت پہلے پاکستان آ کر گوردواروں کی زیارت کر چکے تھے۔ ننکانہ کے گرنجھی کا ذکر ہوا اور اس حوالے سے کلیان سنگھ کا ذکر چھڑا۔ جب تک ہم لائن میں لگے کھڑے رہے، ان سردار جی سے باتیں ہوتی رہیں۔ دروازہ کھلا اور مسافر بس کی طرف چلنے لگے تو سردار جی نے بیٹے سے کہا: ”دولت سنگھ جاؤ سامان رکھوا کر آؤ۔“ وہ برخوردار سعادت اطوار اٹھے اور ہمارے ساتھ سامان لے کر چل پڑے۔ سردارنی نے شاہینہ سے کہا کہ ننکانہ جا کر گوردوارے پر ہماری طرف سے ماتھا ٹیکنا۔ سردار جی نے ہمیں السلام علیکم بھی کہا اور ست سری اکال بھی۔ وہ یقیناً ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور ہم بھی۔ سردارنی نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا، ہم نے بھی سردارنی کو خوش دلی سے سلام عرض کیا اور بس کی طرف چلنے لگے۔ چھوٹے سردار سے ہم نے سامان لے کر شکریہ ادا کیا اور اس کی سعادت اطواری پر حیرت بھی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سردار اپنے بچوں کے ساتھ پنجابی میں کلام کرتے ہیں، ورنہ یہاں بچے اکثر بڑے مہذب انداز میں والدین سے کہتے ہیں۔ Mama Please

Pappa be quiet یا be quiet انگریزی میں یہ جملہ زیادہ بُرائی نہیں لگتا۔ اردو میں اس کا ترجمہ کچھ اچھا نہیں ہے، اس لیے ہم لوگ اسے بے ادبی یا بدتمیزی کہتے ہیں۔

بس روانہ ہوئی اور چھوٹے چھوٹے اشاروں پر رُکتی شہر سے باہر نکلی، مگر یہ موٹروے پر سوار ہونے کی بجائے رابطہ سڑک پر ہوئی، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیہات تھے۔ یہاں کے دیہات دیکھ کر بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ دیہات محرومی کی تصویر ہوتے ہیں۔ دو چار پکے مکانات اور بہت سے خستہ حال کچے مکانات اور جھونپڑے ہوں تو یہ گاؤں ہے۔ یہاں دیہات کے مکان دیکھ کر اسلام آباد اور لاہور کے فارم ہاؤس یاد آتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے فارم ہاؤسز میں باہر سے ہی چوکیدار، گن مین اور بد حال ملازم نظر آتے ہیں۔ وہاں بندے کم ہی نظر آتے ہیں کیونکہ وہ یا تو وہ کھیت میں مشینیں چلاتے ہیں یا گھر میں آرام کرتے ہیں۔ یہاں کے دیہات میں آوارہ لڑکے بالے بھی نظر نہیں آتے نہ ہی وہ سڑک پر ہی کرکٹ یا کوئی بدیشی قسم کی گیم کھیلتے نظر آتے ہیں۔ یہاں قدرت ویسے ہی بہت مہربان ہے۔ اس نے چاروں طرف سبز رنگ بکھیر دیا ہے۔ دورویہ سرسبز و شاداب کھیت، بعض کھیتوں میں لہلہاتا سبزہ اور سبزہ چرتی گائیں اور بھیڑیں۔ ہم یہ مناظر دیکھتے اور آنکھیں ٹھنڈی کرتے آگے بڑھتے رہے۔ بس نے ایک طویل فاصلہ ان دیہات میں چکر کاٹتے طے کیا اور پھر موٹروے پر چڑھ گئی۔

بس میں دو مسافروں کی سیٹ پر میں اکیلا تھا۔ اگلی سیٹ پر ایک محترمہ تشریف فرما تھیں۔ یہاں کسی قسم کا کوئی قصہ وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، کیونکہ میں نے انیس ناگی کا یہ قول سن رکھا تھا: ”مستنصر حسین تارڑ سے میرا رنگ و روپ بھی بہتر ہے اور انگریزی بھی زیادہ جانتا ہوں، بلکہ میں تو فرنیچر بھی جانتا ہوں۔ میں کئی بار یورپ گیا ہوں، مگر مجھے تو کسی حسینہ نے جوتا بھی نہیں مارا۔“ اس جملے میں جوتا مارنا پنجابی محاورہ ہے، ورنہ کوئی شریف آدمی جوتا کھانے کی خواہش کیوں کرے گا، چاہے جوتا مارنے والی سفید فام حسینہ ہی ہو۔ میں نے دل کو ضرورت اور معمول سے بڑھ کر دھڑکنے سے باز رکھا۔ مجھ سے آگے بیٹھی حسینہ موبائل پر محفوق گفتگو تھیں۔ پہلے تو میں نے انھیں نظر انداز کیا، مگر وہ اس انداز میں محکوم تھیں کہ میں آواز تو پوری سنوں، مگر مفہوم سے بے خبر ہوں۔ ویسے بھی مانچسٹر کی انگریزی ہماری انگریزی سے مختلف نہ بھی ہو، بہر حال تیز رفتار ہے۔ میں ان کے کلام سے ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ انگریز آس پاس کے لوگوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے خاموش رہتے ہیں اور کتاب بینی میں مصروف رہتے ہیں، مگر یہ محترمہ کسی دور بیٹھے شخص (کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے) کے جذبات کا خیال کر رہی تھی یا ان سے کھلواڑ، مگر میرے جذبات سے بے خبر تھیں۔ میرے جذبات کا تقاضا یہ تو قطعاً نہیں تھا کہ وہ کسی اور سے ہمکلام ہونے کی بجائے میرے ساتھ محکوم ہوں، بلکہ صرف یہ تقاضا تھا کہ وہ چپ رہیں اور مجھے حسن فطرت سے ہمکلام ہونے دیں جس نے پوری فراخ دلی اور دریادلی سے چاروں طرف دور دور تک اپنا حسن بکھیر رکھا تھا۔ اقبال کا مصرع یاد آیا: ع ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہراچھے کہ بن

آں محترمہ گھنٹہ بھر مسلسل بولتی رہیں اور اس انداز میں بولتی رہیں کہ کہیں پنکچو ایشن کی کسی علامت کو آنے کی اجازت نہ دی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مخاطب کوئی مرد ہوگا، ورنہ کسی خاتون کی اتنی طویل گفتگو کوئی خاتون کیوں کر سنے گی، اس کے بعد وہ کچھ دیر شاید موبائل سے کھیلتی رہیں کہ اچانک پھر رواں ہو گئیں۔ اب کے گفتگو میں خاموشی کے وقفے بھی آنے لگے۔ بعض اوقات وقفے طویل بھی

ہوتے تھے۔ گویا دوسری طرف کوئی ایسی شخصیت ہے جو صرف سننا ہی کافی نہیں سمجھتی، جواب دینا بھی ضروری خیال کرتی ہے۔
 بس میں دو دفعہ ڈرائیور تبدیل ہوئے، یہاں کوئی شخص مسلسل دو گھنٹے سے زیادہ ڈرائیونگ کرنے کا نہ مجاز ہے نہ روادار۔
 ہمارے ہاں تو کئی کئی گھنٹے ڈرائیونگ کا عام رواج ہے۔ برطانیہ کا یہ رواج یا قانون اچھا لگا۔ ایک جگہ ڈرائیور تبدیل ہونا تھا۔ ہم سمجھے کہ
 یہاں ریست کا وقفہ ہے، مگر نہیں، آپ بس سے اتر ہی نہیں سکتے۔ حوائج ضروریہ کے لیے جہاز کی طرح بس میں ہی انتظام ہے۔ اگر
 بھوک لگی ہے تو کوئی بات نہیں، صبر کیجیے۔ اگر اپنی بھوک کا ایسا ہی خیال ہے تو کھانے کی کوئی شے ساتھ لے کر چلتے۔ ہمارے ہاں جی ٹی
 روڈ ہو یا موٹروے، لمبے سفر میں ایک وقفہ لازم ہے۔ آپ چائے وائے لیجیے اور تازہ دم ہو کر سفر کیجیے۔ یہ بہر حال اچھی بات ہے۔
 ڈرائیور کے لیے آرام ضروری ہے تو مسافر کے لیے بھی تازہ دم ہونا کوئی ایسا غیر ضروری کام نہیں۔

راستے میں ہمیں دورویہ کھیت نظر آتے تھے یا کہیں کہیں وینڈل۔ کہیں بھیڑیں چرتی نظر آئیں، کہیں گائیں اور چند ایک جگہ
 گھوڑے چرتے پھرتے دکھائی دیئے۔ بکریاں کہیں نظر نہیں آئیں۔ بکریوں کو کسی باڑے کے اندر پابند رکھنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص
 بکریوں کو باڑے میں قید کی حرکت کر بیٹھتا تو یقیناً بکریاں موٹروے پر ہوتیں۔ بکریاں چرا مار یا صحت طلب کام ہے۔ اس میں ذہن اور
 جسم دونوں مشقت اٹھاتے ہیں۔ یہ کام یہاں نہیں ہوتا۔

ہم لندن کے قریب پہنچے تو اس کا اندازہ بلند و بالا عمارات سے ہوا۔ اتنی بلند عمارات کہ ان سے لندن اور انگلینڈ کی
 عظمت (Glory) واضح ہو رہی تھی۔ امپریلزم مصر کے فرعونوں کا ہو، رومنوں کا ہو یا انگریزوں کا، عمارات کی بلندی سے عوام کو مرعوب
 اور مسحور کیا جاتا ہے۔ امپریل فوٹ اتنی بلندی سے مخلوق خدا کو دیکھتی ہے اور اتنی دور سے کہ مخلوق خدا کیڑے مکوڑے نظر آئے۔

ہم وکٹوریا کوچ اسٹیشن پر اترے تو بھوک اور تھکن سے بُرا حال تھا۔ اسٹیشن کی کینٹین سے کھانے کی اشیا خریدیں اور چائے
 کے ساتھ کھانے کی کفرارغ ہوئے۔ سامان زیادہ تھا اس لیے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا لمبا چکر کاٹنے کی کوشش کی پھر ایک دو پھیریاں
 لگائیں اور ہمیں ”لینا“ کے دفتر کے سامنے اتار دیا۔ ہم نے نیل دی تو وہ ہمیں اور ہمارے سامان کو لے کر اوپر اپنے دفتر میں گئی۔ اس کا
 دفتر کوئی ایسا وسیع دفتر نہیں تھا۔ ایک کمرہ تھا جس میں اس کے ساتھ اس کی کولیگ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی مصروف کار تھی۔ ”لینا“ نے ہمیں
 چائے پلائی اور ہم باہر نکلے تاکہ سیر کا آغاز کر سکیں۔ لینا ہمیں راستہ سمجھانے ہمارے ساتھ نیچے آئی۔ اُس کا دفتر آکسفورڈ سٹریٹ کے
 قریب تھا۔ سٹریٹ سے کوئی کرتب دکھانے والا منڈوانہ سمجھیے، اس کا مطلب گول چکر ہے۔ سٹریٹ کا یہ مطلب پہلی بار آشکار ہوا۔ ہمیں
 آکسفورڈ سٹریٹ سے سیدھا جانا تھا۔ انجام کار ہم لوگ ہائیڈ پارک پہنچ سکتے تھے۔ آکسفورڈ سٹریٹ پر کھڑے ہو کر ہمیں راستے بتانے کی
 بجائے ”لینا“ نے ہمیں ایک اور سڑک دکھائی جس پر بہت قدیم عمارتیں تھیں۔ سڑکوں کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ ”لینا“ کہہ رہی تھی کہ
 لندن کبھی بہت غیر مرتب شہر ہوا کرتا تھا۔ ہم جس علاقے میں تھے، وہ سترہویں صدی سے اب تک آباد ہے۔

”لینا“ نے عمارات دکھاتے ہوئے پرانی صدیاں گونا گونا شروع کیں تو شاہینہ واری صدقے ہوتے ہوئے کہنے لگیں:

”تاریخ تو ”لینا“ کو آتی ہے۔“

”لینا“ بتا رہی ہے: ”یہاں سیلابی پانی آ جاتا تھا تو اس کو روکنے کے لیے زنجیروں سے تختے باندھ کر یہاں لگائے جاتے

تھے۔ یہ وہ سٹور ہے جس کی واحد خوبی اشیا کا بہت گراں ہونا ہے۔“ ہم اندر داخل ہو گئے۔ اشیا گراں قیمت تھیں اور بعض گراں مایہ بھی نظر آئیں، ہم مگر خریدار نہ تھے۔ اُدھر بی۔ بی۔ سی ہے۔ یہ سڑک اس طرف جا رہی ہے اور آکسفورڈ سٹریٹ سیدھی ہائیڈ پارک کو جاتی ہے۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ ”لینا“ واپس اپنے دفتر چلی گئی۔ ہم آگے چلتے گئے۔ دائیں بائیں سٹور ہی سٹور، لوگ ہی لوگ، اتنا ازدحام، اس قدر گہما گہمی مانچسٹر میں کبھی سوچی بھی نہ تھی، ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ پھٹ نہ جائیں۔ آخر ایک سٹور پر خواتین اندر چلی گئیں، یہ خاکسار باہر ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ خریداری کا مشاہدہ بھی بوریٹ کا باعث ہوتا ہے۔ سڑک پر بیٹھ کر بندہ کم از کم آنے جانے والوں کا مشاہدہ تو کر سکتا ہے۔ یہاں دو مناظر ایسے تھے جو منفرد تھے۔ ایک تو چنگ چی قسم کار کشا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس میں آگے پیچھے سیٹیں نہیں تھیں، ڈرائیور کے پیچھے سیٹیں تھیں، دوسرے اس پر چھت نہیں تھی۔ شاید یہ سیر کرنے والوں کے لیے بنا ہے۔ دوسرے ایک بس ایسی گزری جس پر پاکستان کی ایڈورٹائزمنٹ کی گئی تھی۔ پتا چلا کہ دس بسیں پاکستان نے مستعار لی ہیں تاکہ پاکستانی کلچر کی اشاعت کی جاسکے۔

کچھ دیر بعد شاہینہ باہر آگئی اور وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ کافی دیر بعد وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اچانک ”جیا“ نے فیصلہ سنایا: ”آؤ اب واپس چلیں۔“

”تو کیا میں یہاں بیچ پر بیٹھنے کے لیے آیا تھا۔“ پاکستان نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”دھکے کھانے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اب ہم ہائیڈ پارک جا رہے تھے اور میرے سوا سبھی خوش مزاج دکھائی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم لوگ ہائیڈ پارک میں داخل ہوئے۔ لیجیے صاحب ہم اس کونے میں کھڑے تھے جہاں Speakers Corner کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہاں ہم لوگ کچھ دیر کھڑے رہے مگر نہ کوئی پیکر آیا، نہ سامع۔ اس لیے پارک دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ پارک میں آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ جونی گھنٹہ کے حساب سے کرائے پر دی جاتی تھیں۔ برطانیہ کا بنیادین تو خیر ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ یہ کرسیاں دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں ایک کرسی کچھ اسی شکل و صورت کی ہمارے گھر میں ہوتی تھی۔ یقیناً انگریز حاکموں نے اس کا ڈیزائن ہندوستان میں متعارف کرایا ہوگا۔

ہم نے ہائیڈ پارک میں کچھ دیر چہل قدمی کے بعد واپسی کی راہ لی کہ ”لینا“ کا دفتر بند ہونے والا ہے۔ جلدی کا یہ احساس اس وقت مٹ جاتا ہے جب عورت خریداری کر رہی ہو۔ بہر حال ہم چل رہے تھے کہ ”جیا“ کو خیال آیا کہ اسے تو ایک اور چیز خریدنا ہے۔ وہ پھر کسی سٹور میں داخل ہو گئی۔ ہم چلتے رہے اور یہ سوچ کر چلتے رہے کہ وہ خود ہی آجائے گی مگر ”لینا“ کے دفتر جا کر ہمیں کافی دیر اس کا انتظار کرنا پڑا۔

ہم لوگ ٹیکسی پر بیٹھے ”لینا“ کے فلیٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ فلیٹ بارکنگ کے علاقے کرزن کریسنٹ میں ہے اور دفتر شہر کے وسط میں۔ ٹیکسی دریاے تھیمز کے قریب آئی ہمارے ہاں اسے ٹیمز کہتے ہیں۔ یہ لندن برج ہے۔ یہ لندن ٹاور ہے۔ یہ بینکوں کے مرکزی دفاتر ہیں جو اونچی اونچی بلڈنگوں میں ہیں۔ اوپر سے دیکھیں تو ان کی روشنیاں Blink کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ٹیکسی چلتی رہی، چلتی رہی۔ آخر ایک جگہ ٹیکسی رک جاتی ہے۔ ہم لوگ سامان اٹھا کر لفٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ لفٹ ساتویں منزل پر جاتی ہے۔ ”ہم

آٹھویں فلور پر جائیں گے اور دیکھیں میں نے ۷ نمبر دیا ہے، وہ قہقہے لگا رہی ہے۔

ہم ساتویں فلور سے سیڑھیاں چڑھتے آٹھویں فلور پر جاتے اور فلیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ میری توقع سے بڑا ہے۔ اس میں ایک بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم، کچن اور باتھ روم ہے۔ ہر سہولت میسر ہے جو کسی فلیٹ میں ہو سکتی ہے۔ ہر وہ خرابی ہے جو کسی بھی پیپلر لاج میں ہو سکتی ہے۔ ”لینا“ نے جلدی جلدی کھانا پکایا اور ہم کھا کر ٹی وی دیکھنے لگے اور کچھ دیر بعد نیند کی وادی میں تھے۔ ۳۰ اگست کو ہم نے کیمبرج جانا تھا۔ ہم صبح منہ اندھیرے جلدی جلدی تیار ہو رہے تھے کہ ”لینا“ نے اعلان کیا ”ٹیکسی آ رہی ہے۔“ ٹیکسی اوپر کمپنی کی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جائیں نہ جائیں ٹیکسی والے کو معاوضہ دینا ہوگا۔ اب ہمیں کم از کم وقت میں تیار ہو کر نیچے اترنا تھا۔ کچھ دیر میں ہم ٹیکسی میں تھے اور لیور پول اسٹریٹ اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارا رخ شہر کے مرکزی علاقے کی طرف ہے۔ ابھی تک روشنی نہیں ہوئی۔ بینکوں کے مرکزی دفاتر کی روشنیاں بلنک کر رہی ہیں۔ ٹیکسی رُک جاتی ہے۔ ہم بشپ گیٹ انسٹیٹیوٹ کے پاس سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک لائبریری ہے جہاں تعلیمی کورسز بھی کرائے جاتے ہیں۔ لندن آرکائیوز، آرٹ اور کلچر، الفاظ و خیالات، بدن اور ورزش، پرفارمنگ آرٹس اور زبانوں کے کورسز ہوتے ہیں۔ ان زبانوں میں عربی زبان بھی شامل ہے، مگر اردو نہیں، ہندی بھی نہیں، کیوں، یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم جلدی میں ہیں اور اس ادارے سے منہ پھیر کر ہی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ لیور پول اسٹریٹ اسٹیشن ہے۔ یہاں سے کیمبرج کو ٹرین جاتی ہے۔ جو بہت مہنگی ہے۔ یہاں لوکل ٹرین کچھ زیادہ مہنگی نہیں، لندن میں لوکل ٹرین زیادہ تر زیر زمین ہے۔ اس کو ٹیوب کہا جاتا ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جانے والی ٹرین نیشنل سروس کہلاتی ہے۔ ہم فی کس ۳۵ پونڈز کے حساب سے کیمبرج کا ریٹرن ٹکٹ خریدتے ہیں۔ ہم اسٹیشن پر ہی چائے پیتے ہیں کہ تازہ دم ہو سکیں۔ نیندا ابھی تک ہمارے تعاقب میں ہے کہ ہم رات دیر سے سوئے تھے اور صبح بہت جلدی اٹھے تھے۔ کل کی تھکاوٹ ابھی تک بدن میں کہیں چھپ کر بیٹھی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اس کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ ہمارا آج کا ٹور خراب ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ احتیاطاً جلدی پہنچ گئے ہیں۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر انتظار کرنا پڑا۔ ہمارے بچپن میں اسٹیشن اور ان کے پلیٹ فارم بہت آباد ہوتے تھے۔ دیہاتی مسافر صاف ستھرے کپڑے پہنے گھنٹوں گاڑیوں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اب ریلوے ٹرینیں کم ہو گئی ہیں اور پلیٹ فارم اجڑ گئے ہیں۔ انگریزوں نے ہمیں گاڑیاں دی تھیں اور پلیٹ فارم ہٹا کر دیئے تھے، مگر یہ بتانا بھول گئے تھے کہ اسے آباد کیسے رکھنا ہے یا شاید ہم بھول گئے ہیں کہ اسے کیسے زندہ اور آباد رکھنا ہے۔

اب ہم لوگ ٹرین میں ہیں۔ ٹرین کا ڈبہ اس قدر خوبصورت اور سیٹیں اتنی آرام دہ ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ یہ اعلیٰ درجے کے ڈبے ہیں۔ میں دوسرے ڈبے میں جاتا ہوں، وہاں سیٹوں کے درمیان میز بھی ہیں۔ سارے ڈبے ایک سے اور آرام دہ ہیں، مگر سواریاں کم ہیں۔ شاہینہ پوچھتی ہے کہ یہ گاڑی تو خالی ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ صبح سویرے بڑے شہر سے چھوٹے شہر کو جانے والی گاڑیاں خالی ہوتی ہیں اور چھوٹے شہر سے بڑے شہر کو آنے والی گاڑیاں مسافروں سے لہالب بھری ہوتی ہیں۔ وہ سُن کر چپ ہو جاتی ہے۔ شاید سوچنے لگتی ہے۔ میں بھی سوچنے لگتا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیمبرج میں برصغیر کے کون کون سے لوگ پڑھتے رہے تھے۔

جسٹس سید محمود، سرسید احمد خاں کے بیٹے اور الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سینٹ کرائسٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ علامہ اقبال تھے جو ٹرینیٹی کالج میں پڑھے تھے۔ چودھری رحمت علی وہاں کے قبرستان میں دفن تھے۔ گویا کیمبرج ہماری تاریخ کا حصہ بھی ہے۔ نوآبادیاں امپریل ازم کی تاریخ سے سوبار جان چھڑانا چاہیں، نہیں چھڑا سکتیں۔

ہم کیمبرج اسٹیشن پر اتر کر سوچتے ہیں کہ ابھی سوراج سورہا ہوگا۔ اسے کچھ دیر بعد فون کریں گے، سوراج جیا کی کلاس فیلو اپنا کابیٹا ہے۔ یہ پنڈی کی تھی، مگر اب ماسکو میں آباد ہے۔ ہم اسٹیشن سے باہر آتے ہیں تو سوراج ہمارا منتظر ہے۔ ہم نے اسے کل ہی بتایا تھا کہ ہم کس گاڑی سے آرہے ہیں۔ سوراج دھان پان سانو جوان ہے۔ شکل سے یونیورسٹی کا طالب علم نہیں لگتا، ہمارے ہاں کا کالج کا طالب علم لگتا ہے۔ ویسے بھی اُس نے حلیہ ایسا بنا رکھا ہے کہ بالکل کالج کے طالب علم جیسا۔ سادہ سا لباس اور کمر پر بستہ۔ اس نے کیمبرج سے گریجوایشن کیا ہے۔ اب وہ آکسفورڈ میں داخلہ لے چکا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ آکسفورڈ چلا جائے گا۔ اسے سکا لرشپ ملا ہے۔ وہ آکسفورڈ میں طلبہ کو گائیڈ بھی کرے گا اور خود بھی ڈاکٹر بیٹ کرے گا۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا آکسفورڈ کیمبرج سے بہتر ہے کہ تم وہاں سے ڈاکٹر بیٹ کرو گے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ داخلے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ایک تو اسے وہاں سے اسکا لرشپ ملا ہے، دوسرے آکسفورڈ نئی جگہ ہوگی۔ نئے لوگ ملیں گے، نئے لوگوں سے نئی باتیں سننے کو ملیں گی۔ نئے رویے دیکھنے کو ملیں گے۔ وہ باتونی نہیں ہے۔ زیادہ تر سننے پر توجہ دیتا ہے، مگر آج اُسے بولنا پڑتا ہے۔ وہ مناسب لفظوں میں بات کرتا ہے، سچے تلمے لفظوں میں اور معقولیت کے ساتھ۔ اس کا نام سوراج داش ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ داش کیوں، داس کیوں نہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے داس ہی تھے اور اتر پردیش سے گئے تھے۔ بہار میں جا کر داش ہو گئے۔

سوراج ہمیں بتاتا ہے کہ کیمبرج اتنا وسیع ہے کہ سارا کا سارا دیکھنا ایک دن میں ممکن ہی نہیں، اس لیے وہ ہمیں زیادہ اہم کالج ہی دکھاپائے گا۔ وہ ہمیں سب سے پہلے کرائسٹ کالج میں لے جاتا ہے۔ کالج میں بہت سے حصے خفیہ ہیں۔ ان پر پرائیویٹ لکھا ہوا ہے، مگر ہم وہاں جاسکتے ہیں۔ سوراج کا سٹوڈنٹ کارڈ ایسا ہے کہ ہم کہیں بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ ہیں اس لیے یہاں کے باغ اور پول دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس کا حسن فطرت کا عطیہ ہے۔ درخت، پودے اور پھول جنہیں تمام عمر دیکھا جاسکے۔ یہ ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں چار سو سال پرانا ملمبری کا درخت ہے جہاں ملٹن بیٹھتا تھا۔ گویا ملٹن یہاں طالب علم رہا تھا۔ یہاں ڈارون بھی داخل ہوا تھا تا کہ پادری بن سکے، مگر اس کے نظریات پادریوں سے ٹکرا گئے اور وہ سائنس دان بن گیا۔ ڈارون انگلینڈ کے میوزیمز پر چھایا ہوا ہے۔ تاریخ فطرت کے شعبے میں ڈارون سے آغاز کیا جاتا ہے اور اکثر ڈارون صاحب تاریخ فطرت کے حصے میں صدر دروازے پر پتھر کی مورتی میں ڈھلے ہوئے تشریف فرمانظر آتے ہیں۔ خیر ہمارے ہاں تو ان کا تعارف صرف یہی ہے کہ انھوں نے کہا تھا بندہ اصل میں بندر تھا۔ اس بات کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:

ع ڈارون بولا بوز نہ ہوں میں

یہاں آ کر پتا چلا کہ انھوں نے نباتیات اور حیوانیات کے شعبے میں بہت کام کیا اور ان علوم کو بہت وسعت دی۔ اب وہ بیالوجی کے تمام شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ ۱۸۲۷ء میں یہاں بطور طالب علم داخل ہوئے تھے۔ ان سے کوئی نصف صدی بعد

ہمارے محترم سید محمود یہاں آئے تھے، مگر وہ انسانیات کے شعبے میں داخل ہوئے تھے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کیمبرج اور آکسفورڈ اُس طرح کی یونیورسٹیز نہیں ہیں جیسی دنیا بھر میں موجود ہیں۔ یہ کالجوں کے شہر ہیں۔ میں نے سوراج سے سوال کیا کہ یہاں کل کتنے کالج ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ یہاں اکتیس کالج ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس کالج میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”پڑھائی ٹوفیکٹی میں ہوتی ہے، وہ الگ ہے۔“

میں اُلجھ سا جاتا ہوں کہ یہ کالج ہے اور پڑھائی ٹیکٹی میں ہوتی۔ یہاں لائبریری ہے، باغ ہے، پول ہے، یہاں پرندے ہیں، بطنیں ہیں، طالب علم ہیں اور پڑھائی ٹیکٹی میں ہوتی ہے۔ ”تو پھر یہاں کیا ہوتا ہے۔“ میں سوال کرتا ہوں۔

”یہاں سٹوڈنٹ رہتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، ملتے جلتے ہیں، لائبریری ہے، اس میں مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک دو مضامین کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں ہاؤس ماسٹر اور ہاؤس آفیسر ہوتے ہیں۔“

وہ کیا کرتے ہیں؟

وہ انتظامی معاملات کو سلجھاتے ہیں۔

میں اور اُلجھ جاتا ہوں۔ سوال پر سوال کرتا ہوں۔ وہ بتاتا ہے کہ یہاں طالب علم داخل ہوتے ہیں۔ مختلف مضامین کے طلبہ یہاں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہ ہاؤس آفیسرز کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ اپنی لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے لیکچرز ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔ ٹیکٹی کے لوگ لیکچر دیتے ہیں۔

یہ ہاؤس آفیسر اور ہاؤس ماسٹر کون ہوتے ہیں؟ میں سوال کرتا ہوں۔

یہ ٹیکٹی ممبر ہوتے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹ میں اپنے مضامین کے لیکچر دیتے ہیں۔ کالج میں ہاؤس آفیسر اور ہاؤس ماسٹر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

کالج کی بلڈنگ تو مرعوب کن اور متاثر کن ہے۔ اس کے گارڈن بھی مسحور کن ہیں، مگر اس کے لان دیکھ کر تو میں بے حد حیران ہو جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے قالین بچھا ہوا ہے۔ گھاس کی پیتیاں ایک جیسی اور ایک جتنی ہیں۔ یہ تو قدرت کی مہربانی ہے کہ بارشیں گھاس کی روئیدگی کا بندوبست کرتی رہتی ہیں، مگر یہ انسانی محنت کا کمال ہے کہ وہ مسلسل اسے کاٹ چھانٹ کر ایک سائز سے بڑھنے نہیں دیتی۔ سوراج بتاتا ہے کہ یہ لان ایسا ہے کہ اس پر طلبہ اور اُن کے وزٹر چل سکتے ہیں۔ ہم ان پر چل کر دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ فلاں لان ایسا ہے کہ اُس پر صرف اساتذہ اور اُن کے وزٹر چل سکتے ہیں۔ طلبہ کہا کرتے ہیں کہ ہم بھی ٹیکٹی ممبر بنیں گے تاکہ ان لانز پر چل پھر سکیں۔ سوراج بتاتا ہے کہ آکسفورڈ میں بعض لانز ایسے ہیں جن پر ٹیکٹی ممبر بھی نہیں چل سکتے۔ وہ کچھ دیر چپ رہ کر کہتا ہے: ”اُن پر صرف گارڈنر چل سکتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑتا ہے۔ ہم بھی ہنسی میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا کوئی طالب علم ان لانز پر چلنے کی آرزو بھی نہیں کر سکتا۔ کسی لان پر کوئی نوٹس نہیں ہے، مگر قوانین کی مکمل پابندی ہوتی ہے۔

وہ کالج کی تاریخ بتا رہا ہے کہ یہ کالج ۱۵۰۵ء میں وجود میں آیا اور ہنری ہفتم کی دادی نے اس کی تاسیس کی تھی۔ وہ بتا رہا ہے کہ کالج کا ماحول تو بہت خوبصورت تھا، مگر سترہویں صدی میں اس کی تعمیر بہت بُرے انداز میں ہوئی۔ خوبصورت باغوں میں بھدی سی

عمارت اچھی نہ لگتی تھی، اس لیے اٹھارہویں صدی کے شروع میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اب اس کی عمارت بھی اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی اس کے باغ ہیں۔ ایک جگہ دیوار پر ان لوگوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے عظیم جنگوں میں قربانی دی۔ لگتا ہے کہ عظیم جنگیں ابھی تک برطانوی لوگوں کی یادوں پر مسلط ہیں۔ وہ ان کی اچھی بُری یادوں کو یادگاروں اور یادگاری تختیوں کے ذریعے یاد رکھے ہوئے ہیں۔

ہمارا اگلا پڑاؤ عمانوئیل کالج ہے یہ ۱۵۸۴ء میں بنایا گیا، اُن دنوں یہ بھی ایک مدرسہ تھا، جس میں پادری تیار کیے جاتے تھے۔ اس کے آغاز سے متعلق ایک مکالمہ بیان کیا جاتا ہے: ”ملکہ الزبتھ اول نے کہا: کیا تم نے ایک مقدس پتھر پر ایک عمارت کی بنا ڈالی ہے؟“

”سروالٹر: جی ہاں میں نے ایک بیج بویا ہے دیکھتے ہیں یہ کب ایک درخت بنتا ہے۔ صرف خداوند خدا جانتا ہے کہ اس کا پھل کیا ہوگا۔“

جلد ہی یہاں سے ۳۵ سال امریکا کے سفر پر نکلے تاکہ دین مسیحی پھیلا سکیں۔ ان اسکا لرز میں جان ہارورڈ بھی شامل تھا۔

عمانوئیل کالج میں بھی باغ ہیں اور خفیہ باغ بھی۔ ان پر پرائیویٹ کا بورڈ لگا ہوا ہے، مگر ہم وہاں بھی جاسکتے ہیں کہ ہم سوراج کے ساتھ ہیں۔ ابھی تک کسی نے پوچھا ہے، نہ ہی سوراج کو کچھ بتانا پڑا ہے۔ وہ ہمیں ہر جگہ لیے لیے پھرتا ہے۔ صرف لائبریری میں جانے سے گریزاں ہے۔ وہ دور ہی سے بتا دیتا ہے کہ اس کالج کی لائبریری بھی بہت بڑی ہے۔ ہر کالج کا ایک چپیل ہے۔ چپیل کو چرچ کا جزو کہا جاسکتا ہے۔ سوراج چپیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ صرف یہ بتاتا ہے کہ یہاں صرف وزٹ آتے ہیں۔ طلبہ کم ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ عمانوئیل کالج کا چپیل بہت ہی خوبصورت ہے۔ اسے مذہب کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں حتیٰ کہ وہ ہندومت کے بارے میں بھی بہت کم جانتا ہے۔ وہ صرف یہ دکھاتا ہے کہ یہ چپیل بہت خوبصورت ہے۔ ان کی خوبصورتی کا زیادہ تر دارو مدار کٹڑی کے کام پر ہے یا بلڈنگ کی بلندی اور وسعت پر۔ ہر چپیل میں تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصویریں، دینی مسیحی کے اکابر ولیوں اور بزرگوں کی تصویریں۔ لیجیے ہم عمانوئیل کالج سے باہر آتے ہیں اور پھر یہ ڈاؤنگ کالج ہے اس کی عمارت مختلف قسم کی ہے۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں میوزیم بھی ہیں یہ اترھ سائنسز کا میوزیم ہے۔ یہ آرکیالوجی کا میوزیم ہے۔ یہ تاریخ سائنس کا میوزیم ہے۔ یہ زوالوجی کا میوزیم ہے۔ ہم انہیں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے کہ وقت کم ہے اور ہر میوزیم ایسا ہے کہ ہم لوگ دن بھر میں صرف ایک میوزیم ہی دیکھ پائیں گے۔ میوزیم تو انگلینڈ میں ہر شہر میں ہیں۔ لندن میں تو میوزیم ہی میوزیم ہیں۔ یہاں ہم صرف کالج ہی دیکھ پائیں تو کافی ہے۔ میوزیمز کو ہم دور سے سلام کرتے آگے بڑھتے ہیں۔

ہم گلیوں گلیوں آگے بڑھ رہے ہیں۔ گلیاں ایسی ٹیڑھی میڑھی اور بے ترتیب ہیں جیسے ہمارے دیہات میں ہوتی ہیں۔ تھوڑا سا چلے اور دائیں یا بائیں مڑ گئے۔ کبھی گلی بہت کھلی آگئی اور پھر تنگ ہوگئی۔ دائیں طرف کی دیوار یا بائیں طرف کی دیوار چھ آٹھ فٹ تک کھر درے پتھروں سے بنی ہوئی، اوپر خوبصورت اینٹوں سے تعمیر شدہ۔ کسی نے اسے پلستر سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ بڑی سڑک بھی سیدھی نہیں جاتی، بل کھاتے ہوئے جا رہی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں گاؤں کے لوگوں کے مویشی آتے جاتے تھے۔ اب یہاں سیاح آئے ہوئے ہیں۔ ہر چوک پر گائیڈ نظر آتے ہیں جو آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ سوراج اُن کی آفر سن کر

ہنس دیتا ہے اور شکر یہ ادا کر کے اُن سے جان چھڑاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہاں گائیڈ اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں کے مقامی لوگوں کو بھی دن میں کئی کئی بار گائیڈ پوچھتا ہے: ”آؤ آپ کو سیر کرا دوں۔“

کہتے ہیں انگلینڈ میں تین W ایسے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں Woman، Work اور Weather۔ ہم لوگ اس قول سے بے خبر تھے، اس لیے چھتریوں کے بغیر تھے اور گلیوں میں بھگتے پھرتے تھے۔ یہاں اکثر لوگ چھتریاں اٹھائے ہوئے تھے، مگر میں نے ایک جگہ سے ایک اخبار اٹھا لیا۔ اسے سر پر رکھے پھرتا رہا۔ جب یہ کافی گیلا ہو گیا تو ایک اور جگہ سے ایک اور اخبار لے لیا۔ یہاں بہت سے اخبار ہیں جو مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ چند بڑے اخبار ہیں خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ بقیہ سبھی اخبار مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ میں بھی مفت تقسیم سے لطف لے رہا تھا۔ اب سوراج ہمیں ٹرینٹی ہال میں لے گیا۔ یہ اس کا اپنا کالج تھا۔

ٹرینٹی ہال کالج کا نام ہے جو ۱۳۵۰ء میں بنایا گیا۔ اس کا پہلا مقصد تو وکیل تیار کرنا تھا۔ جو پلیگ کی وجہ سے مرنے والوں کے معاملات نبٹا سکیں۔ اب یہاں ہر مضمون کے طالب علم داخلہ لیتے ہیں۔ سوراج نے بتایا کہ ہاؤس ماسٹر نے فرسٹ آنے والے کے لیے دو شلنگ کا انعام رکھا تھا۔ ان دو شلنگ کی قیمت آج کے سکے میں ۳۵۰ پونڈ ہے، مگر انعام پانے والا یہ دو شلنگ سنبھال کر رکھتا ہے۔ شلنگ جب بند ہوا تو اس کالج نے ڈھیروں ڈھیروں شلنگ خرید لیے۔ یہ ایک ہاؤس ماسٹر کی چھوڑی ہوئی رقم سے خریدے گئے۔ اُسے یہ دو شلنگ یہاں کے پھیل میں ہونے والی ایک تقریب میں دیے گئے اور اب یہ انعام اس کی ماں نے سنبھالا ہوا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ کمرہ سٹیفن ہانگ کا ہے۔ کمرے کے باہر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ کیمبرج اپنے طلبہ کو یاد رکھتا ہے۔ سوراج نے بتایا کہ سٹیفن ہانگ یہاں کی ایک تقریب میں آیا تھا، اس نے سٹیفن کے ساتھ اپنی تصویر بھی دکھائی۔ وہ اس پر بہت خوش ہو رہا تھا۔ یہاں ایک جگہ مختلف مواقع کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر کوئی سوا صدی پہلے کے کانوکیشن کی تھی۔ اس تقریب میں خواتین بھی تھیں اور خواتین نے جو لباس پہن رکھا تھا اس نے نہ صرف جسم کو لپیٹ رکھا تھا، بلکہ اس کو پورے طور پر ڈھانپ بھی رکھا تھا۔ گویا برطانیہ میں کم لباسی کی عمر ایک صدی سے زیادہ نہیں تھی۔

اب ہم ٹرینٹی ہال کے ایک لان میں کھڑے تھے کہ میں دیوار پار کا منظر دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ دیوار کے ساتھ دریا بہہ رہا تھا۔ سوراج نے بتایا کہ دریا کا نام CAM ہے اور اس قصبے کا آغاز ایک پل Bridge سے ہوا تھا۔ اسی پل کا نام Cambridge ہی اس قصبے کا نام ٹھہرا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نہر کنارے ہے اور یہ دریا کنارے ہے۔ دریا میں کشتیاں چلتی ہوئی نظر آئیں۔ سوراج بتاتا ہے:

”کیمبرج کی سیر کا بنیادی حصہ کشتی کی سواری ہے۔ آج بارش کافی تیز ہے، اس لیے کشتیاں کم ہیں۔ اگر بارش تھم جائے تو میں آپ کو کشتی کی سیر کرا دوں گا۔“

ہم کشتیوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ تعداد میں کم ہیں، مگر باہمت لوگ دریا کی سیر کا لطف لے رہے ہیں۔ سوراج بتاتا ہے کہ یہاں اس قدر زیادہ کشتیاں ہوتی ہیں کہ ایک کشتی کے لوگ دوسری کشتی کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور دوسری کشتی کے ملال کو کہنا پڑتا ہے کہ ”سر! کیا آپ براہ کرم کشتی کو چھوڑ دیں گے۔“ اتنی زیادہ کشتیاں ہوتی ہیں کہ دریا ان سے بھر جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آکسفورڈ کے

پاس بھی دریا ہے۔ یہاں کے طلبہ اور آکسفورڈ کے طلبہ کے مابین کشتی رانی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ میں اس سے پوچھ بیٹھتا ہوں کہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں کیا فرق ہے؟

وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ وہ ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے اور کہتا ہے کہ ”شاید ان میں سے ایک کیتھولک ہے اور ایک پروٹسٹنٹ ہے۔“ ”مگر یہ تو اتنے پرانے ہیں کہ تب پروٹسٹنٹ وجود میں نہیں آئے تھے۔“ میں اس کی اصلاح کرتا ہوں۔ وہ خوشدلی سے میری بات مان لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”کیمبرج کی تاریخ تو معلوم ہے، مگر آکسفورڈ کی تاریخ زیادہ پرانی ہے اور اس کے آغاز کا تعین کرنا مشکل ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کیمبرج اکتیس کالجوں پر مشتمل ہے جبکہ آکسفورڈ میں انتالیس کالج ہیں۔“ وہ ہمیں اس کالج میں ہر جگہ لے جاتا ہے سوائے لائبریری کے کیونکہ اُس کا لائبریری کارڈ Expire ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

”اب میں اس میں گھس نہیں سکتا۔“

اب ہم ٹرینیٹی کالج میں ہیں۔ اس میں صرف ایک کورٹ نہیں، بہت سے کورٹ ہیں۔ بلڈنگ بھی بہت بڑی ہے۔ ہم اس کے چیل میں جاتے ہیں، وہ بھی خاصا بڑا ہے۔ ٹرینیٹی ہال کا چیل شاید سب سے چھوٹا ہے۔ ہم اس کے ڈائننگ ہال سے گزرتے ہیں تو کھانے کی بو بہت تیز محسوس ہوتی ہے، مگر یہاں کے لوگ بیٹھے مزے سے کھا رہے ہیں۔ ہم یہاں سے گزر کر رین لائبریری کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں کے ہر کالج کی اپنی لائبریری ہے مگر صرف رین (Wren) لائبریری میں غیر ممبر کو داخلے کی اجازت ہے۔ ہم لائن میں لگ جاتے ہیں۔ اندر سے ایک بندہ نکلتا ہے اور پانچ آدمیوں کو اندر بلاتا ہے۔ کچھ دیر میں وہ پھر باہر آتا ہے، صرف چار آدمیوں کو بلاتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہ مجھے اندر بلاتا ہے۔ ہم چار لوگ ہیں، مگر میرے ساتھی مجھے اندر جانے کا کہتے ہیں۔ میں اندر جاتا ہوں۔ وہاں ایک لڑکی موجود ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ میں یہاں انتظار کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے ساتھی بھی میرے ساتھ اندر جا سکیں۔ میں یہ بات انگریزی میں کرتا ہوں۔ وہ مجھے اُردو میں پوچھتی ہے:

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

میں اسے پاکستان کا بتاتا ہوں تو وہ پھر سوال کرتی ہے: ”آپ پاکستان کے کس شہر سے آئے ہیں۔“ میں بتاتا ہوں کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔ وہ سن کر خوش ہوتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ پروانہ ہے اور کابل سے آئی ہے اور یہاں ڈاکٹریٹ کر رہی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کا موضوع ”ملا جامی کا تصوف“ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیمبرج کے لوگ تصوف کو کیسے سمجھ سکیں گے۔ یہ فلسفہ تو نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ تصوف اور Mysticism میں فرق روا نہیں رکھتے، حالانکہ یہ دو مختلف روایتوں سے پروان چڑھے۔ دونوں بنیادی طور پر مختلف ہیں، بلکہ کہیں کہیں متضاد ہیں۔ وہ مجھ سے اتفاق کرتی ہے اور کہتی ہے: ”کیا آپ پروفیسر ہیں۔“ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں وہ میری مدد چاہتی ہے۔ اب اتنے کم وقت میں میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں اسے مانچسٹر کے علامہ خالد محمود کا پتہ دیتا ہوں۔ وہ مجھے اپنا ای۔میل دے کر کہتی ہے کہ میں اس کی راہنمائی کروں۔

تھوڑی دیر میں ہم لوگ لائبریری میں ہیں۔ لائبریری میں نیوٹن کی کتاب کا پہلا ایڈیشن رکھا ہوا ہے۔ یہاں شیشے کے شوکیسوں میں قدیم کتابیں اور مخطوطے پڑے ہیں۔ انھیں کپڑوں نے ڈھکا ہوا ہے۔ ہم ایک ایک کر کے یہ کتابیں اور یہ مخطوطے دیکھتے ہیں۔

باہر آتے ہوئے میں عملے کے فرد سے پوچھتا ہوں کہ یہاں مخطوطات تک رسائی کا کیا ذریعہ ہے۔ وہ مجھے Wren Digital Library کا ایڈریس دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مخطوطے آن لائن مل جائیں گے۔ میں مشرقی زبانوں کے مخطوطات کا پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے آپ کو پہلے سے اپائمنٹ لینا ہوگی اور یہاں بیٹھ کر انہیں دیکھنا ہوگا۔ مشرقی زبانوں کے مخطوطات آن لائن نہیں ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم اپنے مخطوطوں کو خود آن لائن نہ کر سکتے تو دوسرے انھیں آن لائن کیوں کر کریں گے۔

سوراج ایک جگہ رک جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے، یہ سب کا درخت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس درخت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ درخت اس سب کے درخت کے بیج سے پیدا ہوا ہے جس کے نیچے بیٹھے یہاں نیوٹن نے کشش ثقل کا اصول دریافت کیا تھا۔ میں یہ سن کر حیران ہوتا ہوں۔ سوراج ہنس کر کہتا ہے کہ ایسی باتوں کا ثبوت تو کوئی نہیں ہوتا۔ یہ بس مانٹھا لوجیکل باتیں ہوتی ہیں۔ انھیں لوگ سن کر ویسے ہی مان لیتے ہیں جیسے سالہا سال سے یہ مانا جا رہا ہے کہ گوتم بدھ شہزادے تھے۔ اگر وہ شہزادے ہوتے تو ان کی ریاست، ان کے والد اور خاندان کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی پتا چلتیں۔ مانٹھا لوجیکل باتوں کو بس مانا جاتا ہے۔ ان کی تحقیق کون کرتا ہے۔ چلیں اچھا ہے کہ سب کے درخت نے نیوٹن کو سوچنے کی تحریک تودی کہ وہ کشش ثقل کا اصول دریافت کر سکے۔ اس کے چپیل سے پہلے ایک ہال آتا ہے۔ اس میں بہت سے مجسمے نصب ہیں۔ ان میں سے ایک لارڈ میکالے کا ہے۔ ایک مجسمہ نیوٹن کا ہے اور بعض دوسرے لوگوں کے جو اس کالج میں رہے تھے۔

سوراج بتاتا ہے کہ اس کالج میں میتھ کے لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں چالیس فیصد طلبہ ریاضی پڑھتے ہیں۔ اس کالج پر نیوٹن کا سایہ نظر آتا ہے۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ یہ کالج بہت دولت مند ہے۔ اس کالج کے سابقہ طلبہ اسے بہت ڈونیشن دیتے ہیں۔ اتنے ڈونیشن ملنے کی وجہ سے یہ کالج بہت امیر ہے۔ اس کالج کے طلبہ کو بہت سکا لرشپ ملتے ہیں۔ یہاں سے بڑے بڑے سائنس دان پڑھ کر گئے اور اب وہ اسے ڈونیشنز دیتے ہیں۔ یہ کالج اپنے گریجویٹس کی وجہ سے دولت مند ہے۔ واقعی تعلیمی ادارے اپنے طلبہ کی بدولت ہی ثروت مند ہوتے ہیں۔

(جاری)



سہ رنگہ بارش

لاہور میں اس وقت جھما جھم بارش ہو رہی ہے۔ صبح دفتر کے لیے نکلا تو دیکھا کہ سرمئی بادل ادھر ادھر سے گھٹ جوڑ کر کے جمع ہو رہے ہیں۔ دفتر آ کر بیٹھا تو کچھ دیر بعد سامنے شیشے کی دیوار کے پار میٹالی زمین اور نیلے آسمان کے رنگ گہرے ہونے شروع ہو گئے۔ پھر بوندا باندی نے خشکی کو ڈسنا شروع کیا اور کچھ ہی دیر میں موسلا دھار بارش نے ہر طرف بے رنگ پانی کے رنگ بچھا دیئے۔ شہر بھر میں بارش نے اے سی بند کروا دیئے، پنکھوں کی ہوا ٹھنڈی کر دی اور تنگ اور پتلی گلیوں سے لے کر کشادہ سڑکوں اور صاف ستھرے محلوں تک ہر طرف پانی کے پھول کھلا دیئے۔ ایسے پھول جو آسمان سے برستے ہیں۔ زمین پر گرتے ہیں تو ایک فوارہ سا بلند ہوتا ہے۔ پانی کے اس پھول کی عمر صرف ایک لمحہ ہے، اس کے بعد پھول کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ لیکن پھول ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے اور چھوٹے بڑے فوارے ہیں کہ پھوٹنے بند نہیں ہوتے۔

آسمان، زمین، سمندر، دریا، پہاڑ، ہوا، بارش۔ خوب صورتی کی یہ سات پریاں اس سیارے پر خدا کے تحفے ہیں۔ ایک سے ایک متنوع اداؤں والی پریاں۔ لیکن یہی پریاں غضبناک اور ناراض ہو جائیں تو ان سے کہیں پناہ بھی نہیں۔ انسان کے ہاتھ جڑوا دیتی ہیں۔ لیکن اس وقت تو بات بارش کی خوب صورتی کی ہو رہی ہے۔ ان علاقوں کی بات الگ جہاں مسلسل بارش دق کر دیتی ہے یا تباہی مچا دیتی ہے لیکن عام طور پر مجھ جیسے گرم خطوں کے رہنے والے کا جی بارش سے بھرتا ہی نہیں۔ ہمیشہ سے بارش مجھے شاعری کی بہترین علامت لگتی ہے اور اسی لیے میں نے اپنے دوسرے شعری مجموعے کا نام ”بارش“ رکھا تھا۔ کبھی سوچیں کہ شاعری اور بارش دونوں میں کتنی مماثلتیں ہیں۔ دونوں پر اپنا اختیار نہیں۔ دونوں اوپر سے نازل ہوتی ہیں۔ دونوں کا پیہ نہیں کہ کئی دن یا ہفتوں کی جھڑی لگے گی یا چند گھنٹوں میں مطلع صاف ہو جائے گا۔ دونوں کھارے پانی سے اٹھتی ہیں اور اسے خالص، شفاف اور میٹھا بنا دیتی ہیں۔ یہ قدرتی تحفے رک جائیں تو چہرے اور پتے مرجھا جاتے ہیں اور زمین میں تشنگی کی گہری دراڑیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ دونوں کو کتنی ہی بار اور کتنے ہی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ دونوں کی خوب صورتی بیان نہیں کی جاسکتی۔

بارش کی خوب صورتی؟ کوئی ایسی ویسی خوب صورتی؟ ہر علاقے، ہر موسم، ہر شہر میں الگ الگ خوب صورتی۔ دھان کی اٹھتی فصلوں سے بھرے ہرے میدانوں میں دور دور تک برستی، ہوا کے جھونکوں میں بل کھاتی لہریے دار بارش۔ میدانوں کے ٹوبوں، جو ہڑوں، تالابوں کو بھرتی بارش۔ خنک پہاڑی قصبوں میں آس پاس پھرتے بادلوں سے رس پکاتی بارش۔ تپتے صحرا میں جلتی باؤں میں جذب ہوتی ہوئی بارش۔ سمندروں، دریاؤں اور جھیلوں کے جھلمل پانیوں پر برستی ترچھی بارش۔ آتش دان میں اٹھتے شعلوں کے درمیان سامنے گرتی ہلکورے لیتی بارش۔ درپچوں اور شیشوں کو نم کرتی اور کھڑکیوں سے غروں کے اندر جھانکتی بارش۔ بارش کے ہزاروں رنگ ہیں اور ہر رنگ دوسرے سے مماثل بھی ہے اور مختلف بھی۔ یوں تو عمر بھر میں سیکڑوں بار بارش دیکھی ہوگی لیکن اس کے تین رنگ اور تین

منظر بھولتے ہی نہیں۔ اور شاید بھولیں گے بھی نہیں۔

ہم دو پہر سے کچھ پہلے ”بڑاسی“ کے ریٹ ہاؤس پہنچے۔ بڑاسی مانسہرہ اور بالا کوٹ کے درمیان ایک خوب صورت اور سبز پہاڑی جنگل ہے۔ لمبے دیودار اور چیڑ کے درختوں سے بھرا ہوا جنگل اور درختوں کے درمیان سے بل کھاتی سرمئی سڑک۔ ریٹ ہاؤس کے چوکیدار عرفان بابا نے گرم چائے بنائی اور سامنے فلک بوس برف پوش پہاڑ ”موسیٰ کا مصلیٰ“ کی وجہ تسمیہ اور گھڑی گھرائی داستان ایک بار پھر سنائی۔ چائے پیے گھنٹہ بھر نہ گزرا تھا کہ برف پوش پہاڑ کی چمک ماند پڑنے لگی۔ سامنے پہاڑوں کے پیچھے سے سیاہ بادل اٹھے اور سر پر سیاہ سائبان تان دیا۔ پہلے موٹی موٹی بوندیں گریں اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ گہرے سبز پہاڑ کے پس منظر میں چاندی جیسی بارش کا تار چوٹی سے نظر آنا شروع ہوتا تو ایڑی تک جاتا دکھائی دیتا۔ ایک مکمل آہستہ روی کے ساتھ۔ جیسے کسی نے بارش کو سلوموشن میں کر دیا ہو۔ ایک گھائل رفتار سے گرتی بارش زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی اور آنکھیں جھپکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ منظر جودل پر نغمہ ہو گیا تھا، میں نے ایک نظم میں اس طرح سیال کیا۔

گہرے سبز کے پس منظر میں چاندی کے یہ تار
بوندوں کی یہ نرم خرامی، یہ گھائل رفتار
بارش کا یہ ترچھا پردہ، یہ آڑی دیوار
وادئ سے اور جسم سے اٹھتی مٹی کی مہکار
چیڑ کے لمبے اونچے بالے، سبز قبا کہسار
جنگل کے ہر پیڑ سے اُڑتی آوازوں کی ڈار
بولتے چشمے، گرتے نالے، بل کھاتا کنہار
اس بے پایاں حسن کے آگے مہربہ لب اظہار

ایک اور منظر ”پیر چناسی“ کشمیر کا ہے۔ مظفر آباد پر سایہ فگن 9500 فٹ اونچے پیر چناسی پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک خوب صورت ریٹ ہاؤس بنا ہوا ہے۔ کمروں کی عقبی بالکنی میں کھڑے ہوں تو بہت نیچے، ہزاروں فٹ نیچے، مظفر آباد کا شہر پھیلا ہوا ہے۔ اس روز دن اور رات کے ملاپ کے وقت بھی دریائے نیلم اور دریائے جہلم کا سنگم واضح اور صاف تھا۔ کچھ ہی دیر میں مغرب کے بعد شہر میں ایک ایک کر کے چراغ روشن ہونے شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے منظر جھلمل روشنیوں سے بھر گیا۔ اس بلندی سے یہ منظر ایک طلسمی منظر جیسا تھا لیکن اس کے جادو میں ابھی اضافہ باقی تھا۔ ذرا دیر بعد ”مکڑا“ پہاڑ کے پیچھے سے سیہ گھٹا اٹھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوا تیز ہونے لگی اور بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر منڈلانے لگے۔ ہواؤں کی پھنکار میں اضافہ ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہوا کہ ہم بادوباراں کے ایک طوفان کی زد میں ہیں۔ کچھ ہی دیر میں بادل سر پر چھا چکے تھے اور کمروں میں بھی اب ہم ہی نہیں بادل بھی مقیم تھے۔

پیر چناسی کی بلندی پر اگر ہم اس وقت یہ دعویٰ کرتے کہ ہمارے قدم بادلوں پر ہیں تو غلط نہ ہوتا۔ ایسے میں بالکنی میں کبھی کبھار ساتھ والے کا چہرہ دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن اصل ڈرانے والی چیز بجلی کی مسلسل چمک اور بادلوں کی کڑک تھی۔ یہ خوفناک آواز اور دھاری دار برچھیوں جیسی بارش کی بوچھاڑ ہمیں بہت پہلے بالکنی سے ہٹا چکی ہوتی لیکن جو منظر ہماری آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ ناقابل فراموش تھا۔ بارش اپنی پوری تیزی کے ساتھ نیچے جاتی دور تک دکھائی دیتی۔ بادلوں کے کٹے پھٹے ٹکڑوں کے درمیان سے نیچے شہر کی گیلی روشنیاں دکھائی دیتیں اور بارش کی آڑی ترچھی نفرتی ڈوریاں ان روشنیوں کو رنگ برنگ کرتی جاتیں۔ آج تک زمین پر کھڑے ہو کر بارش کو اپنے اوپر اترتے دیکھا تھا لیکن بادلوں کی اونچائی سے بارش کو جھمکتی فضا میں نیچے بستیوں پر گرتے دیکھنا الگ طرح کا نظارہ تھا۔ بجلی کی چکا چوند اس منظر کو اور خوبناک بنا رہی تھی۔ اس طرح کہ تمام تر ڈر اور خوف کے باوجود جیسے پاؤں کسی نے جکڑ لیے تھے اور پلکیں صرف بارش کی بوندیں جھٹکنے کے لیے چھپکی جاتی تھیں۔ یہ طلسم چند گھنٹوں تک رہا، بادل غائب ہوئے اور منظر مزید شفاف ہو گیا۔ لیکن ان چند طلسمی گھنٹوں نے آج تک اپنے جادوئی اثر میں رکھا ہوا ہے۔

بارش کے اس سلائیڈ شو میں تیسری تصویر کوہ لارن کی ہے۔ سیام یعنی تھائی لینڈ کے ساحلی شہر پتایا کے قریب ایک ہرا بھرا جزیرہ کوہ لارن۔ جزیرے پر چھوٹی چھوٹی سبز پہاڑیاں زینہ اتر سفید ریت سے بغل گیر ہو جاتی ہیں اور یہ سفید ریت سودو سوگز آگے جا کر نیلے سمندر کے سینے میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ہم نے یہ زینہ چڑھنے کی ٹھانی۔ تجسس یہ تھا کہ چوٹی سے سمندر اور جزیرے کا منظر کیسا ہوتا ہے؟ ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ ایک بڑا سیاہ بادل نظر آیا جسے ہوا جھکولے دیتی ہوئی جزیرے کی طرف لارہی تھی۔ پہلے بجزی سی پڑنی شروع ہوئی۔ یہ بجزی موٹی بوندوں میں تبدیل ہوئی اور پھر تیز بارش کے تریڑوں نے ان کی جگہ لے لی۔ چھپنے کی نہ کوئی جگہ تھی اور نہ چھپنے کی خواہش۔ لیکن اب چکنی مٹی والی پہاڑی پر چوٹی تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جہاں کھڑے تھے وہیں شرابور کھڑے رہ گئے۔ لیکن اس منظر کی انفرادیت وہ مرغولے دار بارش تھی جو آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہوا کا ایک کھلنڈ راجھونکا بادل کے ایک ٹکڑے کو چکر دیتا کبھی دور اور کبھی قریب لے آتا۔ دور ہو جانے پر بارش محض دھواں اور قریب آ جانے پر دھواں دار۔ ریت کے بگولے بہت دیکھے تھے لیکن بادل کا ایسا بگولا کبھی نہ دیکھا تھا۔ جانے اس گھونگر یا لے بادل نے ہمیں کتنی بار چھیڑا، اب یاد نہیں۔ یاد ہیں تو گالوں پر بہتی بوندیں جو پتہ نہیں آنسو تھے کہ بارش۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔

ہر خوب صورتی میں ایک اداسی چھپی ہوتی ہے۔ بارش بھی ایک خوب صورتی ہے۔ اس کا خیر مقدم کیجیے۔ اس اداس خوب صورتی کو دل اور آنکھوں میں جگہ دیجیے کہ یہی ان کے اصل ٹھکانے ہیں۔ گالوں پر بوندوں کو بہنے دیں۔ یہ بات چھوڑیں کہ یہ آنسو ہیں کہ بارش۔



بابا سردارا

لمباقد، اچھا مضبوط ہڈ کا ٹھ، جسم نہ دبلا نہ موٹا، رنگ ایسا کالا کہ افریقا والے بھی پلکیں جھپکنا بھول جائیں، سر پر گنے چنے اور بھنوں اور داڑھی مونچھوں کے گھنے بال اور سب کے سب روئی کی طرح سفید، نفاست سے ترشی ہوئی ہلکی داڑھی جسے مطلوبہ معیار تک لانے میں ہر ہفتہ دس دن بعد بے چارے دو سے، صالحوں یا محمد نائی کو پل صراط پر سے گزرنا پڑتا تھا، بگلوں سے بھی زیادہ سفید سوتی لباس جس پر مجال ہے کوئی سلوٹ ہو، مانع لگی سفید سوتی گنبدی دستار اور متوسط سا طرہ، کبھی کبھی نیلا سوتی تہ بند اور باندھنے والا کم آمیز شخص اس پر ہزار جان سے خرم و خرسند، مزاج و گفتار میں ملائمت تقریباً مفقود، اچھے صاف ستھرے خوش مزہ کھانوں کی مناسب سی مقدار ہمہ وقت مطلوب و مقصود، نفیس نسل کی ہلکی خوشبودار نسوار اور لب سوز قسم کی گروالی تیز دودھ پتی کی لت، روئے زمین پر نہ اپنی کوئی زمین نہ دیواریں نہ چھت، نہ کوئی جھوٹا سچا رشتہ دار، نہ کوئی دشمن نہ یار غار، یہ تھا.... بابا سردار۔

میں نے جب اسے دیکھا تو وہ ساٹھ کے پیٹے میں تو ضرور رہا ہوگا۔ تقریباً دس بارہ برس میں اسے کم و بیش اسی وضع قطع میں دیکھتا رہا۔ بڑھاپے میں اس کا یہ حال تھا تو جوانی میں اس کے رنگ ڈھنگ، لباس اور مزاج و اطوار کا کیا عالم رہا ہوگا۔ پھر وہ دیکھتے دیکھتے نحیف ہوتا گیا۔ بیمار رہنے لگا۔ قد میں ہلکا سا خم آ گیا۔ بینائی دھندلا گئی۔ گھٹنے ڈھیلے پڑ گئے۔ خوراک اور لباس میں کوئی ترجیح نہ رہی۔ نسوار چٹھی اور چائے بھی کم گو تو پہلے ہی تھا، اب اشاروں کنایوں کی ہمت بھی نہ رہی۔ یہاں تک کہ وہ وفات پا گیا اور میرے گاؤں معظم آباد، سرگودھا ہی کے قبرستان میں دفن ہوا۔ اس کی میت لے جائی بھی کہاں جاتی؟ وہیں چند دن اس کی فاتحہ خوانی رہی اور اب تو شاید وہ کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا، اگرچہ ابھی بہت سے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اُسے بہت قریب سے دیکھ رکھا ہے۔

جس زمانے میں میں نے اسے دیکھا، وہ دادا جان کے گھوڑے تانگے کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ زیادہ تر تو ایک ہی گھوڑا ہوا کرتا تھا، کبھی کبھی دو۔ اتھرے گھوڑے اس کے سامنے رام رہتے۔ اُس کی تحویل میں موجود ہر گھوڑا اُس کی زبان بھی سمجھتا اور اشارے بھی۔ ایک بار دادا جان نے خوش طبعی سے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ گھوڑوں اور سردار کی مادری زبان ایک ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسے یہ بات کچھ ناگوار گزری اور اس نے کہا: آپ کی جو مرضی، کہتے رہیے! میرے محدود مشاہدے کے مطابق کرۂ ارض پر اگر کسی ذی روح کے ساتھ اس کا کوئی خاص تعلق خاطر ثابت ہے تو وہ دادا جان کے گھوڑے ہی تھے جنہیں وہ اولاد کی طرح لاڈ پیار سے رکھتا مگر وہ بھی ایک آن اور وقار کے ساتھ۔ وہ اولاد کو ضرورت سے زیادہ سر پر چڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ گھوڑے کا چارہ پانی مصالحہ، صفائی ستھرائی، مالش اور تیاری، زین اور ساز کی دیکھ بھال اور تانگے کی صفائی سب اسی کے ذمے تھی اور عام طور پر اسے اس کی ذمہ داری یاد کروانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ درانتی، ٹوکا، کھرپا، کھرپا اور پھاؤڑا گویا اس کی زرخیر عالتھے اور سب کے سب سچے تابع فرمان۔

بابا سردار مجھے اچھا لگتا تھا کہ سال میں دو تین بار ہمیں انھیال کے گاؤں لے جایا کرتا تھا۔ جہاں پڑھائی کی پوچھ پاچھ بھی نہیں ہوتی تھی اور مزے کا سوہن حلوہ بھی بہت ملتا تھا۔ پھر جب وہ گھوڑے تانگے سمیت میرے والد کے سپرد ہوا اور انھیں روزانہ بھلوال لانے لے جانے لگا تو چند بار میں بھی سکول سے چھٹی لے کر ساتھ گیا تھا۔ ایسے ہی ایک سفر میں، نہر کی پٹری پر جاتے ہوئے میرے والد مرحوم نے اسے کہا کہ وہ مجھے بھی شاگردی میں لے لے۔ غالباً تانگا چلانا میرے والد نے بھی اُسی سے سیکھا تھا۔ بابا سردار نے بڑے اہتمام سے مجھے باگیں پکڑوائیں اور اپنی نگرانی میں کچھ دور تک مجھ سے تانگا چلو کر میری اور میرے والد کی خواہش پوری کی۔ درمیان میں کبھی کبھی وہ باگوں پر اپنا ہاتھ بھی رکھ لیتا کہ نوآموز شاگرد سے ان جانے میں کوئی خطرناک غلطی نہ ہو جائے۔ میرے والد اچھی مشرقی روایتوں کا ہمیشہ بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ انھوں نے خوشی کے اس موقع پر استاد کو کچھ معقول رقم کا نذرانہ بھی پیش کیا جس سے گویا میری شاگردی پر حضرت قائد اعظم اور جناب استاد کی باضابطہ مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ بعد میں کئی بار میں نے اس کی نگرانی میں اور پھر آزادانہ تانگا چلایا۔ اسی لیے میں آج تک اسے اپنے اساتذہ میں گنتا ہوں۔ آج بھی میں جب کوئی تانگا یا گھوڑا دیکھتا ہوں تو مجھے بے ساختہ وہ یاد آ جاتا ہے اور وہ لمحہ، جب اس نے مجھے باگیں پکڑائی تھیں۔ اب اگر وہ زندہ ہوتا تو میں لاہور میں گھوڑا تانگا ضرور رکھتا، جیسے بھی ممکن ہوتا۔

وہ سردار ماجھی بھی کہلاتا تھا۔ اس کا نام بھی فرضی تھا اور پیشہ بھی۔ اس نے انھی مفروضہ حقیقتوں کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میری دادی جان بتاتی تھیں کہ وہ دو تین سال کا تھا کہ ایک سنسان بیابانی راستے میں ان کے والد کے گھوڑے کی زد میں آتے آتے بچا۔ نیک دل سوار پریشان ہو کر گھوڑے سے اترا اور مزید پریشان ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ رو رو کر تھک جانے والا ایک معصوم سا مفلوک الحال بچہ ہے جس کے بدن پر کچھ جھٹیرے لٹک رہے ہیں اور چاروں طرف حد نظر تک نہ کوئی شخص موجود ہے نہ کوئی نشانی۔ انھوں نے بچے سے اس کے والدین اور گھر بار کا اتنا پتا معلوم کرنے کی بہتری کوشش کی مگر بچہ کچھ بھی نہ بتا سمجھا سکا۔ وہ صرف کچھ دیر تھیلی پر تھیلی مارتے ہوئے ہاتھوں کو یوں بلاتا رہا جیسے روٹیاں لگاتے وقت ہوتا ہے۔ پنجاب میں تو رتا اپنے اور روٹیاں لگانے کا کام ماجھیوں کے ذمے تھا، سو انھوں نے بھی فرض کر لیا کہ بچے کے ماں باپ ضرور ماجھی ہی ہوں گے۔ اس دن سے ماجھی کا لفظ یوں اس کا لاحقہ بنا کہ مرتے دم تک ساتھ چپکارہا۔ اُس کا نام، سردار بخش انھوں نے خود ہی تجویز کر لیا۔ نبانے ماں باپ نے اُس کا نام کیا رکھا ہوگا۔ پھر وہ بچے کو آگے بٹھا کر گھرالائے۔ انھوں نے تقارچوں کی مدد سے گرد و نواح کی آبادیوں میں بہت اعلانات کروائے، جاننے والوں کے ذریعے مظلوم بچے کے ماں باپ کی تلاش کے کافی جتن کیے لیکن بچے کے مقدرمیں سردار بخش ماجھی بن کر رہنا ہی لکھا ہوا تھا۔

وہ وہیں پلا بڑھا۔ وہ کام چور نہیں تھا بس ہلکی پھلکی من مانی کا عادی تھا۔ جب میری دادی جان کی شادی ہوئی تو اسے بھی ان کے ساتھ ہی بھیج دیا گیا۔ گویا وہ بھی جہیز میں شامل تھا۔ دادی جان پرانی وضع دار گھریلو خواتین کی طرح اپنے جہیز سے بہت جذباتی لگاؤ رکھتی تھیں جو ان کے صوفی منش عالم دین باپ نے اپنے طیب و طاہر رزق سے اپنی بیٹی کو دیا تھا اور سردار بخش بھی اسی کا حصہ رگنا جاتا

تھا۔ وہ غائبانہ طور پر اس کی بھی بہت خاطر داری کرتیں۔ غائبانہ اس لیے کہ ان کا میکا بھی سخت پردے کا پابند تھا اور سسرال بھی۔ دادا جان بھی اسی رعایت سے، قدرے کم ہی سہی مگر سردار بخش کی کافی ناز برداری کرتے اور اُس کی کافی باتوں سے صرفِ نظر کر جاتے۔ دادی جان ہمیشہ احترام سے اس کا پورا نام لیتیں اور کبھی کبھی اس کے لیے بھائی کا لفظ بھی استعمال کرتیں۔ بہ ظاہر یہ لگتا تھا کہ سردارے کو اپنی شناخت کا کوئی المیہ درپیش نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور مردوزن نے کبھی ایسے کسی اندوہ کا اظہار کیا تھا مگر دادی جان کی سگی بہن جو میری نانی تھیں، انھیں رہ رہ کر یہ دکھستاتا۔ آخر سردار ان کا بھی تو بھائی تھا۔ اگرچہ انھوں نے بھی اپنے اس بھائی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نانی جان نے کئی بار اپنے بیٹوں اور مجھ سے کہا کہ سردار بخش مسکین بھی اپنے ماں باپ کو سوچتا تو ہوگا۔ اس کا دل بھی تو چاہتا ہوگا کہ کوئی اسے اس کے باپ کے نام کے ساتھ پکارے۔ پھر وہ بڑی حسرت سے کہتیں: تم لوگ کبھی کبھی ایسے ہی باتوں باتوں میں اسے سردار بخش ولد خدا بخش کہہ کے بلایا کرو، اس کی روح نہال ہو جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم نانی جان کی یہ معصوم سی خواہش کبھی کسی نے پوری کی یا نہیں، کم از کم میں تو کبھی ایسا نہیں کر پایا۔

بابا سردار کا انتقال میرے دادا کے چھوٹے بھائی کے ہاں ۳۰۔ شوال ۱۴۰۰ھ/ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۸۰ء، جمعرات کو ہوا۔ اس کی تدفین کے دوران جب سب لوگ اس کی ڈھیری پر تین تین مٹھیاں تازہ مٹی رکھ رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ اس بے نام و نشان روح کو شاید آج اپنی کھوئی ہوئی شناخت مل جائے۔ شاید آج اُسے اپنے اصلی نام اور ماں باپ کے نام کے ساتھ پُکارا جائے۔ پھر میرے دل و دماغ پر گہرا طمینان اُترا کہ اللہ کریم اپنے اس مشکل سے بندے کے ساتھ یقیناً آسانی کا معاملہ ہی فرمائے گا کہ قبر میں اُس کی پہلی رات بہت برکت و بشارت والی رات تھی۔



میرے آپاجی

میں جب یہ کہتا ہوں کہ میرے آپاجی، میری دوسری ماں تھے تو مجھے ایک روحانی خوشی اور قلبی سکون محسوس ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی مقبول دعا مانگ کر آمین کہ رہا ہوں، جیسے قدرتِ خداوندی، میری سعادت مندی پر خوش ہو کر مجھے شاباش دے رہی ہے۔ جیسے زندگی میرے اس اعتراف پر مجھے مبارک باد پیش کر رہی ہے۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ وہ میرے بڑے بھائی حکیم محمد صادق کے ساتھ بیاہ کر کب اس گھر میں لائے گئے، اس سلسلے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جب ہوش سنبھالا، بلکہ اس سے پہلے جب میں نے آنکھ کھولی تو میں نے انہیں اپنے اماں جی کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں موجود دیکھا۔ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ اُن کا پہلا بیٹا ممتاز ایک ماہ کا ہو کر فوت ہو گیا تھا اور جس وقت وہ اُن کے سامنے پڑا تھا، وہ اسے دیکھ کر رو رہے تھے تو میں انہیں روتا دیکھ کر چیختا تھا اور ان کے ادھر ادھر گر پڑتا تھا۔ اس حالت میں وہ ممتاز کو دیکھ کر روتے بھی تھے اور مجھے دلا سہ دیتے چپ بھی کراتے تھے۔

مجھے لگتا ہے وہ جب اس گھر میں آئے ہوں گے تو اُن کی عمر کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔ انہیں ادھر آتے ہی میری شکل میں ایک کھلونا مل گیا ہوگا۔ وہ اُس کھلونے کو نہلاتے دھلاتے ہوں گے۔ اُسے کپڑے بدل بدل دیکھتے ہوں گے۔ اُس کے بالوں میں تیل لگاتے ہوں گے، اُس کی مانگ نکالتے ہوں گے اور اُسے ہر پل میلا ہونے سے بچائے رکھتے ہوں گے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُن کے بیٹے ممتاز کی وفات کے بعد انہیں ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا اور میں ہر وقت اُن کے سر ہانے بیٹھا اُن کا پتا سر سہلانا رہتا تھا۔ اُن دنوں ٹائی فائیڈ ایک مہلک مرض ہوتا تھا۔ اگر کوئی مریض خوش قسمتی سے اس کے حملے سے بچ رہتا تو جاتے جاتے وہ اُس پر اپنے کچھ اثرات ضرور چھوڑ جاتا۔ آپاجی بھی ٹھیک تو ہو گئے لیکن اُن کے پاؤں کے اوپر انگلیوں کی رگوں کو وہ اس طرح متاثر کر گیا کہ وہ ہر وقت ان کے پاؤں کے اوپر تنی نمایاں نظر آتی رہتیں اور وہ اُن تنی رگوں کے باعث زمین پر چلتے وقت کافی دقت محسوس کرتے رہتے۔ ایسے میں مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب کبھی وہ بیٹھے ہوتے تو میں اُن کے پاس بیٹھ کر اُن رگوں کو ایک، دو، تین۔۔۔ گنتا رہتا اور اُن تنی ہوئی رسیوں کے ساتھ دیر تک کھیلتا رہتا۔

کیا برکتوں بھرا زمانہ تھا! وہ مجھے ہر پل ماں جیسی نگہداشت اور محبت کی خوشبو سے نوازتے اور میں بیٹے کی طرح اُن کے پاؤں پر سر رکھے سویا رہتا۔ پھر اللہ پاک نے جب انہیں محمود کی صورت میں اور بیٹا عطا کیا تو میرے ساتھ اُن کا پیارا اور بڑھ گیا۔ میری اور محمود کی عمر میں کوئی دس سال کا فرق تھا۔ اب محمود کی صورت میں مجھے اپنا بھولی مل گیا تھا۔ میں جتنا اس بھولی کے ساتھ پیار کرتا، کھیلتا، آپاجی مجھے اتنی ہی زیادہ اور توجہ سے نوازتے۔ وہ اپنی محبت کا ہم دونوں کو برابر کا حصہ دار سمجھتے۔

قدرت نے اُن کی طبیعت میں وفا کے علاوہ کچھ اور رکھا ہی نہ تھا۔ انھوں نے اس گھر میں بہو بن کر نہیں، بیٹی بن کر زندگی گزاری۔ انھوں نے گھر کا سارا نظام چلانا از خود اپنی ذمہ داری سمجھ رکھا تھا۔ کھانے کھلانے، دھونے دھلانے اور جاگنے جگانے تک کے سب کام خود انجام دینا، میرے آپا جی اپنا فرض جانتے۔ سب کے بعد کھانا کھاتے، سب سے پہلے جاگتے اور سب کے سو جانے کے بعد اپنے بستر پر جاتے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا، انھوں نے تقاضا کر کے کبھی کوئی نیا کپڑا لیا ہو یا کبھی کسی فرمائش کے پورا نہ ہونے کی شکایت کی ہو۔ میں نے انھیں زندگی بھر کوئی زیور پہنے دیکھا نہ اس نوع کی کسی چیز کی خواہش کا اظہار کرتے دیکھا۔ وہ شکل و صورت میں کسی سے کم نہ تھے لیکن کسی فیشن کا تصور بھی اُن کے قریب سے نہ گزرتا۔ اُن کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ اُن کا بیٹا محمود بعد میں جب کرنل بھی بن گیا اور قدرت نے انھیں بھرپور آسائشوں والی زندگی عطا کر دی، اُس وقت بھی وہ، سادگی کے پیکر، زیب و زینت کی ہر خواہش سے بے نیاز نظر آئے۔

میرے اماں جی ذرا سخت طبیعت کے تھے۔ وہ میری کسی غلطی پر مجھے سرزنش کرتے تو آپا جی پریشان ہو جاتے۔ ایک دو دفعہ جب دیکھا کہ میرا سزا سے بچ جانا مشکل ہو گیا ہے تو میرے آڑے آگئے اور ایک دفعہ تو یہاں تک کر گئے ”نہیں، بے بے نہیں۔“ وہ میرے اماں جی کو بے بے کہہ کر بلاتے۔ اس سلسلے میں میرے اماں جی تو اماں جی تھے، میرے لالہ جی (میرے بھائی) کو مجھ سے خفا ہوتے دیکھ کر اُن سے ناراض ہو جاتے۔

میں ابھی سکول پڑھتا تھا کہ میرے بھائی جان اور میرے آپا جی نے علاحدہ گھر لے لیا۔ اللہ پاک نے انھیں پھر چار بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں۔ میرے لالہ جی ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ اس چھوٹی سی دکان پر ہی اس سارے گھرانے کی گزر بسر تھی۔ اس دوران یہ لوگ جس قناعت سے زندگی گزارتے تھے، میں اُس کا تصور کر کے آج حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ میرے بھائی جان بھی بڑے متوکل انسان تھے لیکن میرے آپا جی نے ایک لمبے عرصے تک جس صبر و تحمل سے کام لیا، اُس کی مثال نہیں ملتی۔ خواتین ایسے حالات میں عموماً قسمت کا رونا روتے نہیں تھکتیں، لیکن میرے آپا جی نے لفظ شکایت زبان پر لانا تو درکنار، ماتھے پر بھی شکن تک نہ آنے دی۔ اور پھر ان بچوں نے بھی جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا، اُس کی نظیر بھی کم کم ملتی ہے۔ وہ اولاد بھی آخر کس ماں کی تھی!

اس دوران میرے ”جی“ (ہم اپنے والد کو صرف جی کہہ کر بلاتے تھے) دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور ہم ماں بیٹا اکیلے رہ گئے۔ کچھ عرصہ تو ہم نے مشکلات میں گزارا لیکن پھر اللہ کا کرم ہوا اور میں ایک ہائی سکول میں اُن ٹرینڈ ٹیچر بھرتی ہو گیا۔ اب ہم ماں بیٹا مطمئن زندگی گزارنے لگے۔ اُن دنوں بھی میرے آپا جی نے میرے لیے اپنی توجہ میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میرے اماں جی بعض اوقات دوسرے گاؤں، اپنے میکے چلے جاتے اور میں اکیلا رہ جاتا۔ میرے آپا جی کو اُن کا مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر جانا اچھا نہ لگتا اور اُن کے لیے حد درجہ احترام کے باوجود، اس معاملے میں اُن سے اپنی خفگی کا اظہار کیے بغیر نہ رہتے۔

ایک دفعہ میں اکیلا تھا۔ مجھے اچانک تیز بخار نے آلیا۔ آپا جی کو پتہ چلا تو آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ سخت سردی سے

میں ٹھہر کر کانپ رہا تھا۔ میرا زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ پسینے سے بھگ رہا تھا۔ ایسے میں، مجھے یاد ہے، میرے آپا جی میری گردن دوبارہ تھے اور شاید میری حالت بھی ایسی تھی کہ وہ رو رہے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ ”بے بے کو کون سمجھے کہ بیٹا بخار میں تڑپ رہا ہے اور آپ میکے بیٹھی ہیں۔“ مجھے اُن کا وہ رونا آج بھی یاد آتا ہے تو زبان پر اُن کے لیے دعاؤں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ انھوں نے مجھے دیور سمجھ کر نہیں، بھائی سمجھ کر نہیں، بیٹا بنا کر پالا اور بڑا کیا۔ میں اُن کے احسانات اور اُن کی شفقتوں کو کس طرح شمار میں لاسکتا ہوں! انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ تنگ دستی میں، لیکن مثالی صبر اور شکر کے ساتھ بسر کیا۔ اور پھر قدرت نے انھیں صبر اور شکر کا یہ صلہ دیا کہ ان کا بیٹا فوج میں افسر بن گیا۔ اللہ نے اُن کی مشکلیں آسان کر دیں۔ اور انھوں نے پھر میرے لالہ جی، سب بیٹوں اور بیٹیوں کے ہمراہ رپ کا نناٹ کے گھر اور حبیب رپ کا نناٹ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی زیارت کی۔ انھیں ایک بیوی کے روپ میں دیکھتے ہوئے میں آج بھی یہی کہوں گا کہ اگر اللہ مجھے اتنی زندگی اور عطا کر دے تب بھی میں اُن جیسی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کہیں نہ دیکھ سکوں گا۔

کانی عرصہ پہلے کی بات ہے، ٹی وی پر اشفاق احمد کا ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا جو ان میاں بیوی آپس میں جو گفتگو تھے۔ میاں نے اپنی بیوی سے پوچھا، ”سچ بتاؤ، گاؤں میں مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت کوئی جوان ہے؟“ بیوی اپنے میاں کے اس سوال پر خاموش رہی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میاں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ بیوی پھر بھی خاموش رہی۔ میاں نے تیسری دفعہ جب یہی سوال پھر پوچھا تو بیوی نے کہا ”ہاں، ہیں۔ لیکن میں نے جس لمحے تمھیں دیکھا تھا، میں اسی لمحے اندھی ہو گئی تھی۔“

میرے لالہ جی ساری عمر یہ گواہی دیتے مجھ سے کہتے رہے ”تمہارے آپا جی جس دن اس گھر میں آئے، اس دن کے بعد سے ایک رات کے لیے بھی اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئے۔“ حالانکہ اُن کے ماں باپ کے گھر اور ہمارے گھر کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا۔

وہ ہمیشہ دھیمی آواز میں بات کرتے۔ اونچی آواز میں بات کرنا انھیں آتا ہی نہ تھا۔ اُن کی آواز زندگی بھر گھر کی چار دیواری سے باہر نہ گئی۔ میرے آپا جی کا پیکر تھے۔ مائیں کس کس طرح اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی بلائیں لیتی ہیں۔ اُن کے تمام بیٹے اور بیٹیاں میرے سامنے پل کر بڑے ہوئے، میں نے آپا جی کو اُن میں سے کسی ایک کو چوم چوم کر پیار کرتے نہ دیکھا۔ میں اور میری اہلیہ دونوں اُن سے کبھی کبھی مذاق میں کہتے ”آپا جی صرف ایک دفعہ لالہ جی کو نام لے کر بلائیں نا۔ صرف ایک دفعہ کسی بیٹی یا بیٹی کو ہمارے سامنے چوم کر دکھائیں نا۔“ ہماری اس خواہش کے جواب میں وہ ہمیشہ ہنس دیتے اور کہتے ”نہیں، مجھے شرم آتی ہے۔“

میں نے انہیں اُن دنوں بہت پریشان دیکھا جن دنوں محمود، جو اس وقت میجر تھا، پاک فوج کے ایک دستے کے ساتھ کویت، عراق جنگ کے سلسلے میں سعودی عرب گیا ہوا تھا۔ عام حالات میں وہ بہت کم ٹی وی کے سامنے بیٹھتے۔ لیکن اُن دنوں وہ صبح شام باقاعدگی سے خبریں سنا کرتے۔ ان دنوں مجھ سے اکثر کہتے ”سعید، دعا کرو۔ میرا محمود خیریت سے واپس آ جائے۔“ اور پھر یہ کہ کروہ ہر بار کسی کمرے کے اندر چلے جاتے۔

اولاد کے لیے اُن کا پیارا ایک سمندر کی مانند تھا جس کی سطح پر عموماً کوئی اضطراب نظر نہیں آتا لیکن اندر اس کی گہرائیوں میں ہر پل ایک تلاطم برپا رہتا ہے۔

زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسرے لمحوں کی طرح اپنی باری پر آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن اُن کے ہاتھوں بنی الہامی تصویریں کسی پل آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹتیں۔ ایک دفعہ مجھے ہرنیا کی تکلیف ہو گئی۔ میں ہر پل پریشان رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ یہ تکلیف آپریشن کے بغیر دور نہیں ہوگی۔ میں آپریشن سے ڈرتا تھا۔ اور پھر گھر والوں کے مجبور کرنے پر میں نے سول ہسپتال چکوال میں سارے سٹٹ کروا لیے، آپریشن کا دن لے لیا اور بیڈ بھی ریزرو کروا لیا لیکن عین آپریشن کے دن میں نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ آپاجی کو پتہ چلا۔ اُن دنوں اگرچہ اُن میں چلنے کی سکت بھی نہیں تھی پھر بھی چلے آئے اور مجھے ڈانٹ کر کہا ”اٹھو، اور ابھی چلے جاؤ۔ میں بھی تمہارے لالہ جی کو لے کر پہنچ جاتی ہوں۔“

اُن کے الفاظ میں کتنا رعب تھا! میں اُن کے سامنے انکار کی ہمت کہاں سے لاتا! میں نے ”پیر میں جوتا بھی نہ ڈالا“ اور ہسپتال پہنچ گیا۔ اور پھر آپریشن کے بعد جب ہوش میں آیا اور آنکھیں کھولیں تو وہ میرے لالہ جی کے ہمراہ میرے سر ہانے کھڑے تھے۔ کہنے والے کے دل میں خلوص اور ہمدردی کے جذبے کا فرما ہوں تو اُس کے الفاظ کا زور سارا منظر نامہ تبدیل کر دیا کرتا ہے۔ میرے آپاجی چار بہوئیں بیاہ کر گھر لائے، انہیں اپنے ساتھ رکھا، اپنی باری آنے پر ہر ایک کو اپنے گھر والا بنایا، انہیں ماں کا پیار دیا اور پھر دیکھا، ان میں سے ہر ایک زندگی بھر اُن کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہی۔

میں نے بچپن میں اپنے آپاجی کو جس طرح نرم و نازک اور پٹولا سا دیکھا، بوڑھے بھی ہو گئے تب بھی انہیں اسی طرح گلاب کے پھول کی مانند مہکتے دیکھا۔ آخری عمر میں سر کے بالوں کو مہندی لگاتے تو ٹوڑ علی ٹوڑ بن جاتے۔ ان کی طرح کا چوڑا اور چمکتا ماتھا، شاید ہی قدرت نے کسی اور خاتون کو عطا کیا ہوگا۔ گاؤں میں خوشی غمی کے موقع پر جہاں جاتے، میری اہلیہ کو ساتھ لے کر جاتے۔ وہ اسے اپنی چوتھی بیٹی سمجھتے تھے۔ خود بتاتے تھے کہ اکثر خواتین مجھ سے پوچھتی ہیں ”آپ کے ساتھ یہ آپ کی بیٹی ہے؟“

اور پھر میرے لالہ جی ایک عرصہ بیمار رہ کر میرے آپاجی کا ساتھ چھوڑ گئے تو ہر کسی کو نظر آنے لگا کہ یہ اکیلا رہ جانے والا سدا بہار درخت بھی چند دنوں کا مہمان ہے۔ جس دن ہم لالہ جی کو رخصت کر کے گھر آئے تو حیا کے اس پیکر نے سب کے سامنے گھلا کہ دیا ”اب میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں۔“ اور پھر تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ اپنے سر کے سائیں کی پانچٹی میں اس کے

پاؤں پر اپنا سر رکھ کر اور چادرِ خاک اوڑھ کر گہری نیند سو گئے۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ مجھے میری دونوں ماؤں، میرے اماں جی اور میرے آپا جی میں سے کس سے زیادہ پیار ملا تو میں فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہوں۔

ایک اور ضیا.....

دوستو! یہ ۱۹۸۶ء کے اواخر کی بات ہے، کہ میں گاؤں سے شہر کے فاصلے کی گٹھڑی اپنے ناتواں کاندھوں پہ اٹھائے، پڑھ لکھ کے ”باؤ“ بننے والی والدینی اغراض کا چاک رفو کرنے کے لیے کالجوں، باغوں اور باغیوں کے شہر لاہور چلا آیا۔ میرے مزاج اور ماحول کی آب و ہوا میں اس وقت ایم اے اردو سے بڑا خواب دیکھنا پتھر ہو جانے کے مترادف تھا۔۔۔ بی اے کا امتحان مناسب ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد میرے آس پڑوس کے ویدوں، سنیا سیوں نے ورغلا یا کہ پنجاب یونیورسٹی میں اس خواب کی تعبیر بتانے والوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ خاکسار اپنا وہی خواب آنکھوں کی دہلیز پر رکھے کسی مناسب رویا شناس کی تلاش میں کشاں کشاں وہاں جا پہنچا۔ ایم اے اردو کی کلاس میں پہلا دن تھا۔ ہم ابھی انارکلی میں پہلی بار در آئی بھولی مجھ کی طرح ارد گرد کے حالات کا حیرت آمیز جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ اچانک شیرانی ہال کی بغل میں عجب انداز سے رواں، بھیدوں بھرے ایک بوڑھے نے نظر پڑی۔ کمرنجیدہ، رنگ تپیدہ، قدم لغزیدہ، نظر دزدیدہ، ڈاڑھی مونچھے تراشیدہ، تیور جہاں دیدہ، بے نیازی سے کلاس روم کی جانب خرامیدہ۔

”سر سجاد باقر رضوی“ فضا میں کسی نٹ کھٹ طالبہ کی صدا گونجی۔

ان کے پہلو میں ایک گورا چٹائیگ بردار نو جوان، چہرے پہ اچھا سامع ہونے کا اعتماد، نظروں میں کسی گھمبیر تا کی افتاد، محبت کا سبق پہلے دن سے یاد، کاتا ثر دیتے ہوئے ہم رکاب استاد۔۔۔۔۔ دونوں کو پہلو بہ پہلو دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ ایک عقاب سال خوردہ، شاہیں بچے کو پرواز کے آداب بتاتا آ رہا ہے۔ میرے چہرے پہ سوالیہ کی علامت گہری ہوتے دیکھ کے پاس بیٹھے حسن نے سرگوشی کی:

”یہ ضیا ہیں، ہمارے سینئر کلاس فیلو!“ (حاضرین! یاد رہے یہ وہ زمانہ تھا جب ’ضیا‘ ہونا معنی رکھتا تھا۔)
 ”یک نہ شد دوشد“ والی ضرب المثل نے ابھی ہمارے ذہن سے ہونٹوں کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ حسن نے سرگوشی کا
 دوسرا مصرع میرے کان میں انڈیلا۔ ”یہ حضرت شاعر بھی ہیں!“
 ہم اپنے پائے پرانے گاؤں سے فلموں، ڈراموں اور سنی سنائی باتوں کے ذریعے شاعر کی جو ہیئت کذائی اعصاب پہ سوار کر
 کے لائے تھے، وہ کسی درسی قسم کے میگزین میں پڑھی اس نظم جیسی تھی:

کیا حضرت شاعر کا بیاں کیجیے حلیہ
اک ناک تو موجود ہے دو گل ندارد
افلاس کا عالم ہے کہ روٹی نہیں ملتی
روٹی، جو کبھی مل گئی تو دال ندارد
بیوی نے اٹھا کر جو کبھی بیچ دی روٹی
سب رومی و فردوسی و اقبال ندارد

بلکہ ابھی تو بی۔ اے میں پڑھا ہوا مشتاق احمد یوسفی کا بیان کردہ، وہ تصور بھی دماغ میں تازہ تھا، جس میں ایک مصور اپنے شاگرد کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

”یاد رکھو کیونکہ شاعر کو جتنا غلط بنایا جائے اتنا ہی صحیح بنتا ہے۔“

لیکن دوستو! ادھر تو معاملہ ہی بالکل مختلف تھا۔ کیونکہ یہاں تو ایک ترشا ترشایا، خوش خط سا نوجوان، جس کا لباس معقول، اعضا متناسب، ہونٹ نستعلیق، خط نسخ سے لکھوائی ہوئی پیشانی، کوئی آنکھیں، اُجلے رنگ پہ ڈھنگ سے بنایا ہوا شیو، چہرے کی طرف دھیان گیا تو: ع دونوں طرف بھی مونچھ برابر لگی ہوئی یہ شخص تو ہمارے پکے پیڑے تصور کے سامنے کسی طرح شاعر ہونے کو تیار نہیں تھا۔ یقین کیجیے اسے دیکھتے ہی ذہن میں شاعر کا صدیوں سے قائم تصور بھک سے اڑ گیا۔

دوستو! اب ذرا آپ کو پنجاب یونیورسٹی کی بابت بھی کچھ بتاتے چلیں کہ یہ دنیا بھر میں ایک ایسا ادارہ ہے، جہاں لیفٹ رائٹ کی کش مکش ازمنہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ بلکہ شعبہ اردو میں تو کبھی کبھی اس کی شدت رائٹ، رنگ سے بھی زیادہ ہو جاتی رہی ہے۔ ہم نے تو یہاں تک سن رکھا تھا کہ جو طالب علم بروقت دائیں بائیں کا فیصلہ نہیں کر پاتا، بعد میں آئیں بائیں شاخیں ہی کرتا پایا جاتا ہے۔ لیکن گھنی مونچھوں کے درمیان تا بڑ توڑ مسکراتا یہ شاعر تو عجیب مٹی کا بنا تھا، کہ ایک طرف ڈاکٹر تحسین فراقی کی آنکھ کا تار تھا تو دوسری جانب سجاد باقر رضوی کا راج دلار۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ لیفٹ اور رائٹ کے درمیان آج تک جتنی لیفٹ رائٹ اس نوجوان کو کرنا پڑی ہے، اتنی تو شاید دورانِ پریذ فوجی دستوں کو بھی نہیں کرنا پڑتی ہوگی۔

گزشتہ ربع صدی میں ہم اور زمانے نے ان حضرت کی زندگی کے کتنے ہی رنگ، روپ اور رویے ملاحظہ کیے ہیں، جن کو شاعرانہ زبان میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی میں تھے تو عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے بقول:

ع آج ہی ہم نے بدلے ہیں کپڑے آج ہی ہم نہائے ہوئے ہیں

کی عملی تصویر تھے۔ فنی تعلیم میں استاد منتخب ہو کے گئے تو احباب کے بقول انگریزی والے فنی (FUNNY) ہو گئے۔ بھیدی بتاتے ہیں کہ شرافت کے اس پتلے سے ہر پل شرارت کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ جزل ایجوکیشن میں سلیکٹ ہو کے متران والی سدھارے تو تمام ادبی متروں سے کٹ کٹا کے: ع تشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کا عملی نمونہ بن گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد زمانے کی آنکھ نے ایک انوکھا منظر اور دیکھا۔ ہمارے ننانوے فیصد سرکاری ملازمین اور بالخصوص اساتذہ گورنوالہ، شیخوپورہ، قصور، اوکاڑہ وغیرہ سے ساری سماجی و سیاسی توانائیاں برے کارلا کے لاہور کا رخ کرتے ہیں۔ یہ حضرت ساری رسیاں تڑوا کے لاہور سے کڑے کوسوں کے فاصلے پر اپنے آبائی گاؤں مظفر گڑھ میں جا براجے۔ بقول ناصر کاظمی:

ع یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

اس پر دوستوں نے تو یہی سوچ کے صبر کر لیا کہ محبت کی شادی کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ اس دوران یہ حضرت محبت کی شادی کا معرکہ بھی بہ حسن و خوبی سر کر چکے تھے۔ یہ محبت کی شادی بھی کیا عجب شے ہے کہ بندے کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بے نیازی اور بے زاری بھر دیتی ہے۔ ہمارے ایک دوست شاید اسی وجہ سے اس لو میرج کو ”خود خوش حملہ“ قرار دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا تو ویسے ہی عقیدہ تھا کہ شادی کے بعد بڑے سے بڑا جن نماشوہر بھی بیگم کی بوتل میں بند ہو جاتا ہے۔

ابھی اس کیفیت میں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جن ایک دم بوتل سے باہر آ گیا۔ مضافات کے کسی دربار نما کالج میں دھونی رما کے بیٹھا شاعر، کوہسار و بیاباں کو کودتا پھاندتا ایک دم لاہور کے سب سے بڑے اکھاڑے پنجاب یونیورسٹی میں آنمودار ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس گوشہ نشین، شہر بدر، کون و مکان سے کنار اگیر، صحرا نورد، شاعر نے اپنی ہر طرح کی عزلت نشینی پہ لات ماری اور ملک بھر کے رسائل و جرائد اور تقاریب و تراکیب میں چکا چوند کا یہ عالم ہو گیا کہ:

ع میں جیہڑا ورق پھولنی آں اُس ور تے اوہاناں
ڈاکٹر ضیاء الحسن کی ایک خوش قسمتی یا بد قسمتی یہ بھی ہے کہ دونوں میاں بیوی شاعر ہیں۔ حکیم جی فرماتے ہیں کہ ایک اوسط درجے کے گھر پہ تو ایک شاعر بھی بھاری ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس فیملی کو ایک ہی وقت میں دو شاعروں کا صدمہ اٹھانا پڑے، ان کے بچوں اور قریبی اعزہ کو حکومتِ وقت کی جانب سے باقاعدہ ڈسٹر بنس الاؤنس (Disturbance Allowance) جاری ہونا چاہیے۔ لالہ بکل تو یہ خدشہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ جہاں ایک ہی چھت کے نیچے دو شاعر محو استراحت ہوں، ان کے تو خواب میں مصرعے بھی بدل جاتے ہوں گے۔
ہمیں یاد ہے کہ ہماری دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ کسی بھی ملک یا گھر کی سلطنت کو رواں رکھنے کے لیے بادشاہ یا وزیر میں سے کسی ایک کا تھوڑا بہت احمق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ جس گھر میں دونوں میاں بیوی شاعر ہوں، وہاں اکثر مواقع پہ بڑی مزے دار صورت حال ہو جاتی ہوگی۔ مثال کے طور پہ گھر میں پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ”مطلع“ نام رکھ دیا۔ رواروی میں دوسرا آ گیا تو خود بہ خود ”حسن مطلع“ قرار پا گیا۔ ان سے ملتی جلتی شکل والی بیٹی آگئی تو تضمین کے درجے پہ فائز ہو گئی۔ دو چار بچوں کی شکلیں اور مزاج باہم ہوئے تو انھیں قطعہ بند اولاد کا خطاب دے دیا۔ شوہر کسی دعوت سے ہوا آئیں تو بیگم نہایت رعونت سے ارشاد کرتی ہوں گی:
”گھر میں اتنے مزے کا غزل قیام بنا تھا، آپ باہر ہی سے کھا کے آ گئے۔“

دوسری جانب کچن پہ ادبی اثرات کا یہ عالم ہوگا کہ پراٹھا ذرا ٹیڑھا ہو گیا تو اسے آسانی سے لف و نشر غیر مرتب سے موسوم کر دیا۔ بے دھیانی میں ہنڈیا جل جائے تو دالیں و رائے فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرما دیا کہ آج میں نے بڑے کرارے اور کرپسی (Crispy) ’واسوختے‘ ترتیب دیے ہیں۔ ان کی ترکیب ہمارے ہاں میرانیس کے گھرانے سے سینہ بہ سینہ چلی آئی ہے۔ پھر ان کو یہ سہولت تو مستقلاً حاصل ہے کہ کہیں سے ایک بھی باذوق مہمان آ گیا تو بیٹھے بٹھائے بین الخاندانی مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ شاعری کی آمد کا تو یہ عالم ہوگا کہ میاں ایک بار اتوار بازار سے ہوائے تو آتے ہی اس طرح کے شعر کہنے لگے:

عاشقی کے جنگل میں، مہ رُخوں کی وادی میں

سب زیاں ہمارے ہیں، ہنریاں تمھاری ہیں

ہم نے تو سنا ہے کہ کچھ شاعر گھرانوں نے اپنے بچوں کے رونے کے لیے مخصوص ’بحریں‘ مقرر کر رکھی ہیں۔ ان گھروں میں بعض بچے محض اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر پٹتے بھی دیکھے گئے ہیں کہ وہ روتے روتے بحر ہنر مٹھن گریہ سے، بحر رمل متقارب عشوہ میں چلے گئے۔ اپنے لالہ بکل کے بقول ان کے دادا دادی دونوں شاعر تھے۔ آج وہ لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ اردو، پنجابی میں ردیف قافیہ والی ساری رواں گالیاں ان کے دادا کی ایجاد ہیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ محلے کے ساری عورتیں دادی جان سے کوسنوں کی تقطیع کروانے آیا کرتی تھیں۔ دونوں بزرگ کسی کو دعا بھی دیتے تو مصرع وجود میں آ جاتا۔ کہتے ہیں کہ دادا حضور جب تک زندہ رہے، اردو کے صنائع بدائع میں اضافوں پہ اضافے کرتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر سرکاری ملازمت کے دوران انھوں نے حُسنِ تغلیل کی جگہ ہمیشہ حُسنِ تعطیل کو فروغ دیا۔ مجاز مرسل کا تو انھوں نے مستقل نام ہی ’مزاج مرسل‘ رکھ چھوڑا تھا۔ یہ صنعت جو صدیوں محض ’کل بول کر جز مراد لینا‘ نظر بول کر مطروف مراد لینا اور مستقبل بول کر حال مراد لینا، جیسی گھسی جٹی اور بیہوش زدہ اقسام تک محدود تھی، اس میں انھوں نے کئی بالکل اچھوتی اور سدا بہار اقسام کا اضافہ کیا۔ ان کی ایجاد کی ہوئی ایک قسم جس کا وہ اپنی زندگی میں خود بھی بھرپور استعمال کرتے رہے، وہ تھی:
”کچھ اور بول کر کچھ اور مراد لینا۔“

وہ پاکستانی سیاست دانوں کے بیانات اور فلمی اداکاراؤں کے انٹرویوز سے اس کی مثالیں انڈر لائن کر کر کے احباب کو دکھایا کرتے تھے۔ اسی طرح صنعتِ تضاد کے مقابلے میں انھوں نے صنعتِ تعاون ایجاد کر رکھی تھی۔ مولانا فضل الرحمن کے وہ بہت معترف

تھے۔ فرماتے تھے کہ آج تک تمام اردو شعرا ہاتھ دھو کے صنعتِ تضاد کے پیچھے پڑے رہے ہیں، یہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے ہر اچھے برے دور حکومت میں صنعتِ تعاون کو فروغ دیا۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے یہ دوست آج کل پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ اپنے حکیم جی کا ارشاد ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ایک ایسا طلسم کدہ ہے کہ جہاں بچانوں نے فیصد لوگ محض گریڈوں کی وجہ سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ دوستو! اورینٹل کالج تو میری ایسی کمزوری ہے، جس نے مجھے بے شمار قوتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ان میں ایک طاقت تنقید اور حق گوئی کی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کی صورت حال سے اس کے پیاروں کو آگاہ رکھنے کے لیے میرا قلم ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ اس ادارے کی تصویر کشی ذرا رموزِ اوقاف کی زبان میں بیان کر دی جائے۔

یہاں کے لوگ اور روگ مجھے اس حد تک ازبر ہو چکے ہیں کہ میں اس کے ایک گیٹ سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نکل جاؤں تو بتا سکتا ہوں کہ راستے میں کتنے کتنے پڑتے ہیں۔ سوا لیے تو اس عمارت میں آپ کو جا بہ جانظر آئیں گے۔ کسی دن میرا موڈ ہوا تو میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں گا کہ یہاں کتنی بریکٹیں (Bracts) ہیں اور کتنے انورٹڈ قوسے (Inverted Commas)۔ اگر خوفِ فسادِ خلق کا خطرہ نہ ہو تو علمی و ادبی حوالے سے سارے ختمے یعنی فُل سٹاپ (Full Stop) آپ کو ابھی انگلیوں پہ گنوا سکتا ہوں۔ فی الحال آپ کو بتانا چلوں کہ ڈاکٹر ضیا الحسن کا کردار رموزِ اوقاف کی اس فیل میں سائن آف ایکس کلےیشن (Sign of Exclamation) والا ہے۔ طلبہ و طالبات سامنے ہوئے تو ندائیں بن گئے۔ دوست احباب سے بات چلی تو فانیہ کا روپ اختیار کر لیا، اور اگر یونیورسٹی کا کوئی مبہم و متنازع معاملہ ہوا تو سرتاپا استغابیہ کی چادر اوڑھ لی۔

ڈاکٹر ضیا الحسن کی ایک نمایاں حیثیت نقاد کی بھی ہے اور یہ بات تو آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے جامعاتی ماحول نے جس شخص کو ایک بار پال پوس کے نقاد بنادیا، پھر دنیا کی کوئی طاقت نارٹل زندگی کی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ ہماری تنقید کا تو پہلا درس ہی یہ ہے کہ ہر موجود چیز کو شک کی نظر سے دیکھو۔ سامنے آنے والی ہر شے میں کیڑے نکالو، کیڑے نہ بھی ہوں تو پلے سے ڈال دو۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ ملکہ اور فریضہ قدرت نے صرف بیگم، پڑوسی اور نقاد کو تفویض کیا ہے کہ ان سے سرزد ہونے والا ہر جملہ لیکن سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تینوں کردار ہمارے سماج کی ایسی بکریاں ہیں کہ جو تحسین و توقیر کا دودھ تو دیتی ہیں مگر ”لیکنیں“ ڈال کے۔

ذرا اردو ادب کی تنقید یہ نظر ڈال کے دیکھ لیں، اسے شروع ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، لیکن یہاں ایک سے ایک سلطان راہی بھرا بیٹھا ہے۔ کسی کا دل چاہا تو غزل کی ٹانگ توڑ دی۔ کسی کے جی میں آیا تو افسانے کو سینگ مار دیا۔ کوئی غالب کو دیکھ کے مونچھوں کو تاد دے رہا ہے۔ کسی نے اقبال کو طفلِ مکتب ثابت کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے، اور کوئی تو بے ادبی کا سوؤ موٹو لے کر پورے اردو ادب کو کوڑے کے ڈرم میں پھینک کے انصاف کے تقاضے پورے کرنے پر مُصر ہے۔ لیکن ایسے میں جب ہم اپنے اس نقاد پہ نظر کرتے ہیں تو مگر چھوٹے عین بیچ میں بیٹھے دودھ کی سبیل لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا دفتر کسی سیاسی جماعت کا انتخابی دفتر معلوم پڑتا ہے۔ کوئی ادیب آجائے تو مسکراہٹ کا عالمی مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی نقاد صفت دوست ان میاں بیوی کی شاعری کا موازنہ کرنے بیٹھ جائے تو کسی دانا شوہر اور بیٹا نقاد کی مانند فوراً بارمان کے بیوی کا مان رکھ لیتے ہیں۔ بیوی تو پھر بھی بڑی چیز ہوتی ہے، ان کا تو کسی راہ چلتی شاعرہ سے موازنہ کر کے دیکھ لیں، فوراً سر ہٹ کر دیں گے، کیونکہ ایک چینی مصنف کا قول انہیں پوری طرح ازبر ہے کہ: ایک معنی نظم میں اتنی دل کشی نہیں ہوتی جتنی کسی معرئ عورت میں ہو سکتی ہے۔



گیت مالا

(۱)

چھن چھن چھن پائل باجے کھن کھن کنگنا بولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 پون چلے تن ڈمگ ڈولے، من کھائے ہچکولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 من کو پی کا دھیان ستائے جاگ گزاروں رتیاں
 لاج کی ماری کہہ نہ پاؤں پی سے من کی بتیاں
 آنجل میں جو بھید چھپاؤں بیچ بگیا کھولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 چھن چھن چھن پائل باجے کھن کھن کنگنا بولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 ترک ترک من مورا ناچے باجے دور مریا
 چین چرائے نیند اڑائے چھیل چھبلا چھلیا
 بنتی کرتی رہ جاؤں میں من مری سنگ بولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 چھن چھن چھن پائل باجے کھن کھن کنگنا بولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 سکھیاں چھیڑیں پگھٹ پر، میں لاج سے مرمر جاؤں
 پانی پانی آپ ہوئی میں جل کیسے بھر لاؤں
 پی پی بولے من کا پیچھی اڑنے کو پر تولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 چھن چھن چھن پائل باجے کھن کھن کنگنا بولے
 کھن کھن کنگنا بولے
 پون چلے تن ڈمگ ڈولے، من کھائے ہچکولے
 کھن کھن کنگنا بولے

(۲)

تورے نین بڑے چت چور
سجنواسانورے
مت دیکھو موری اور
بلمو ابانورے

موری نیند پہ ڈاکہ ڈارا
سکھ چین جیا کا لوٹا
سب کھیل کھلونے بھولے
سکھیوں سے ناتا ٹوٹا
تو نے باندھی ایسی ڈور
بلمو ابانورے

تورے نین بڑے چت چور
سجنواسانورے
مت دیکھو موری اور
بلمو ابانورے

تورے نین بڑے چت چور
موری کانچ کی چوڑی ٹوٹی
مورا شور مچائے کنگنا
موہے تال پہ سکھیاں چھیڑیں
موہے طعنے مارے انگنا
مورا جی پہ چلے ناں جور
بلمو ابانورے

تورے نین بڑے چت چور
سجنواسانورے
مت دیکھو موری اور
بلمو ابانورے

تورے نین بڑے چت چور
تورے نین بڑے چت چور

(۳)

گھر گھر آئے گھور بدردا ، چھم چھم برکھا برے
برہن ترے

اپنے ساجن سنگ سہیلی ، سچ کر نکلے گھر سے
برہن تر سے

پگھٹ پر جب سکھیاں جائیں
مل کر گیت ملن کے گائیں
سر پر گاگر دھر کر لائیں چھلکے جل گاگر سے
برہن تر سے

تن من میں جب آگ جلے تو
بن ساجن کے شام ڈھلے تو
سر سر سر پون چلے تو ، چُنری سر کے سر سے
برہن تر سے

من موہن کی یاد ستائے
کھاٹ بچھونا کاٹے کھائے
سونے گھر میں نیند نہ آئے کالی رات کے ڈر سے
برہن تر سے

گھر گھر آئے گھور بدروا ، جھم جھم برکھا بر سے
برہن تر سے
اپنے ساجن سنگ سہیلی ، سچ کر نکلے گھر سے
برہن تر سے

(۴)

سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
نکلا بلم ہرجائی
سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
کاسے کہوں ری سکھی
کاسے سہوں یہ رسوائی
سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
موسنگ جھولا پریم کا جھولا
قول وچن سب جلمی بھولا
بھول گیا نرموہی موہے
کرلی بیرن سنگ سگائی
سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی

سبج سجائے راہ نکلوں میں
 ندیا نہ آئے سو نہ سکوں میں
 آون کہہ گیا جلمی موہے
 سوتن دوارے رین بتائی
 سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
 نکلا بلم ہرجائی
 سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
 کاسے کہوں ری سکھی
 کاسے سہوں یہ رسوائی
 سکھی ری مورا نکلا بلم ہرجائی
 (۵)

ڈھل گئے سائے شام نہ آئے
 آس ملن کی ٹوٹ نہ جائے
 ڈھل گئے سائے
 بھور بھنے سے شام ڈھلے تک
 اُٹھ اُٹھ دیکھی راہ تہاری
 گہرے ہو گئے شام کے سائے
 دکھ جیتے دکھیاری ہاری
 نینوا نے نیر بہائے
 آس ملن کی ٹوٹ نہ جائے
 ڈھل گئے سائے
 گھر میں گھور اندھیرا چھایا
 رین پدھاری نیند نہ آئی
 دیپ جلے تو آئے پتنگے
 ارمانوں نے لی انگڑائی
 یاس کے گہرے بادل چھائے
 آس ملن کی ٹوٹ نہ جائے
 ڈھل گئے سائے شام نہ آئے
 آس ملن کی ٹوٹ نہ جائے

امین راحت چغتائی

سیر گریباں

(نو تصنیف خود نوشت کا ایک باب)

اپنی زندگی کی داستان لکھنے بیٹھا ہوں تو بیدل کا یہ مصرع بار بار زبان پر آ رہا ہے کہ ”ہستی مابہر دروغ مصلحت آمیز نیست“۔ ثابت ہوا کہ سچ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ میں نے ۱۹۴۲ء سے یعنی بارہ برس کی عمر سے ڈائری لکھنا شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کا اختصار سے اندراج کرتا رہا۔ جوں جوں مشاہدات و تجربات میں اضافہ ہوتا گیا اور عقل و شعور کے ساتھ ساتھ لکھنے کا حوصلہ بڑھتا گیا توں توں ڈائری کی سطور بھی پھیلتی چلی گئیں اور ۱۹۴۸ء میں ڈائری نے باقاعدہ روزنامے کی شکل اختیار کر لی۔ اس میں نجی تلخیوں سے لے کر سیاسی نشیب و فراز تک سبھی باتوں کے بارے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار ہونے لگا۔ ۱۹۴۸ء ویسے بھی میری زندگی کا انقلاب آفریں سال تھا۔ میری سوچ میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ میرا میلانِ طبع لڑکپن سے ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے سے زیادہ سیکھا۔ گویا ابتدا ہی سے مزاج ”غیر مقلدانہ“ رہا۔ اس زمانے میں بین الاقوامی سطح پر بورژوا سماج اور مزدور تحریکوں کی کشمکش بتدریج شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اور اس کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہونے والی تبدیلیاں ہماری ملکی سیاست اور ادب میں بھی محسوس کی جا رہی تھیں۔ میرے اپنے نظریات میں ایک کشمکش جاری تھی۔ میں دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے عربی زبان، تفسیر اور شرح حدیث کے ابتدائی مدارج طے کر چکا تھا۔ فقہ کی مبادیات پڑچکا تھا اور میری فکری توانائیوں کا رخ ادھر پھیرنے والے تھے میرے عربی کے استاد مولوی محمد اسماعیل جن کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات پر آئے گا۔ شاید یہ مولوی صاحب کے فیضان اور میرے مطالعے کی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب کہ میری عمر سترہ سال گیارہ ماہ تھی اور میں ایف اے، سال دوم کا طالب علم تھا، میں نے ”اسلامی جمہوریت“ کے ایک صحافتی مباحثے میں شریک ہو کر جمہوریت اور اسلام کے موضوع پر مضمون لکھا جو ۲۴- ستمبر ۱۹۴۸ء کے روزنامہ ”زمیندار“ لاہور کے ادارتی صفحے پر چلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان دنوں ادارتی صفحے کے ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر تھے۔ میں نے اس مضمون میں جمہوریت اور اسلام کو دو الگ نظام ہائے زندگی ثابت کیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں ان دنوں فالج کے باعث صاحبِ فراموش تھے۔ اخبار کے نگراں مولانا اختر علی خاں تھے۔ پاکستان میں اس نقطہ نظر سے لکھا جانے والا غالباً یہ پہلا مضمون تھا، جس میں دو مختلف نظام ہائے حیات کو گڈ مڈ کرنے کے سیاسی مضمرات سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مذکورہ مضمون کے جواب میں کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ انھی ایام میں گجرات کے ایک صاحب نے پمفلٹ کی صورت میں مضمون کی طباعت پر پچاس کاپیاں خریدنے کی پیش کش کی تھی۔ ان کا خط جو میری سے لکھا گیا تھا، اب تک میرے پاس موجود ہے۔

گورڈن کالج راولپنڈی میں داخلے کا ایک دلچسپ واقعہ تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ میں فرسٹ ایئر کا امتحان گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے پاس کرنے کے بعد ابا جان کے پاس راولپنڈی چلا آیا تھا۔ تمام ٹیٹلکٹ ساتھ تھے۔ گورڈن کالج میں سینڈ ایئر کے داخلے کے لیے پیش ہوا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آ آر، سٹورٹس اور وائس پرنسپل ڈاکٹر جے بی، کمنگز (J.B Cummngs) نے

انٹرویو لیا۔ ڈاکٹر سٹوئرز (R.R. Stuarts) تو بوٹونی کے بین الاقوامی ماہرین میں شمار ہوتے تھے اور ڈاکٹر کمنگز عیسائی دینیات کے پی ایچ ڈی تھے اور غالباً انگریزی زبان کے کچھ ”مختاط لطیفے“ بھی بے تکلفی سے سنا سکتے تھے۔ ہم نے سیکنڈ ایئر میں انگریزی نثر (Prose) انھی سے پڑھی۔ میرے سرٹیفکیٹس دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر کمنگز کی نظر ناگاہ میرے میٹرک کے سٹوفکیٹ پر جا پڑی، جس کے مطابق میں بقول شخصے، میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لینے سے بال بال بچ گیا تھا یعنی کم نمبروں سے رہ گیا تھا، لیکن ان دنوں یہ مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ ڈاکٹر کمنگز نے ایک اور بات یہ نوٹ کی کہ میں نے میٹرک اور فرسٹ ایئر میں اپنا Elective Subject عربی رکھا ہوا تھا اور اب سیکنڈ ایئر میں عربی کی جگہ فارسی کو "Elective Subject" بنالیا تھا جو موصوف کے مطابق درست نہیں تھا۔ اس طرح مضمون تبدیل کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے پیشگی اجازت لینے کی ضرورت تھی مگر میں مصر تھا کہ مجھے فارسی زبان آتی ہے۔ فارسی کے استاد کی رائے لی لی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر سٹوئرز نے مجھے اپنے داخلے کے فارم اور سرٹیفکیٹس کے ساتھ فارسی کے استاد ٹی ٹوک چند محروم کے پاس بھجوادیا کہ اگر وہ داخلے کے فارم پر فارسی کے حق میں دستخط کر دیں تو پنجاب یونیورسٹی سے بآسانی اجازت مل سکتی ہے۔ دراصل مجھے جب معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں محروم صاحب فارسی کے پروفیسر ہیں تو میں نے محض اُن کی شاگردی کے حصول کی خاطر اپنا مضمون تبدیل کیا تھا اور گھر میں فارسی پڑھی کہ اباجان کو جلال ہمیشہ فارسی میں آتا تھا اور وہ اپنی بیاض میں لمبی نئے بھی اپنے میلان طبع کے مطابق کبھی اردو اور کبھی فارسی میں لکھتے تھے اور کبھی طبع موزوں ہوتی تو نسخوں کے بیچ میں کچھ اشعار بھی موزوں ہو جاتے۔ اباجان باقاعدہ شاعر نہیں تھے لیکن موزوں طبع ضرور تھے اور کبھی کبھی ایسے ہی ”فرصت کے اوقات“ میں شعر کہہ لیتے تھے نیز مجھے فارسی پڑھا دیا کرتے بلکہ گفتگو بھی فارسی ہی میں کر لیتے۔ چنانچہ مجھ میں اب جھجک نہیں رہی تھی اور میں رواں فارسی بول سکتا تھا۔ یوں بھی گھر میں ادبی رسائل ہمایوں (لاہور) مشہور، کہکشاں اور پیشوا (دلی) آتے تھے۔ موخر الذکر دینی رسالہ تھا۔ اس میں حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام بالاقساط چھپتا تھا اور میں نے سب سے پہلے شاہنامہ یہیں پڑھا۔ ”پیشوا“ کا سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا، آپ کسی سال بروقت چندہ بھیجتا بھول جائیں تو بھی رسالہ جاری رہتا تھا اور محروم صاحب کے نام سے تو میں چھوٹی عمر میں ہی واقف ہو چکا تھا۔ ہماری ساتویں جماعت کی اردو کی کتاب مرقع ادب حصہ سوم میں محروم صاحب کی مشہور نظم ”نور جہاں کا مزار“ شامل تھی، جو مجھے زبانی یاد تھی اور جب گورڈن کالج میں داخلے کے لیے پہنچے اور پتا چلا کہ محروم صاحب یہاں فارسی کے پروفیسر ہیں تو میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب فارسی پڑھیں گے۔ چنانچہ مجھے محروم صاحب کے کمرے میں جو لائبریری کے ساتھ تھا، پہنچا دیا گیا۔ میں زندگی میں پہلی بار انھیں دیکھ رہا تھا۔ یوں لگا جیسے آئن سٹائن کے چھوٹے بھائی سامنے کرسی پر بیٹھے ہوں۔ وہی خدو خال، ویسی ہی مونچھیں، ناک اور آنکھوں میں مشابہت، ویسی ہی کشادہ پیشانی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ محروم صاحب تلے دارنو کیلے پنجابی کلاہ پر مشہدی لنگی (گڈری) باندھے ہوئے تھے۔ کریم کلر کا سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ گندمی رنگ، چہرے پر منانیت لیکن شفقت آثار، دراز قد اور پاٹ دار آواز۔ بڑے دھیمے لہجے میں میرا مسئلہ پوچھا۔ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ سر! آپ کا اردو ادب میں اتنا بڑا مقام ہے کہ جی چاہا، آپ کا شاگرد بننے کی سعادت حاصل کی جائے۔ چہرے پر متوقع مسکراہٹ نہیں آئی۔ ارشاد ہوا، ابتدائی فارسی کہاں پڑھی؟ سر! گھر پر۔ مختصر سا جواب تھا۔ پوچھا: فارسی عبارت سمجھ لیتے ہو؟ جواب دیا سر! بول بھی لیتا ہوں۔ فارسی کا کوئی شعر یاد ہے؟ استفسار ہوا۔ میں نے جھٹ پڑھ دیا:

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون مے ریزی
من آں لیل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم
مجھے فوراً احساس ہوا کہ اس میں بالواسطہ اُن پر بھی خفیف سا طنز ہو گیا ہے۔ پہلی بار زیر لب مسکرائے۔ پھر ارشاد ہوا: اس شعر کا مطلب بتائیے:

سحرچوں خسرو خاور علم بر کوہساراں زد
بدستِ رحمتِ یارم در امیدواراں زد

میں نے کہا، سر! یہ تو معلوم نہیں کہ شعر کس کا ہے تاہم مفہوم کچھ یوں ہے کہ ”صبح کے وقت جب سورج پہاڑوں پر طلوع ہوا تو میرے دوست نے رحمت کے ہاتھ سے امیدواروں کے دروازے پر دستک دی“۔ مردم شناس تھے۔ پوچھا، شعر کہتے ہو؟ میں نے کہا، جی سر۔ ایک بار پھر مسکرائے اور چپکے سے میرے داخلہ فارم پر دستخط کر دیئے۔ جس کی بنا پر بعد ازاں یونیورسٹی سے بھی اجازت مل گئی اور میں محروم صاحب کا باضابطہ شاگرد بن گیا بلکہ یوں میں پاکستان میں محروم صاحب کا آخری شاگرد بھی تھا۔ تاہم ان کی رفاقت کم نصیب ہوئی۔ ملکی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ محروم صاحب کا لُج آتے تھے تو سہے سہے سے لگتے تھے۔ اُنہوں نے سر سے پگڑی اتار دی تھی اور جناح کیپ پہننا شروع کر دی تھی تاہم زندگی کے معمولات جاری تھے۔ مجھ پر اُن کی شفقتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کہیں نہ کہیں مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے اور جہاں جاتے مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ مثلاً ایک بار عبدالعزیز فطرت مرحوم کے گھر ”سدا بہار“ محلہ امام باڑہ میں مشاعرہ ہوا تو مجھے ساتھ لے گئے۔ پھر گورڈن کالج کے حساب کے پروفیسر خواجہ مسعود کے گھر مری روڈ، بالمقابل شاہ دیاں ٹاہلیاں، مشاعرہ ہوا تو وہاں بھی میں ان کے ہمرا تھا اور وہاں پہلی بار ان کے ڈرائیونگ روم کی شیلف پر سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا لینن کا خوب صورت مجسمہ دیکھا۔ غالباً خواجہ مسعود کے گھر مشاعرہ پہلے ہوا اور فطرت صاحب کے گھر بعد میں۔ کیونکہ فطرت صاحب سے میرا پہلا تعارف تو خواجہ صاحب کے ہی گھر پر ہوا۔ وہیں انجم رضوانی صاحب (افضل پرویز کے بڑے بھائی) اور عدم صاحب سے بھی پہلی بار ملا۔

میں محروم صاحب کا منظور نظر شاگرد یوں بھی تھا کہ میرے پاس ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ”گنج معانی“ تھا۔ غالباً کالج میں، میں واحد طالب علم تھا جس کے پاس یہ مجموعہ تھا۔ پانچ سو پینتالیس صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظمیں ہیں اور یہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے ناشر میسر زعفر چندر کپور اینڈ سنز، انارکلی لاہور تھے۔ میری عمر کے کتب بین حضرات اس مشہور کامیاب پبلشر سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ”گنج معانی“ کا جو نسخہ میرے پاس ہے اُسے بہ یک وقت کم یاب اور نایاب ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اول یہ کہ مذکورہ نسخہ مجموعہ کلام محروم کا پہلا ایڈیشن ہے اور دوم یہ کہ اس پر جگن ناتھ آزاد کے دستخط ہیں۔ بڑے پختہ خط میں انھوں نے انگریزی میں پہلے صفحے پر Jagan Nath, II Year class, D.A.V.College Rawalpindi لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مجھے اپنے لبا کی کتابوں میں سے ملا تھا۔ نہایت اچھی حالت میں ”بانگ درا“ کے ساز پر عمدہ کتابت کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اُس زمانے میں اپنی عمر کے اعتبار سے یہ جاننے کی نوبت ہی نہ آئی کہ لبا جان کو یہ نسخہ کہاں سے ملا۔ بہر کیف اس کا ایک حصہ محروم صاحب کی اُن نظموں کے لیے مختص ہے جو انھوں نے اپنی (پہلی) بیوی کی وفات پر کہی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہ اُن کی نوجوانی کا سانحہ تھا۔ ابھی شادی کو پانچ سال ہی گزرے تھے کہ اُن کی اہلیہ عین نوجوانی میں ایک گھٹنوں کے بل چلنے

والی بچی ودیاوتی کو چھوڑ کر چلی بسی۔ زچگی کے دوران پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر قابو نہ پایا جاسکا۔ یہ نظمیں بڑی درد انگیز ہیں۔ میں کبھی کبھی اُن سے گفتگو کے دوران ان کی پہلی نظم ”اشک حسرت“ کے ایک دو بند پڑھ دیتا تو عجیب غم آلود کیفیت ان پر طاری ہو جاتی اور میں بھی اداس ہو جاتا۔ بس اُن کے قریب تر ہونے کا یہی ایک سبب بن گیا تھا۔ انھیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ میرے غم کو سمجھتا ہے، اس وقت ان کی پہلی بیوی کو فوت ہوئے کم و بیش بیس سال ہو چکے تھے اور دوسری شادی سے پیدا ہونے والا جگن ناتھ اب جگن ناتھ آزاد بن چکا تھا لیکن وہ اپنی پہلی محبت کو بھلا نہیں سکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے چہرے پر غیر معمولی متانت رہتی تھی اور ان کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔

لیکن وہ نرم خوتھے۔ اس سے قبل لال کرتی (راولپنڈی کا ایک علاقہ) کے سکول میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ ناپختہ طلبہ کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ترش روئی اُن سے کوسوں دور تھی۔ طلبا کے شور مچانے پر برہم ہوتے تو بآواز بلند ”اوپ“ کہتے اور لڑکے خاموش ہو جاتے۔ بڑے انہماک سے پڑھاتے تھے مگر میانوالی کے لہجے میں فارسی اشعار کا جھٹکا کرتے جاتے تھے۔ ایک بار حافظ کی ایک غزل بطور سبق پڑھا رہے تھے۔ مطلع پڑھا:

رواقِ منظر چشم من آشیانہ تست

کرم نما و فردا کہ خانہ خانہ تست

اور ترجمہ کیا تو ساری کلاس نے ایک لمبی ”ہائے“ کہہ کر آہ بھری اور ”کرم نما و فردا“ کا نعرہ لگایا۔ طالبات ہمیشہ اگلے ڈیسکوں پر بیٹھتی تھیں۔ لڑکوں میں ابھی ہائی سکول کی عادتیں باقی تھیں۔ چنانچہ لڑکیاں شرما کر رہ گئیں اور کلاس میں ”کرم نما و فردا“ کا ورد شروع ہو گیا۔ محروم صاحب ایک لمحہ تو خاموش رہے۔ پھر اپنی پاٹ دار آواز میں ”اوپ“ کہا اور کلاس پر سکوت طاری ہو گیا۔ محروم صاحب کی آواز پھر گونجی: ”یہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو کہ تم سب گدھے بیٹھے ہوئے ہو۔“ اس پر کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ مگر پچھلے ڈیسک سے ایک آواز آئی۔ ”سر! تذکیر و تانیث کا تو خیال کر لیں۔“ یہ ایسا برجستہ جملہ تھا کہ محروم صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے اور کلاس نے لڑکیوں سمیت کھل کر قہقہہ لگایا اور پھر احوال دل معمول پر آ گئے۔

۱۹۴۸ء کے وسط تک مہاجرین اور شرنارتھیوں کے قتل و غارت کی داستانیں زیادہ پریشان کرنے لگی تھیں۔ بہت سے ہندواو عیسائی پروفیسر کالج سے رخصت ہو رہے تھے۔ پھر ایک روز جب ہم فارسی کے کلاس روم میں پہنچے تو بلیک بورڈ پر محروم صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ رباعی پڑھنے کو ملی:

الفت کا چمن اجڑ گیا ہے یارب

رنگ گل پھیکا پڑ گیا ہے یارب

گلشن میں چلی ہوئے نخوت ایسی

ہر غنچہ کامنہ بگڑ گیا ہے یارب

محروم صاحب اپنی بیٹی کے پاس دلی جا چکے تھے، ”کرم نما و فردا“ کا ورد کرنے کا اصل وقت تو یہ تھا!!!



رابرٹ شیکلے / شہر یار خان

دُنیاؤں کی دُکان

[یہ افسانہ امریکن افسانہ نگار رابرٹ شیکلے (۱۹۲۸ء-۲۰۰۵ء) کی تخلیق ہے۔ رابرٹ شیکلے زندگی کی لامعنویت کو لطیف پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ زیرِ نظر افسانہ انتہائی خوبصورت انداز میں نہ صرف تمنا اور واہمہ کے باہمی تعلق کو سامنے لاتا ہے بلکہ ساتھ ہی حقیقت کے غیر حقیقی ادراک کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ سلوونیا کے ممتاز فلاسفر سیلو وزرک نے اس افسانے پر ایک مختصر تبصرہ کیا ہے، جس کا ترجمہ بھی آخر میں دیا گیا ہے۔]

مسٹر وین جب سرئی بلے کی قد آدم ڈھیری کے آخری سرے پر پہنچا تو اُسے ”دُنیاؤں کی دُکان“ نظر آئی۔ دُکان بالکل ایسی ہی تھی جیسا کہ اُس کے دوستوں نے بیان کی تھی: ایک چھوٹی سی جھونپڑی جسے لکڑی کے تختوں، گاڑیوں کے حصوں، لوہے کے ٹکڑوں اور چند اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا اور اس سب کے اوپر پتلا نیلا رنگ جیسے انڈیل دیا گیا تھا۔ مسٹر وین نے اپنے پیچھے دور تک پھیلے ہوئے بلے پر نظر دوڑائی یہ دیکھنے کے لیے کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا گیا۔ اس نے اپنا پارسل تھوڑا اور مضبوطی سے اپنی بغل میں دبایا: اور پھر اپنی ہی جرأت پہ حیران ہوتے ہوئے، اس نے دروازہ کھولا اور چپکے سے اندر داخل ہو گیا۔

”صبح بخیر“، دکان کے مالک نے اس کا استقبال کیا۔

وہ بھی بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ اسے بتایا گیا تھا: دراز قد، ہوشیار نظر آنے والا بوڑھا شخص جس کی آنکھیں چھوٹی اور منہ نیچے کولایکا ہوا تھا۔ اس کا نام ٹامپکنز تھا۔ وہ ایک پرانی جھولنے والی کرسی پر براجمان تھا جس کی پشت پہ ایک نیلا اور سبز طوطا بیٹھا تھا۔ دکان میں ایک اور کرسی اور میز تھا۔ میز پر ایک رنگ آلود سرنج پڑی تھی۔

”میں نے دوستوں سے تمہاری دُکان کے بارے میں سنا ہے“۔ مسٹر وین نے کہا۔

”پھر تمہیں میری قیمت کا پتا ہوگا“۔ ٹامپکنز نے کہا۔ ”کیا تم وہ لائے ہو؟“

”ہاں“۔ مسٹر وین نے کہا، اس نے اپنا پارسل سامنے کیا۔ ”لیکن میں پہلے کچھ پوچھنا۔۔۔“

”سب ہی پہلے پوچھنا چاہتے ہیں“، ٹامپکنز نے طوطے کو مخاطب کر کے کہا جس نے اس بات پہ اپنی آنکھیں جھپکیں۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اصل میں کیا ہوتا ہے؟“

ٹامپکنز نے آہ بھری۔ ”ہوتا یہ ہے کہ تم میری فیس ادا کرو گے۔ میں تمہیں ایک انجکشن لگاؤں گا جس سے تم بے ہوش ہو جاؤ

گے۔ پھر کچھ آلات کی مدد سے جو میری دکان کے پچھلے حصے میں پڑے ہیں، میں تمہارے ذہن کو آزاد کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے ٹامپکنز مسکرایا اور ایسا لگا جیسے اس کا خاموش طوطا بھی مسکرایا ہو۔

”پھر کیا ہوگا؟“ مسٹر وین نے پوچھا۔

تمہارا ذہن، جب اپنے جسم سے آزاد ہو جائے گا، تو وہ ان بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا کا انتخاب کر سکے گا جو ہماری زمین ہر لمحہ تخلیق کرتی ہے۔“ دانت نکالتے ہوئے، ٹامپکنز اپنی کرسی پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اس کے انداز و اطوار سے اس کے پر جوش ہونے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہاں، میرے دوست! تم نے شاید اس طرف کبھی دھیان نہ دیا ہو۔ اس وقت سے لے کر جب ہماری تباہ حال زمین نے سورج کے آتش رحم سے جنم لیا، تب سے یہ متبادل دنیاؤں تخلیق کرتی چلی آرہی ہے۔ ایسی دنیاؤں جن کی کوئی انتہا نہیں، جو چھوٹے اور بڑے واقعات سے پیدا ہوتی ہیں۔ چاہے وہ سکندر اعظم ہو یا ایک امیبا، ہر کوئی ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے جیسا کہ پانی میں لہریں ضرور پیدا ہوں گی چاہے آپ چھوٹا پتھر پھینکیں یا بڑا۔ کیا ہر چیز اپنا سایہ نہیں رکھتی؟ تو میرے دوست! اس زمین کی بھی چار جہات ہیں؛ اُس وجہ سے یہ سہ جہاتی سائے پھیلاتی ہے، ہر لمحے اپنے وجود کا عکس پیدا کرتی ہے۔ لاکھوں، کروڑوں زمینیں، لامحدود، اور جب میں تمہارے ذہن کو آزاد کر دوں گا، تو وہ ان بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے گا اور کچھ دیر اس پہ قیام کر سکے گا۔“

مسٹر وین کو ایک بے چین کر دینے والا احساس ہوا کہ مسٹر ٹامپکنز کی لفاظی اس سرکس کے ملازم جیسی لگ رہی تھی جو لوگوں کی دلچسپی بڑھانے کے لیے اُن کرشمات کو بیان کرتا ہے، جن کا حقیقت میں کوئی وجود ممکن ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی مسٹر وین نے اپنے آپ کو یاد دہانی کرائی کہ اس کی اپنی زندگی میں ایسے واقعات ہوئے تھے جن پر اسے خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ چنانچہ عین ممکن تھا کہ وہ کرشمے جن کا ٹامپکنز تذکرہ رہا تھا، وہ بھی کچھ ایسے ناممکن نہ ہوں۔

”میرے دوستوں نے مجھے یہ بھی بتایا ہے۔۔۔“ مسٹر وین بولا۔

”کہ میں ایک فریبی اور دھوکے باز شخص ہوں؟“ ٹامپکنز نے پوچھا۔

”کچھ کا یہ مطلب تھا“ مسٹر وین نے محتاط انداز میں کہا ”لیکن میں اپنے ذہن کو کھلا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ

بھی کہا۔۔۔“

”مجھے معلوم ہے تمہارے گندی سوچ رکھنے والے دوستوں نے کیا کہا ہوگا۔“

”انھوں نے خواہش کے پورا ہونے کے بارے میں بتایا ہوگا۔ کیا تم اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“ مسٹر وین بولا۔ ”انھوں نے بتایا ہے کہ میں جو خواہش کروں گا، جو بھی چاہوں گا۔۔۔“

”بالکل“ ٹامپکنز نے کہا۔ ”یہ چیز ایسے ہی ہے۔ لامحدود دنیاؤں میں جن سے آپ انتخاب کر سکتے ہیں۔ آپ کا ذہن

خواہشات کے پیچھے ہی چلتا ہے اور اسی بنیاد پر انتخاب کرتا ہے۔ آپ کی دلی خواہش ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کسی کو قتل کرنے کی خواہش پوشیدہ ہے۔۔۔“

”بالکل بھی نہیں، بالکل بھی نہیں“۔ مسٹر وین چلایا۔

”۔۔۔ پھر آپ اُس دُنیا میں جائیں گے جہاں آپ قتل کر سکیں۔ جہاں آپ خون میں لت پت ہو سکیں، جہاں آپ ڈی ساڈ اور سیزر کو بھی مات دے سکیں یا جو بھی آپ کا آئیڈیل ہے۔ فرض کرو آپ طاقت چاہتے ہیں؟ پھر آپ ایک ایسی دُنیا کا انتخاب کریں گے جہاں آپ حقیقی معنوں میں خدا ہوں، کوئی خون کا پیاسا دیوتا، یا ایک دانشور کو تم بدھ۔“

”مجھے نہیں لگتا اگر میں۔۔۔“

”اس کے علاوہ بھی خواہشات ہیں۔“ ٹامپکنز بولا۔ ”جنتی بھی اور دوزخی بھی۔ بے لگام جنسیت، لالچ، شراب نوشی، محبت، شہرت کوئی بھی چیز جو تم چاہو۔“

”حیران کن۔“ مسٹر وین نے کہا۔

”ہاں۔“ ٹامپکنز نے اتفاق کیا۔ میری فہرست بہت معمولی ہے اور اس میں تمام ممکنات کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ خواہش کی بہت صورتیں اور شکلیں ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم جنوبی سمندر میں بسنے والے کسی مثالی قبیلے کی پرامن، سادہ اور دیہاتی قسم کی زندگی کے خواہش مند ہو۔“

”یہ میری شخصیت کے زیادہ قریب ہے۔“ مسٹر وین ایک کھسیانی ہنسی ہنسا۔

”لیکن کون جانتا ہے؟“ ٹامپکنز نے پوچھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آپ کو خود نہ پتا ہو کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو اپنی موت کی خواہش ہو۔“

”کیا ایسا اکثر ہوتا ہے؟“ مسٹر وین نے پریشانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کبھی کبھار۔“

”میں مرنے کی خواہش نہیں کر سکتا۔“ مسٹر وین بولا۔

”مشکل سے ہی ایسا ہوتا ہے۔“ ٹامپکنز مسٹر وین کے ہاتھوں میں پکڑے پارسل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن مجھے کیسے یقین آئے گا کہ یہ سب حقیقت ہے؟ آپ کے واجبات بہت زیادہ ہیں، میری ساری جمع پونجی لگ جائے گی اور جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ آپ مجھے کوئی نشہ آور دوا دیں گے جس سے میں محض ایک خواب دیکھوں گا۔ میری ساری جمع پونجی ایک ہیروئن کے انجکشن اور کچھ خوبصورت الفاظ کے بدلے مجھ سے لے لی جائے گی۔“

ٹامپکنز یقین دلانے والے انداز میں مسکرایا۔ ”اس تجربے میں کوئی بھی نشہ آور خاصیت نہیں۔ اور نہ ہی خواب کا سا احساس۔“

”اگر یہ سچ ہے“ مسٹر وین کچھ مشتعل سے انداز میں بولا ”تو میں اپنی خواہش کی دنیا میں مستقل کیوں نہیں رہ سکتا؟“

”میں اس پہ کام کر رہا ہوں۔“ ٹامپکنز نے کہا۔ میں اس وجہ سے کافی زیادہ فیس کا مطالبہ کرتا ہوں۔ تاکہ میں مختلف اشیاء خرید سکوں اور تجربات کر سکوں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اس کو مستقل کر سکوں۔ ابھی تک میں اس ڈوری کو ڈھیلا نہیں کر سکا جو انسانی ذہن کو اس زمین سے باندھ کے رکھتی ہے۔ اور اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کوئی صوفی یا بزرگ بھی اس ڈوری کو نہیں کاٹ سکتا، موت ہی اسے کاٹ سکتی ہے۔ لیکن میں پھر بھی پرامید ہوں۔

”اگر آپ ایسا کر سکیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“ مسٹر وین نے شائستہ انداز میں کہا۔

”ہاں ہوگی۔“ ٹامپکنز بولا۔ اس کے لہجے میں اچانک جذبات کی جھلک اُبھر آئی تھی۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں اپنی اس خستہ حال دکان کو لوگوں کے لیے فرار کے ٹھکانے میں تبدیل کر دوں گا۔ پھر میں کوئی واجبات نہیں لوں گا۔ یہ سب کے لیے مفت ہوگا۔ پھر ہر کوئی اپنی خواہش کی دنیا میں جاسکے گا، وہ دنیا جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوگی۔ اور وہ اس دنیا کو کیڑے مکوڑوں اور چوہوں کے حوالے کر کے یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر سکیں گے۔“

ٹامپکنز نے جملے کے درمیان ہی اپنے آپ کو ٹوکا اور ایک دم اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے تعصبات ظاہر ہو رہے ہیں۔ میں فی الحال زمین سے مستقل فرار کی پیش کش نہیں کر سکتا؛ کوئی بھی ایسا فرار جس میں بندے کی موت واقع نہ ہو۔ شاید میں کبھی ایسا نہ کر پاؤں۔ فی الحال میں صرف آپ کو تعطیلات کی طرح کا فرار کا تجربہ کر سکتا ہوں، ایک تبدیلی کا، ایک اور دنیا کی جھلک، اور تمھاری اپنی خواہش سے ملاقات کا۔ تمھیں میرے واجبات کا پہلے سے معلوم ہے۔ اگر آپ تجربے سے مطمئن نہ ہوئے تو میں آپ کو سارے واجبات واپس کر دوں گا۔“

”یہ آپ کی بہت مہربانی ہے۔“ مسٹر وین نے اشتیاق بھرے انداز میں کہا۔

”لیکن ایک اور چیز کا بھی میرے دوستوں نے ذکر کیا تھا۔ کہ میری زندگی کے دس سال ضائع ہو جائیں گے۔“

”اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں“ ٹامپکنز بولا۔ اور وہ ناقابل واپسی ہیں۔ میرا عمل اعصاب پر شدید باؤ کا باعث بنتا ہے اور اسی وجہ سے متوقع زندگی میں کمی آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نام نہاد حکومت نے اس عمل کو غیر قانونی قرار دیا ہوا ہے۔“

”لیکن وہ اس پابندی پر سختی سے عمل کیوں نہیں کراتے؟“ مسٹر وین نے پوچھا۔

”نہیں۔ سرکاری طور پر اس عمل پر پابندی ہے کہ یہ ایک نقصان دہ دھوکا ہے۔ لیکن سرکاری ملازم بھی انسان ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح اس زمین سے فرار چاہتے ہیں۔“

”اس کی جو قیمت مجھے ادا کرنی پڑے گی“ مسٹر وین سوچتے ہوا بولا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے پاسل کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”اور میری زندگی کے دس سال بھی کم ہو جائیں گے۔ اور یہ سب میری چھپی ہوئی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہوگا۔ مجھے اس پہ سوچنے

کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔

”سوچ لو۔“ ٹامپکنز نے بے نیازی سے کہا۔

گھر تک کے راستے میں مسٹر وین اس بارے میں سوچتا رہا۔ جب اس کی ٹرین پورٹ واشنگٹن، لانگ آئی لینڈ پہنچی تو وہ تب تک بھی سوچ رہا تھا۔ اور سٹیشن سے اپنے گھر تک اپنی گاڑی چلاتے ہوئے اس کا ذہن ٹامپکنز کے بوڑھے چالاک چہرے، ممکنات کی دُنیاؤں اور خواہشات کی تکمیل کے بارے میں ہی غور کرتا رہا۔

لیکن جب اس نے اپنے گھر کے اندر قدم رکھا تو اسے ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑا۔ حیثیت، اس کی بیوی، چاہتی تھی کہ وہ نوکرائی سے سختی سے بات کرے کیونکہ اس نے شراب نوشی پھر شروع کر دی تھی۔ اس کا بیٹا ٹامی چاہتا تھا کہ وہ ان کی بادیانی کشتی کو ٹھیک کرے کہ کل اسے لیکر انھوں نے سمندر میں نکلنا تھا۔ اور اس کی چھوٹی بیٹی اسے اپنے سکول کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ مسٹر وین نے نوکرائی کو مدھم لیکن سخت لہجے میں سرزنش کی۔ پھر اس نے ٹامی کو کشتی کے پینڈے پر تانے کا رنگ کرنے میں مدد کی اور پیگی کی اپنے کھیل کے میدان میں کارگزاری کی بھی داستان سنی۔ بعد میں جب بچے سونے چلے گئے اور وہ اور حیثیت ٹی وی لاؤنج میں اکیلے رہ گئے تو اس کی بیوی نے اس سے پوچھا کہ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔

”پریشانی؟“

”آپ کسی چیز کے بارے میں پریشان لگ رہے ہیں۔“ حیثیت نے کہا۔ ”کیا آپ کا دفتر میں دن اچھا نہیں گزرا؟“

”بس، معمول کے مطابق ہی تھا سب کچھ۔۔۔۔۔“

یقیناً وہ حیثیت کو یا کسی اور کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس نے دفتر سے چھٹی کی تھی اور وہ ٹامپکنز سے ملنے اس کے پاگلوں والی دُنیاؤں کی دکان میں گیا تھا۔ نہ ہی وہ اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا کہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک دفعہ اپنی دلی خواہش ضرور پوری کرے۔ حیثیت جو ایک سمجھدار اور عملی قسم کی خاتون تھی، اس بات کو کبھی نہ سمجھ پاتی۔

دفتر میں اگلے چند روز کافی تھکا دینے والے تھے۔ وال سٹریٹ میں کچھ بے چینی والی کیفیت طاری تھی اور اس کی وجہ مشرق وسطیٰ اور ایشیا میں ہونے والی تبدیلیاں تھیں اور ان تبدیلیوں کا اثر سٹاک ایکسچینج کے کاروبار پر بھی پڑ رہا تھا۔ مسٹر وین کافی مصروف رہا۔ اس نے اپنے ذہن کو اپنا سب کچھ دے کر خواہشات کی تکمیل والے خیال سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اس کی زندگی کے دس سال بھی چلے جاتے۔ یہ سب پاگل پن تھا اور شاید بوڑھا ٹامپکنز کوئی جنونی شخص تھا۔

ویک اینڈ پر مسٹر وین اپنے بیٹے ٹامی کے ساتھ کشتی پہ سمندر کی سیر کو گیا۔ کشتی گو کہ کافی پرانی تھی لیکن وہ ٹھیک چل رہی تھی اور اس کے پینڈے کے سوراخ بھی لگتا تھا کہ صحیح بند ہو گئے تھے۔ ٹامی کشتی میں نئے ریٹنگ والے بادبان لگوانا چاہتا تھا لیکن مسٹر وین نے سختی سے انکار کر دیا۔ شاید اگلے سال، اگر کاروبار میں کچھ بہتری آگئی تو نئے بادبان لگوالیں۔ ابھی پرانے بادبان ہی سے گزارا کرنا

پڑے گا۔

کبھی کبھی رات میں جب بچے سو جاتے تو وہ اور حیثیت کشتی لے کر نکل جاتے۔ لانگ آئی لینڈ کا شور اس وقت ختم ہو چکا ہوتا اور فضا میں خنکی ہوتی۔ ان کی کشتی سمندر کے کنارے پہانگے بڑے سے چاند کی طرف اُڑتی چلی جاتی۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ کے ذہن پہ کوئی بوجھ ہے۔“ حیثیت بولی۔

”ڈارلنگ، ایسی کوئی بات نہیں۔“

”آپ مجھ سے کوئی چیز چھپا رہے ہیں؟“

”نہیں۔“

”کیا آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں، بالکل صحیح۔“

”پھر مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔۔۔ ایسے“

اور کشتی کچھ دیر تک خود بخود چلتی رہی۔

خواہش اور تکمیل۔۔۔ لیکن خزاں آئی اور انھیں کشتی کو سمندر سے باہر لانا پڑا۔ سٹاک مارکیٹ میں کچھ استحکام آیا لیکن پیکی کو خسرہ نکل آیا۔ ٹامی جاننا چاہتا تھا کہ عام بم، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، کوبالٹ بم اور دوسری قسم کے بم جن کا ذکر خبروں میں کیا جاتا تھا ان تمام میں کیا فرق ہے۔ مسٹر وین کو جتنا علم تھا اس نے ٹامی کو سمجھایا۔ پھر ایک دن غیر متوقع طور پر نوکرائی نوکری چھوڑ کے چلی گئی۔ خفیہ خواہشات کی اہمیت اپنی جگہ۔۔۔ شاید وہ واقعی کسی قتل کرنا چاہتا تھا، یا جنوبی سمندر کے کسی جزیرے پر رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی ذمہ داریوں سے بھی تو عہدہ برآہ ہونا تھا۔ اس کے دو بچے تھے اور اس کی توقع سے زیادہ اچھی بیوی۔

شاید کرسمس کے موقع پر وہ خواہش کی تکمیل کے لیے جائے۔۔۔۔

لیکن سردیوں میں ان کے ایک گیسٹ بیڈروم میں بجلی کی خرابی کی وجہ سے آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ والوں نے زیادہ نقصان سے پہلے ہی آگ بجھالی، اور کسی کو کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچی۔ لیکن اس سے مسٹر وین کے ذہن میں ٹامپکنز کا خیال کچھ عرصہ کے لیے نکل گیا۔

پہلے تو انھوں نے بیڈروم کی مرمت کروانی تھی کیونکہ مسٹر وین کو اپنے اس پرانے اور شاندار گھر پر بڑا فخر تھا۔

بین الاقوامی صورت حال کی وجہ سے کاروبار میں کچھ استحکام نہیں تھا۔ یہ روسی، عرب، یونانی اور چینی۔ بین الاقوامی میزائل، ایٹم بم، سپینک۔۔۔۔ مسٹر وین کو دفتر میں زیادہ دیر کام کرنا پڑتا، بعض اوقات رات بھی ہو جاتی۔ ٹامی کو کن پیڑے نکل آئے۔ چھت کے ایک حصے کو مرمت کرانا پڑا۔ اور اب چونکہ دوبارہ بہار کا موسم سر پر آن پڑا تھا لہذا کشتی کو بھی دوبارہ سمندر میں اُتارنا تھا۔ ایک سال

گزر چکا تھا اور اسے اپنی خفیہ خواہشات کے بارے میں سوچنے کا بہت کم وقت ملا تھا۔ شاید اگلے سال۔ اسی دوران۔۔۔۔۔

”تم ٹھیک تو ہونا۔“ ٹامپکنز نے پوچھا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہوں،“ مسٹر وین بولا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اپنی پیشانی کو سہلانے لگا۔

”کیا تمہیں اپنے واجبات واپس چاہئیں؟“ ٹامپکنز نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں تجربے سے مطمئن ہوں۔“

”سب مطمئن ہوتے ہیں۔“ ٹامپکنز نے اپنے طوطے کو خوش طریقے سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہارا تجربہ کیا تھا؟“

”کچھ ماضی قریب کے بارے میں تھا۔“ مسٹر وین نے جواب دیا۔

”کافی زیادہ ماضی قریب کے بارے میں ہی ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں اپنی خفیہ خواہش کے بارے میں پتا چلا؟ کیا وہ قتل تھا؟ یا

جنوبی سمندر کا کوئی جزیرہ؟“

”میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔“ مسٹر وین نے شائستہ مگر حتمی لہجے میں کہا۔

”بہت سارے لوگ مجھ سے اپنی خواہشات کا ذکر نہیں کرتے۔“ ٹامپکنز کے لہجے میں شکایت تھی۔ ”مجھے نہیں سمجھ آتی کہ

کیوں۔“

”کیونکہ شاید۔ لوگوں کی خفیہ خواہشات کی دنیا ان کے لیے مقدس ہوتی ہے۔ بُر امت منانا۔۔۔۔۔ آپ کا خیال ہے کہ کیا

کبھی آپ اسے مستقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ میرا مطلب ہے انسان کی پسند کی دنیا؟“

بوڑھے نے اپنے کندھے اُچکائے۔ ”میں کوشش کر رہا ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ ہر کسی کو

معلوم ہو جائے گا۔“

”ہاں میرا خیال ہے۔“ مسٹر وین نے اپنا پارسل کھولا اور اس کے اندر سے ساری اشیاء نکال کر میز پر رکھ دیں۔ پارسل کے

اندرونی بوٹوں کا ایک جوڑا، ایک چاقو، تانبے کی تار کے دو بندل اور سیل بند بڑے گوشت کے دو ٹن تھے۔ ٹامپکنز کی آنکھوں میں ایک

لمحے کے لیے چمک آئی۔ ”کافی مناسب ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ کا شکریہ۔“

”الوداع۔“ مسٹر وین بولا۔ ”شکریہ۔“

مسٹر وین دوکان سے نکلا اور سرمئی لمبے کے بیچ کے راستے پر چل پڑا۔ اس سے آگے حدنگاہ تک لمبے کے میدان تھے،

بھورے سرمئی اور سیاہ۔ یہ میدان جو ہر سمت اُفتق تک پھیلے معلوم ہوتے تھے دراصل شہروں کے مردہ جسم تھے۔ درختوں کی جھلسی ہوئی

باقیات اور انسانوں کے گلے سڑے ڈھانچے بھی ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔

”بہر حال۔“ مسٹر وین نے اپنے آپ سے کہا۔ ”سودا اتنا برا نہیں تھا۔ میں نے اگر اپنی جمع پونجی ساری اس کے حوالے کی تو بدلے میں بھی کافی کچھ ملا۔“

ماضی کے اس سال نے اُس سے اُس کی ساری جمع پونجی لے لی تھی اور ساتھ ہی اس کی زندگی کے دس سال بھی جا چکے تھے۔ کیا وہ ایک خواب تھا؟ اس کے باوجود یہ گھائے کا سودا نہیں تھا۔ لیکن اب اس نے حیثیت اور بچوں کا خیال ذہن سے نکالنا تھا۔ وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا، کم از کم اس وقت تک کہ جب تک ٹامپکنز اس عمل کو مستقل کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ اب اس نے اپنی بقا کے بارے میں سوچنا تھا۔

اپنی کلائی پر بندھے ہوئے آلے کی مدد سے، جو بارودی سرنگوں کے بارے میں بتاتا تھا، اس نے ایک محفوظ راستے کا انتخاب کیا۔ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی پناہ گاہ تک اندھیرا پھیلنے تک پہنچ جائے کیونکہ اس کے بعد چوہے باہر نکل آتے تھے۔ اگر وہ وقت پر نہ پہنچا تو اسے شام کا آلوؤں کا راشن نہیں ملے گا۔

سیلووزک کا تجزیہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ واہمہ (Fantasy) ہماری خواہش کو حقیقت بناتا ہے۔ لیکن واہمہ ایسی صورت حال کا نام نہیں جس میں ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ہماری خواہش پوری ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس واہمہ ہماری خواہش کو ہمارے سامنے ڈرامائی شکل میں پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں واہمہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں کس چیز کی خواہش کرنی چاہیے۔ تحلیل نفسی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہمارے اندر خواہش پہلے سے موجود نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہمیں خود تخلیق کرنا پڑتا ہے۔ اور واہمہ کا یہی عمل ہے کہ یہ ہمیں خواہش کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتاتا ہے۔ اور ساتھ ہی خواہش کرنے والے یعنی فاعل کا جس چیز کی خواہش کی جا رہی ہے یعنی مفعول کے مابین تعلق کو پیدا کرتا ہے۔ واہمہ کے ذریعے ہی فاعل کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خواہش کر رہا ہے اور واہمہ ہی اسے بتاتا ہے کہ اس نے یہ خواہش کیسے کرنی ہے۔ اس نقطے کی وضاحت کے لیے ہم رابرٹ شیکلے کے افسانے ”دُنیاؤں کی دُکان“ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

افسانے میں قارئین کو ایسا تاثر ملتا ہے جیسے مسٹر وین نے ٹامپکنز کے تجربے کا حصہ بننے سے پہلے اس سے وقت کی مہلت مانگی اور گھر واپس آ گیا۔ جہاں اس کی بیوی حیثیت اور بچے ٹامی اور پیگی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاں وہ وال سٹریٹ میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی زندگی مختلف چھوٹے بڑے مسائل سے عبارت تھی۔ وہ ہر روز سوچتا کہ کسی دن وہ ٹامپکنز کے پاس اپنی خفیہ خواہش کی تکمیل کے لیے جائے گا لیکن ہر دفعہ کچھ نہ کچھ واقعہ یا حادثہ وقوع پذیر ہو جاتا کہ وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکتا۔ کبھی اس کے بچے بیمار ہو جاتے تو کبھی اس کے گھر کی مرمت کا مسئلہ درپیش آ جاتا۔ لیکن لاشعوری طور پر وہ اس چیز سے آگاہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دن ٹامپکنز

کے پاس جائے گا۔ ایک سال کا عرصہ بیت جاتا ہے۔ کہ اچانک جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ٹامپکنز کی جھونپڑی میں کرسی پر بیٹھا پاتا ہے، جو اس سے پوچھا ہے کہ کیا وہ مطمئن ہے۔ مسٹر وین جواب میں کہتا ہے کہ ہاں وہ مطمئن ہے اور اپنی ساری جمع پونجی اس کے حوالے کر کے وہاں سے نکل آتا ہے۔ واپسی پر وہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ اسے دیر ہو جائے گی اور شاید وہ شام کا آلوؤں کا راشن نہ حاصل کر سکے۔ یہ افسانہ ایٹمی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایٹمی جنگ نے انسانی تہذیب کو تباہ کر دیا ہے اور شہروں کے شہرے کا ڈھیر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کہانی کا سب سے دلچسپ نقطہ یہ ہے کہ قاری اس دھوکے میں آ جاتا ہے کہ جیسے مسٹر وین نے اس تجربے میں حصہ نہیں لیا اور واپس آ گیا۔ دراصل ہم یہ سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں کہ مسٹر وین جس چیز کا انتظار کر رہا ہے (یعنی ایک دن وہ ٹامپکنز سے ملنے جائے گا اور اپنی خفیہ خواہش پوری کرے گا) وہ انتظار ہی وہ خواہش ہے۔ خواہش کا اصل میں پورا ہونا خواہش نہیں بلکہ خواہش کرنا ہی خواہش کی روح ہے۔ مسٹر وین اپنے واہمہ میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی کی عام سی زندگی گزار رہا ہے۔ جس میں اس نے خاوند اور باپ کا کردار ادا کرنا ہے لیکن ساتھ ہی وہ سوچتا ہے کہ ایک دن اس کی خفیہ خواہش پوری ہو جائے گی جب وہ ٹامپکنز کے پاس جائے گا۔ جب وہ جاگتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی خفیہ خواہش یہی تھی کہ وہ خواہش کرتا رہے اور اصل میں وہ خواہش پوری نہ ہو۔ خواہش کا اصل مفہوم اس کے پورے ہونے میں نہیں بلکہ خواہش کے طور پر قائم رہنے میں ہے۔

جمال ابڑو منظور علی ویسریو

خمیسے کا کوٹ

ان دنوں میں نماز پڑھتا تھا۔ سردی اتنی شدید ہوتی تھی کہ بستر میں بھی سویٹر، مفکر، کوٹ اور اوور کوٹ پہننا پڑتا تھا۔ مٹی کا لوٹا جس پر مٹی کا لپ چڑھا ہوتا تھا پھر بھی پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم سے پار ہوتے۔ میں جھکتا ہوا، تھر تھراتا، مسجد کی طرف جاتا۔ اتنی تکلیفوں کے بعد البتہ خدا کو اپنے قریب پاتا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا تھا کہ بے نمازی کتنے نہ بیکار ہیں۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتا تھا۔ سرد طوفان میرا خرمجھ سے چھین کر لے جاتا تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان ٹھنڈ کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ گیارہ سال کا خمیہ مجھ سے پہلے ہی مویشی لیکر کھیتوں میں کھڑا ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر قمیص کی بجائے ایک پھٹا پرانا کوٹ ہوتا تھا۔ کالی لنگی اور سر پر میلی روئی کی ٹوپی ہوتی تھی اور سردی اتنی تھی کہ مٹر کے بیلوں پر شبنم جمی ہوتی تھی۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں ڈالے ہوئے ننگے پاؤں، خود سے بڑا ڈنڈا اٹھائے سکڑا کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کا نپتی رہتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے کہتا تھا۔ ”اوئے ملا!“ وہ مجھے تنگ کرتا تھا۔ میں جلد آگے بڑھتا چلا جاتا تھا اور وہ پیچھے سے کہتا جاتا تھا ”ملا، ملا، او ملا۔“

میں اوور کوٹ کے کالروں کو اوپر چڑھاتے ہوئے مسجد کی طرف چلا جاتا تھا اور وہ مویشیوں کی طرف۔ میں مسجد میں جا کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا اور اپنی صحت اور خوشحالی کے لیے دعا مانگتا تھا۔ وہ فصل کی دیکھ بھال کرتا تھا اور مویشی چراتا تھا۔ ”اوئے ملا!“ کہہ کر وہ اونچی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ اندھیرے میں اس کے کالے ہونٹوں میں سے سفید چمکتے دانت برآمد ہوئے۔ اور وہ تھقبے لگا کر ہنسنے لگا۔

”ٹھہر تو سہی تیری خبر لیتا ہوں“ میں نے یہ کہہ کر آگے قدم بڑھایا اور اسے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ گھبرا کر بھاگ اٹھا۔ چھلائیں لگاتا، مٹر کی بیلوں کو لٹاٹا ایک ہی سانس میں تیس قدم دور نکل گیا۔ اس نے مٹر کی میری طرف دیکھا اور زور زور سے تھقبے لگانے لگا۔ میں نے غصے سے اسے کہا: ”آؤ تو خبر پڑے۔“

پھر دوبارہ ”ملا، ملا،“ کہہ کر اس نے مزید چڑایا۔

آخر کار تنگ آ کر ایک دن میں نے اسے طمانچہ مارا۔ پہلے تو وہ حیران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی ٹھوڑی میں تھوڑی سی جنبش ہوئی۔ ہونٹ باہر نکلے اور وہ زور زور سے رونے لگا۔ میں نے اسے پہلے بھی لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ اگر

اسے کوئی مارتا تھا تو یہ بھی گالیاں دیتا تھا۔ اور دور بھاگ کر پتھر بھی مارتا تھا۔ مجھے نہ تو اس نے گالیاں دیں، نہ ہی بھاگا، دوڑا۔ بس کھڑا ہو کر روتا رہا۔ میں نے کچھ دیر بٹھہر کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنا منہ کہنی کے اوٹ میں چھپا دیا۔ میرے دل میں بھی ہوا کہ کاش مجھ سے بھی لڑے جھگڑے، بھاگے اور پتھر مارے!

دوسرے دن پھر وہی سلسلہ۔ میں باہر نکلا اور خمیسے نے چیخ ماری، ”اوائے ملا!“ اور بھاگ دوڑا۔ پتا نہیں اس کو ملا سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ دوپہر کے وقت میں خمیسے کے گھر کے پاس سے گزرا۔ وہ ٹوٹی چار پائی پر دھوپ میں پرانی رلی (چادر) تلے لیٹا ہوا پڑا تھا۔ اس کی ماں نے گوبر نکالتے ہوئے کہا۔ ”مولیٰ لے کر لوٹا ہے، بغیر روٹی کھائے بیمار ہو کر گرا ہے۔ اسے پچھلے مہینے سے ہر دوسرے دن بخار آتا تھا۔ ملا نورل سے اسے دھاگا بھی بندھوایا تھا۔“ میں نے بھی رلی اٹھا کر دیکھا اسی پچھلے کوٹ میں ننگے پاؤں خمیسہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا کالا رنگ مزید کالا ہو گیا تھا۔ آنکھیں لال اور سر اتنا گرم جیسے آگ۔

اس کے کھلے ہوئے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور اس کے سفید خوبصورت دانت ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ میری چیخ نکل گئی۔ اس کی ماں دوڑ کر آئی۔

اس کے باپ کو بلایا گیا۔ ہسپتال چھ میل دور تھا۔ ڈاکٹر فیس بھی لیتا تھا۔ لڑکا چند لمحوں کا مہمان تھا۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے اوپر ڈالا۔ کتنی ہمدردی!

خمیسے کو ملاں نے غسل دیا۔ میلا کوٹ اتار کر نیا کپڑا لپیٹا اور عطر بھی لگایا۔ اس کے چھوٹے دانت ابھی تک ٹھنڈکی شکایت کر رہے تھے۔ اسے سیدھا کر کے چار پائی پر لٹایا گیا۔ سب نے قطار باندھی اور ملا نے اللہ اکبر کہا۔ میرے والا کوٹ ملاں نے اٹھایا۔ دوسرے دن خمیسے کا چھوٹا بھائی مہربیل لیے کھڑا تھا۔ اسے وہی خمیسے والا کوٹ پڑا تھا۔



دُر محمد کاسی / اسماعیل گوہر

خانہ بدوش

[معاصر پشتو افسانے کا معتبر اور اہم نام: دُر محمد کاسی ۱۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے پشتو افسانوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ (۱) خدائے یو مالگے تروے (۲) دُر شل (۳) پوسٹ مارٹم۔]

ڈیورنڈ لائن کے اس پار ایک وسیع و عریض ویرانے میں خانہ بدوشوں کے چند خیمے نصب ہیں۔ اس قافلے کے تمام مردوں کی تعداد پینتیس یا چالیس ہے اور اتنی ہی تعداد میں خواتین بھی ہمراہ ہیں۔ ان کے مال و متاع میں پانچ گھوڑے، دس بارہ گدھے، بیس اونٹ اور سیکڑوں بھیڑ بکریاں شامل ہیں۔ قافلے نے تین دن پہلے اس ویرانے میں پانی کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا۔ وہ بہت لمبی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ بچے، مرد اور عورتیں سبھی بہت تھک گئے تھے۔ اب تین دن کے آرام کے بعد انہوں نے ڈیورنڈ لائن عبور کر کے اس جانب آنے کا ارادہ کیا ہے۔ قافلے کا سردار وہاب خان ہے۔ اس کی بیوی جس کے بال سفید ہیں، چھ جوان بیٹے اور تین بیٹیاں بھی اس کے ہمراہ ہیں۔ اس کے بڑے بیٹے واحد خان کی بیوی امید سے ہے اور ان ہی ایام میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہونے کا امکان ہے اور اسی وجہ سے وہاب خان کی بوڑھی بیوی چاہتی ہے کہ بچے کی پیدائش کی امید میں چند دن مزید اسی مقام پر قیام کیا جائے۔ لیکن وہاب خان چاہتا ہے کہ جلد آ ز جلد آگے کا سفر اختیار کیا جائے کیونکہ اسے معلوم ہوا ہے کہ انگریز اس سرحد کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں اس بیابان میں جانوروں کی خوراک کی کمی بڑا مسئلہ ہوگا۔ اسی سبب سے وہاب خان اپنے خیمے میں بہت فکر مند بیٹھا ہے۔ اس کی بیوی شین خالی تو بے پر خاص بیٹھا پر اٹھا پکا رہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سوچوں میں ڈوبے ہوئے اپنے شوہر کو بھی بغور دیکھ رہی ہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے پوچھتی ہے: کس فکر میں ڈوبے ہوئے ہو؟ تیرا قافلہ صحیح سالم یہیں موجود ہے۔ ڈاکو لوٹ کر نہیں لے گئے۔ وہاب خان شین خالی اور تو بے پر پر اٹھے پر ایک ساتھ گہری نظر ڈالتا ہے اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے۔ ارے شین خالی تجھے کیا معلوم کی سرداری بھی کتنا بڑا بوجھ ہے۔ اس پورے قافلے اور جانوروں کی فکر مجھے لاحق ہے۔ سوچتا ہوں اگر ان قابض گروں نے راستہ نہ دیا تو کیا کروں گا؟

خیر ہے۔ خیر ہے آسمان گر نہیں جائے گا۔ واپس پلکتیا چلے جائیں گے۔ لیکن دو تین دن یہاں سے کوچ نہیں کرنا۔ ایک بار خدا مجھے پوتے کی پیاری شکل دکھا دے پھر تیری مرضی۔ شین خالی نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کر ڈالیں۔ وہاب خان نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا: یہی بات تو میں کر رہا ہوں کہ تجھے نہیں معلوم کہ سرداری کسے کہتے ہیں۔ اگر میرے ہمراہیوں کے جانور بھوک اور بیماری کے باعث مر گئے تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ان سے کیا کہوں گا کہ میرا شاہ زادہ پوتا جنم لینے والا ہے اور اسی سبب

سے میں ایک نامعلوم وقت تک اس منحوس بیاباں میں بیٹھا ہوں۔ ٹونہیں سمجھتی شین خالی ٹونہیں سمجھتی۔ میرے لیے طعنے نہ بنا اور خیر سے کل صبح کوچ کرنے کی تیاری کر۔ شین خالی نے توے پر سے پراٹھا ٹاٹ کے دسترخوان پر ڈال دیا اور پرتھکن انداز میں کہا: تو کل برخدا۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ: چوراگر چوری کی عادت نہیں بدلتا تو اس کے ساتھی کو اپنی عادت بدل دینی چاہیے۔

دُر دُر منحوس کتیا! ارے تُو دیکھ رہا ہے اس کتیا کو۔ ابھی دسترخوان سے روٹی اٹھالے جائے

گی۔ وہاب خان نے اپنی کھوٹی سے کتیا کو ایک ضرب لگائی تو وہ چیختی ہوئی خیمے سے باہر بھاگ گئی۔ تجھے کیا معلوم کہ تیرا پوتا دو تین دن میں آ رہا ہے۔ قدرت کے کاموں میں ہاتھ نہ مار، کوچ کی تیاری کر۔ میں جا کر دیگر لوگوں کو بھی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہاب خان بہت فکر مند اور پرتھکن انداز میں خیمے سے باہر نکلا۔ اور شین خالی نے خیمے کی چیزیں سمینا شروع کر دیا۔ اتنے میں اس کی بہو کبوتری خیمے میں آئی۔ شین خالی کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھ کر سمجھ گئی کہ کل صبح کوچ کرنے کی تیاری ہے۔ اسی لیے پوچھا: ماں جی! میرے خیال میں باباجی نے بات نہیں مانی۔ شین خالی نے پہلے غور سے اپنی بہو کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پیٹ پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت بھری آواز میں کہا: یہ ہمارے مرد ہم عورتوں سے بس اپنی اولاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو تین کیا میں نے تو آٹھ بچوں کو جنم دیا ہے۔ تیرا پہلا بچہ ہے۔ ان مردوں کو نہ ہمارے درد کی خبر ہے اور نہ ہماری بات سنتے ہیں۔ تُو بیٹھ روٹی کھالے میں یہ سامان سمیٹ لوں۔

صبح سویرے سورج طلوع ہونے سے قبل ہی خیمے اٹھالیے گئے۔ اونٹوں کی گھنٹیوں اور بھیڑ بکریوں کے میانے سے اس وسیع بیاباں میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ واحد خان نے اپنے خوبصورت اونٹ پر کجاوہ باندھا اور اپنی بیوی کبوتری کو بہت ناز اور احتیاط سے اونٹ پر بٹھایا۔ اور اونٹ کو ایسا اشارہ دیا کہ وہ بھی بہت احتیاط سے کھڑا ہو جائے۔ ایسا لگتا تھا کہ اونٹ کو بھی علم ہے کہ اس کی ناز میں سواری کوئی معمولی سواری نہیں ہے۔ اونٹوں کا یہ قافلہ ایک قطار میں ڈیورنڈ لائن کی سمت چل پڑا۔ گدھوں پر خیموں کا سامان، نئے جنم لینے والے بکریوں کے بچے، چار پانچ مرغیاں اور دو پلے بھی احتیاط سے باندھے گئے۔ ضعیف و کمزور مرد اور خواتین اونٹوں پر سوار تھیں۔ اور جوان پیدل ہی اس قافلے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ ساتھ سورج نکلنے سے پہلے عازم سفر ہوئے۔ خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ سہ پہر کے وقت ڈیورنڈ لائن کی حدود میں پہنچا۔ وہاں ایک نئی تعمیر شدہ سرحدی چوکی میں متعین انگریز سپاہیوں نے ان کا راستہ روکا۔ وہاب خان اپنے اونٹ سے اتر کر ان کے پاس آیا۔ خیر تو ہے کیا بات ہے؟ آپ نے کیوں ہمارا راستہ روکا؟ وہاب خان نے انگریز کپتان سے پوچھا۔ کپتان نے متکبرانہ انداز میں اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہاب خان سے ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا: یہاں آپ کا ملک ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا ملک شروع ہوتا ہے۔ اپنا قافلہ موڑ لو اور واپس اپنے ملک کا رخ کرو۔ آپ یہاں نہیں آسکتے۔ وہاب خان نے بہت زور لگایا۔ بڑی بحث کی کہ یہ سارا ہمارا ملک ہے۔ آپ نے ایک جھوٹی لکیر کھینچ لی اور اس کو سرحد کا نام دے دیا۔ لکیریں کھینچنے سے قوم اور ملک کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم خانہ بدوش ہیں اور صدیوں سے اسی راستے سے بہار میں شمال کی طرف

اور خزاں میں جنوب کی طرف سفر کرتے ہیں۔ یہی ہماری زندگی ہے۔ آج تک کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ وہاب خان کی ان باتوں سے انگریز کپتان غصے سے لال پیلا ہو گیا اور کہا: تیری یہ جرأت کہ ہم کو سیاست سکھا رہا ہے۔ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ایک بھی زندہ بچ نہ پاؤ گے۔ انگریز کے اس رویے پر قافلے کے نوجوانوں کو بھی غصہ آیا اور انگریز سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم ضرور آگے جائیں گے۔ تو ہمارا راستہ روک نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر وہ اکٹھے آگے بڑھنے لگے۔ انگریز نے اپنے سپاہیوں کو فائر کھولنے کا حکم دیا۔ وہاب خان نے اپنے جوانوں کو مورچہ لینے کی ہدایت کی۔ دونوں جانب سے بے تحاشا فائرنگ ہوئی۔ عورتوں کو اونٹوں سے اترنے اور فائرنگ سے آڑ لینے کی مہلت نہ ملی۔ دشمن کی ایک بے رحم گولی کبوتری کے سینے میں پیوست ہو گئی جو ابھی تک اونٹ کے کجاوے میں بیٹھی تھی۔ اس کے منہ سے شیخ نکلی۔۔۔ ماں اوئے ماں اور اس کے ساتھ ہی اونٹ پر سے گر پڑی۔ ماں سب کچھ بھول کر اس کی طرف دوڑی۔ اس کا سراپنی گود میں رکھا اور پوچھا۔ کبوتری تجھے گولی لگ گئی؟ خدا ان قبضہ گروں کے ہاتھ توڑ ڈالے۔ کبوتری نے سسکیاں بھرتے ہوئے ماں جی سے کہا: میں مر رہی ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا میرے پیٹ میں یہ ننھا بچہ بھی مر جائے۔ جلدی کر چھری اٹھا، میرا پیٹ پھاڑ دے اور اس بچے کو بچالے۔ ہر چند کہ ماں جی اس کو سمجھا رہی تھی کہ تو نہیں مر رہی، اللہ خیر کرے گا۔ میں تیرا پیٹ نہیں پھاڑ سکتی۔ نہیں میں ایسا ظلم نہیں کر سکتی لیکن وہ نزع کے آخری لمحات تک کہتی رہی کہ ماں جی اگر میں مر گئی تو یہ ننھا بچہ زندہ نہیں بچ سکے گا۔ وقت ختم ہو رہا ہے۔ تو ہمت کر۔ آنکھیں بند کر اور میرا یہ بچہ پیٹ سے نکال لے۔ جب یہ بڑا ہو جائے تو پھر اس کو بتانا کہ تو نے کس طرح جنم لیا۔ تیرے ماں باپ کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ اگر اس میں غیرت ہوئی تو یہ ضرور اپنے ملک کو قبضہ گروں سے آزاد کرانے گا۔ شین خالی نے آنکھیں بند کر لیں اور کبوتری کا آپریشن کر ڈالا۔ اس کے پیٹ سے شیر خان کو نکال باہر کیا۔ ماں نے آخری دیدار کے لیے آنکھیں کھولیں۔ اپنی تمام تر توانائی مجتمع کر کے شیر خان کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسی کے ساتھ کبوتری کی روح نے آخری پرواز کی اور ڈیورنڈ لائن کو توڑ ڈالا۔

شیر خان نے ابتدائے جوانی سے ہی اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور حصول آزادی کی خاطر سیکڑوں انگریز افسروں اور سپاہیوں کو واصل جہنم کیا۔ اس کی جدوجہد میں ہر جگہ اور ہر وقت آزادی کی علامت ”کبوتری“ اس کے ہمراہ تھی۔



اکتاویو پاز / رضا المصطفیٰ ترک

اکتاویو پاز کی نظمیں

[اکتاویو پاز (۱۹۱۴ء-۱۹۹۸ء) میں میکسیکو میں پیدا ہوا۔ تدریس ادب کے شعبہ سے وابستہ رہا۔ ہندوستان اور فرانس میں اپنے ملک کے سفارشات کار کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۹۰ء میں اکتاویو پاز کو ملنے والا نوبل پرائز (برائے ادب) اس کی شعری صلاحیتوں کا قراری اعتبار تھا۔ معاصر تنقید نے اسے ”میسویں صدی کا بڑا ذہن اور عظیم تہذیبی مظہر“ کہہ کر سراہا۔ اس کی نظموں نے اسے ”حرفِ تحسین سے ماوراء شاعر“ کہلایا اور اس کی تنقیدی تحریروں نے اس کی شناخت ”تنقید سے بالاتر نقاد“ کے بطور کروائی۔

اکتاویو پاز کی شعری کائنات، جدید عہد کے منظر نامے کے مشاہداتی تعق اور نفسیاتی و مابعد نفسیاتی اثرات پر محیط ہے۔ اس کی نظموں میں انسان کی بحیثیت فرد اپنی بے بضاعتی، تنہائی، بے چارگی، اپنی شناخت سے محرومی جیسے المیوں سے لے کر وقتی خوشی و مسرت، لمحاتی آسودگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی آسائشوں اور مادی تھمیلات سے جڑی ہوئی سرشاری تک سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کی شاعری کا سروکار انسان کے گرد و پیش لمحہ لمحہ رنگ بدلتی دنیائے دوں ہی سے نہیں بلکہ فرد کے اندرون برپا ساری اٹھل پٹھل سے بھی ہے۔ زرداء، والٹ و ہٹ مین اور رلکے کی طرح اکتاویو پاز کی شاعری بھی محض اپنے مقامی ادبی تناظر تک محدود نہیں بلکہ اس میں بجا طور پر وہ جوہر موجود ہے جو عالمی شعریات میں معتد بہ اضافے کا موجب بنا کرتا ہے۔ ذیل میں دی گئی نظمیں، اس کی منتخبہ نظموں کا اردو قالب ہیں۔ ضیا المصطفیٰ ترک]

کہاوتیں، ضرب الامثال

گندم کی بالیوں کا ایک گٹھا بھی گندم کا پورا کھیت ہے
ایک پر بھی ایک پرندہ ہے، جیتا جاگتا پرندہ، چھپھاتا ہوا
گوشت پوست کا آدمی بھی خواب میں دکھائی دینے والا آدمی ہے
سچ کو توڑا مروڑا نہیں جاسکتا (یہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، ایک اکائی کی طرح ناقابل تقسیم)
بادلوں کا گر جتنا، بجلی کی کڑک کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے
خواب دیکھتی ہوئی عورت ہمارے لیے محبت کا ایک دائمی نقش ہے
درخت سویا ہوا ہوتا ہے ساری سبز بشارتیں بیان کر دیتا ہے
پانی مسلسل بولتا رہتا ہے لیکن ایک بھی لفظ دُہراتا نہیں
حتمی طور پر کچھ بھی طے نہیں کیا جاسکتا

پُر یقین ساکت پوٹوں کی شہادت کے سوا، نیند کی بابت
ایک زبان کے مسلسل چلنے کے سوا، بیانیے کے باب میں

کسی عورت کا زندگی کے لیے منہ زبانی اقرار ایسا ہی ہے
جیسے

کسی آسمانی پرندے کا (آہستگی سے) پر پھیلا دینا

لوک داستان

آگ اور ہوا کا عرصہ حیات

پانی کی سرشوری و سیرابی کا عہد جوانی

سبز رنگت کے زرد پڑنے تک

اور زرد کے سرخ ہو جانے تک

خواب دیکھنے سے عمل پیرا ہونے کے مابین

خوابش سے بیداری تک

صرف ایک قدم اٹھانے کی دیر تھی

اور سب کچھ از خود ہوتا چلا گیا کسی کوشش کے بغیر

ان دنوں یہ حشرات، بیش قیمت پتھروں کی طرح تھے

گرمی، تالاب کے کنارے سستانے کے لیے لیٹی ہوئی تھی

بارش بید مجنوں کی شاخوں اور ٹہنیوں میں کہیں کہیں معلق تھی

تمھاری تھیلی پر بھی ایک ویسا ہی درخت اُگنے کو تھا

اور جب وہ پوری طرح اُگ آ یا تو اس نے ہنسے ہنستے کئی پیشین گوئیاں کر ڈالیں

اس نے ایسا طلسم پھونکا جس نے فضا میں چاروں طرف اپنے پر پھیلا دیے

اس اثنا میں سادہ ترین معجزہ

وہ پرندے تھے جو فضاؤں میں اُڑتے پھرتے تھے

ساری چیزیں باہم ایک دوسرے سے وابستہ تھیں

ایک دوجے سے جڑی ہوئی اور یکجان

کوئی بھی شے، کچھ بھی کہلا سکتی تھی

صرف ایک لفظ تھا جو اپنے متضاد کے بغیر پوری شدت سے قائم تھا

سورج کی طرح کا ایک لفظ
اور ایک دن وہ کسی دھماکے سے پھٹا
اور چھوٹے چھوٹے باریک ریزوں میں تقسیم ہو گیا
یہ ریزے

وہ لفظ تھے ہماری زبان کے، جو ہم بولتے تھے
یہ نوکیلے ٹکڑے اسی آئنے کے ہیں
جس میں دنیا خود کو دیکھتی ہے
ٹکڑے ٹکڑے اور ذبح شدہ

بغیر کسی عنوان کے

ایک عورت، جس کی بدن بولی کسی دریا کی سی ہے
بار بار جنبش میں آتے نسوانی اعضا کی شفافیت
جیسے

پانی سے بنی ہوئی ایک لڑکی
جہاں اس لمحہ موجود کو پڑھا جاسکتا ہے، جو غیر مبدل ہے
وہ تھوڑا سا پانی پیا بھی جاسکتا ہے
جس میں اس لڑکی کی آنکھیں ہیں
اور وہ ہونٹ،

جن کا گھونٹ بھرا جاسکتا ہے
یہ درخت، یہ بادل، یہ چراغ
یہ لڑکی اور میں



سارا شگفتہ رزا ہد حسن

مائے ری!

مائے ری!

تیرے کھلونے میرے جتنے بڑے ہو گئے

اب ہم کون سا کڈا، گڑیا جلائیں گے

کہ بارش برس پڑے

تیرے پڑوس میں رہتے ہوئے

خود دھوپ میں آگ لگ گئی

لیکن سورج کا پہرہ دھوپ ہے

میں تیری لکیر ہوں

تجھے نقش کروں گی

مائے ری!

تیرے درد نے اتنی اکیلی بیٹی کو جنم دیا

کہ تو خود اکیلی رہ گئی



بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

(وفیات پاکستانی اردو اہل قلم ۲۰۱۷ء)

موت کا سفر جاری ہے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی اردو ادب کے کئی اہم لکھنے والے ہم سے جدا ہو گئے۔ ذیل میں ایسے پاکستانی اہل قلم کے مختصر کوائف اور تاریخ ہائے ولادت و وفات دی جا رہی ہے جنہوں نے بنیادی طور پر اردو میں لکھا اور خوبصورت تحریروں کی شکل میں اپنی یادیں چھوڑ گئے۔

احمد جاوید

اردو کے ممتاز افسانہ نگار دانشور ماہر تعلیم

افسانوی کتب: غیر علامتی کہانی (۱۹۹۳ء)۔ چٹیا گھر (۱۹۹۶ء)

رات کی کہانی۔ تیسری دنیا

گم شدہ شہر کی داستان (۲۰۰۲ء)

ولادت	۲۲ اپریل ۱۹۴۸ء، ٹنگ	وفات	۵ اپریل ۲۰۱۷ء، اسلام آباد
تدفین	ایچ ایون، اسلام آباد	ماخذ	نوائے وقت راولپنڈی ۶ اپریل ۲۰۱۷ء

احمد جاوید جیلانی

اردو کے مزاحیہ مصنف، وکیل، دانشور سماجی کارکن، سابق نائب صدر و صدر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور۔ چیئر مین سبزہ زار ویلفیئر فائڈیشن۔ ان کی کتاب ”تصویر شوہر“ کی ظفر علی راجا نے ڈرامائی تشکیل کی جو ”بور کے لڈو“ کے نام سے پی ٹی وی پر بطور ڈرامہ سیریز نشر ہوئی۔

کتب: تصویر شوہر (۵۵ شوہروں کی قلمی تصاویر: ۱۹۸۶ء)

تصویر بگم۔ تصویر دوست (۱۹۹۳ء)

ولدیت: خورشید انور جیلانی ایڈووکیٹ (شاعر و ادیب)

مترجم: مثنوی مولانا روم و رباعیات خیام

وفات	۲۰ ستمبر ۲۰۱۷ء، لاہور	تدفین	سبزہ زار لاہور
ماخذ	نوائے وقت راولپنڈی ۲۱ ستمبر ۲۰۱۷ء	نوائے وقت	۲۴ ستمبر ۲۰۱۷ء (کالم ظفر علی راجا)

احمد صغیر صدیقی

ممتاز شاعر و ادیب، افسانہ نگار، مترجم، نقاد۔ دو ہزار سے زیادہ غیر ملکی کہانیوں کا اردو ترجمہ کیا۔ نفسیات اور پراسرار علوم پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ پاک و ہند کے متعدد رسائل و جرائد میں ان کی تحریریں چھپتی رہیں۔ کراچی کے رہنے والے تھے۔

شعری کتب: سمندری آنکھیں (۱۹۷۲ء) کاسی گلوش درپے (۱۹۸۲ء)

ثبات-----۲۵۸

اطراف (۱۹۸۷ء) لحوں کی گنتی (۲۰۰۱ء)

تنقیدی کتب گوشے اور جالے (مضامین: ۲۰۰۳ء) تجربہ (۲۰۰۶ء)

انتخاب ادھ کھلی کھڑکیاں (افسانے: ۲۰۰۶ء)

اردو تراجم دنیا کی بہترین کہانیاں۔ دنیا کی مختصر بہترین کہانیاں دنیا کی بہترین عجیب کہانیاں۔

دنیا کی بہترین آسیب کہانیاں۔

ولادت ۱۹۳۸ء یوپی وفات ۱۲/ستمبر ۲۰۱۷ء امریکہ

تدفین امریکہ ماخذ نوائے وقت ۱۳/ستمبر ۲۰۱۷ء

اہل قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۰ء۔ تفکر ڈاٹ کام

ادیب سہیل (سید محمد ظہور الحق)

ممتاز ادیب، شاعر، ماہنامہ قومی زبان کراچی کے سابق مدیر۔ سابق نائب مدیر ماہنامہ افکار کراچی

شعری کتب بکھراؤ کا حرف آخر۔ کچھ ایسی نظمیں ہوتی ہیں۔

غم زمانہ بھی سہل گزرا (منظوم خودنوشت)

نثری کتب رنگ ترنگ

ولادت ۱۸/جون ۱۹۲۷ء چوارہ ضلع موئگیر (بہار) وفات ۸/مارچ ۲۰۱۷ء

تدفین گلشن اقبال، کراچی ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۹/مارچ ۲۰۱۷ء

انیس شاہ جیلانی

اردو کے صاحب طرز ادیب، خاکہ نگار، کتاب دوست۔ ان کے والد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں ایک لائبریری کی بنیاد رکھی جسے انھوں نے

”مبارک لائبریری“ کے نام سے توسیع دی۔

کتب آدمی غنیمت ہے (خاکے) انتر انتر آدمی (خاکے)، سفر نامہ مقبوضہ ہندوستان۔

خط تمینہ راجہ کے۔

ولدیت مبارک شاہ جیلانی

ولادت اکتوبر ۱۹۳۷ء وفات ۲۶/جون ۲۰۱۷ء محمد پور

تدفین سنجہ پور نزد محمد پور تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خاں

ایم اے راحت (مرغوب احمد)

اردو کے نامور ادیب، افسانہ و ناول نگار، عمران سیریز سمیت ۵۰۰ سے زیادہ ناول اور ۶۰۰۰ افسانے لکھے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع

ہوتے رہے۔ نام گنیوبک میں شامل ہے۔

ناول عمران سیریز۔ صدیوں کا بیٹا۔ کاکا دیوی۔ جن زادہ۔ کالا جادو۔

نروان کی تلاش۔ کند۔ شلیس۔ مقدس نشان۔ سو سال پہلے۔ سایہ۔
ناگ دیوتا۔ پارس۔ صندل کا تابوت۔ جھرنے۔ کالے گھاٹ والی۔
کفن پوش۔ شہر وحشت۔ کالے راستے۔

ڈرامہ سیریز: اعتراف (پی ٹی وی)

ولادت علی گڑھ

وفات ۲۴ اپریل ۲۰۱۷ء لاہور

تدفین کریم بلاک، علامہ قبال ٹاؤن، لاہور

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۲۵/اپریل ۲۰۱۷ء

بانو قدسیہ

اردو کی نامور ادیبہ، ناول، افسانہ و ڈرامہ نگار، اردو کے نامور ادیب اشفاق احمد کی اہلیہ محترمہ

ناول راجہ گدھ۔ حاصل گھاٹ۔ شہر لاہور، آباد ویرانے۔ موم کی گلیاں

شہر بے مثال

ناولٹ چہار چہن (چار ناولٹ)۔ ایک دن۔ پروا۔

افسانوی مجموعے: بازگشت۔ امرتیل۔ کچھ اور نہیں۔ ہجرتوں کے درمیاں۔

آتش زیر پا۔ دست بستہ۔ دوسرا دروازہ۔ سامان وجود۔

توجہ کی طالب۔ ناقابل ذکر۔

ڈرامے چھوٹا شہر بڑے لوگ۔ پھر اچانک یوں ہوا۔ لگن اپنی اپنی۔

فٹ پاتھ کی گھاس۔ سدھراں۔ تمثیل۔ سورج کبھی۔ آسے پاسے۔

پیانام کا دیا۔ دوسرا قدم۔ آدھی بات۔ حوا کے نام

سوانح راہ رواں۔ مرد و برہنہ (قدرت اللہ شہاب)

ولادت ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء، فیروز پور (مشرقی پنجاب)

وفات ۴ فروری ۲۰۱۷ء لاہور

تدفین ماڈل ٹاؤن، لاہور (شوہر نامدار کے ساتھ)

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۵/فروری ۲۰۱۷ء

بانو قدسیہ: شخصیت اور فن

تصدق سہیل (تصدق حسین)

ممتاز مصور و اردو افسانہ نگار ۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۱ء تک لندن میں مقیم رہے۔

افسانوی مجموعہ: تنہائی کا سفر

ولادت ۱۹۳۰ء جالندھر
وفات ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء کراچی
تدفین ڈی ایچ اے فیروز قبرستان، کراچی
ماخذ ڈان ۳ اکتوبر ۲۰۱۷ء

توحید احمد

سابق سفیر پاکستان، مصنف، مترجم، دانشور۔ بانی مرکز برائے السنہ علوم ترجمہ جامعہ گجرات۔ سابق رکن پنجاب پبلک سروس کمیشن کتب علوم ترجمہ (انگریزی سے اردو ترجمہ)

ولادت ۱۹۴۷ء لاہور
وفات ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء لاہور
تدفین ڈیفنس لاہور
ماخذ فیس بک شیخ عبدالرشید (جامعہ گجرات)

جہانگیر تمیمی، پروفیسر ڈاکٹر محمد

ممتاز ماہر تعلیم، جنوبی ایشیائی امور کے ماہر، مصنف، محقق، اقبال شناس، دانشور، صحافی۔ پنجاب یونیورسٹی کے سنٹر فار سائٹھ ایشین سٹڈیز میں ۲۸ برس خدمات انجام دیں (سینئر ریسرچ فیلو سے پروفیسر تک)۔ بطور صحافی روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ہفت روزہ زندگی، لاہور روزنامہ جسارت ملتان اور کوہستان لاہور سے وابستہ رہے۔

کتب جنوبی ایشیاء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی موسیقی (۲۰۰۵ء)۔
جنوبی ایشیاء میں دین و فقر اور سماج (۲۰۰۵ء)
اقبال: صاحبِ حال (۲۰۰۸ء)۔

زوال سے اقبال تک: قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر (۲۰۰۸ء)

ولدیت محمد وریام تمیمی
ولادت ۵ مئی ۱۹۳۹ء چنیوٹ
وفات ۲۷ اپریل ۲۰۱۷ء لاہور
تدفین قبرستان جامعہ پنجاب لاہور
ماخذ نوائے وقت ۲۸ اپریل ۲۰۱۷ء
سی وی ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

حسن اکبر کمال

ممتاز اردو شاعر، نقاد و ماہر تعلیم
شعری کتب سخن۔ خزاں میرا موسم۔ خوشبو جیسی بات کرو۔ التجا (حمد و نعت)

تنقیدی تصنیف: کمال کے مضامین

ولادت ۱۴ فروری ۱۹۴۶ء آگرہ

وفات ۲۱ جولائی ۲۰۱۷ء کراچی

تدفین کراچی

ماخذ فیس بک عقیل عباس جعفری

رخسانہ نور

ممتاز شاعرہ وادیہ ناول نگار، فلمی کہانی نویس، نوائے وقت کی کالم نگار۔ مشہور فلموں چوڑیاں، جھومر، مجاہد، لڑکی پنجابن، دوپٹہ جل رہا ہے، مہندی

والے ہتھ اور سنگم کی کہانیاں اور گیت لکھے۔

شعری مجموعہ آپیار دل میں جگا (گیت)

ممتاز فلم ساز و ڈائریکٹر سیٹھ نور کی اہلیہ

ولادت ۱۹۵۶ء سیالکوٹ

وفات ۱۲ جنوری ۲۰۱۷ء لاہور

تدفین لاہور

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۱۳ جنوری ۲۰۱۷ء

ریاض حسین چودھری

نعت اور غزل کے ممتاز گوشتاعر

شعری کتب خون رگ جاں۔ زیرِ معتبر۔ رزقِ ثناء۔ متاعِ قلم۔ تمنائے حضوری۔

سکھول آرزو۔ سلامِ ملک۔ خلدِ سخن۔ آبروئے ما۔ زم زمِ عشق۔

طلوع فجر۔ غزل کا سہ بکف۔ تحدیثِ نعمت

ولدیت چودھری فضل دین

ولادت ۱۹۴۲ء سیالکوٹ

وفات ۶ اگست ۲۰۱۷ء سیالکوٹ

تدفین قبرستان سورج پور، سیالکوٹ

ماخذ معلومات از جناب طاہر پوری

سلیم فاروقی

معروف اردو ادیب، کہانی و ناول نگار۔ سابق ایڈیٹر ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں بھی لکھتے رہے۔

ناول دولت کی سولی۔ دہشت گرد۔ بلیک وارنٹ

سکوتِ مرگ۔ اونچی اڑان۔

وفات ۵/ جنوری ۲۰۱۷ء کراچی
تدفین کراچی
ماخذ فیس بک پرویز بلگرامی

شاہد چودھری ڈاکٹر (غلام نبی)

اردو پنجابی و فارسی کے ممتاز مصنف، مترجم، محقق، ماہر تعلیم۔

بانی شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی۔ ۱۹۷۷ء میں تہران یونیورسٹی سے ”روابط زبان ہائے فارسی و پنجابی“ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایرانی خاتون سے شادی کر کے وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ انقلاب ایران کے بعد تہران یونیورسٹی میں شعبہ اردو از سر نو فعال کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ۱۹۹۱ تا ۱۹۹۳ء وہاں تدریس کی۔ بعد میں پڑھشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران سے وابستہ رہے۔

کتب فرہنگ واثرہای فارسی در اردو۔

مناقب حضرت علی در شبہ قارہ۔ دستور کامل و

آموزش زبان اردو برای فارسی زبانان

فارسی تراجم در شناخت فردوسی (”فردوسی پر چار مقالے“ از حافظ محمود شیرانی)

تاریخ ادب فارسی در پاکستان (”پاکستان میں فارسی ادب“ از ڈاکٹر ظہور الدین احمد)

اردو تراجم اسلام اور قرآن (فارسی خطبات حسین علی راشد)

اسلام میں شیعہ (فارسی از محمد حسین طباطبائی)

ولدیت چراغ دین

ولادت ۶/ جون ۱۹۴۲ء ضلع سرگودھا

وفات یکم اکتوبر ۲۰۱۷ء تہران

تدفین قبرستان بہشت زہرا، تہران

ماخذ معلومات از ڈاکٹر عارف نوشاہی

شریف احسن، حکیم محمد

پاکیزہ دواخانہ فیصل آباد کے ممتاز طبیب، نعت گو شاعر، ادیب، مترجم۔ مولانا مودودی کے قدیم ساتھی اور جماعت اسلامی کے تاسیسی ارکان میں سے آخری رکن۔ بعد ازاں تحریک اسلامی کے ساتھ وابستہ رہے۔

مجموعہ نعت عہدہ و رسولہ

اردو ترجمہ اسلام کا نظام حقوق و فرائض

ولادت ۱۹۲۵ء

وفات ۲۲/ فروری ۲۰۱۷ء فیصل آباد

تدفین فیصل آباد

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۲۳ فروری ۲۰۱۷ء

شریف فاروق

ممتاز صحافی، مصنف، کارکن تحریک پاکستان

ایڈیٹر روزنامہ شہباز پشاور (۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۲ء)

سابق چیف رپورٹر روزنامہ نوائے وقت لاہور و ریڈیو نٹ ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی۔ بانی روزنامہ ”جہاں نما“ لاہور و روزنامہ ”جہاد“ پشاور

اعزاز صدیقی تمغہ برائے حسن کارکردگی

کتب قائد اعظم محمد علی جناح: برصغیر کا مردِ حریت

مادرِ ملت: سرمایہ ملت

وفات یکم جولائی ۲۰۱۷ء پشاور

تدفین گل بہار پشاور

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۲ جولائی ۲۰۱۷ء

طفیل کمال زئی

اردو و پنجابی شاعر و ادیب، افسانہ و کالم نگار، سابق مدیر ”واہ کارِ گھر“ واہ آرڈیننس فیکٹری

افسانوی مجموعے: سانچے دکھ۔ اچھے دنوں کا انتظار۔ اندر کا موسم۔

گراہوا آدمی۔ پس دیوار

وفات ۵ اپریل ۲۰۱۷ء واہ کینٹ

تدفین واہ کینٹ

ماخذ خبرنامہ اکادمی اسلام آباد اپریل تا جون ۲۰۱۷ء

عس مسلم ابوالامتیاز [عبدالستار]

اردو اور فارسی کے نامور شاعر و ادیب، عالم، محقق، دانشور، سفرنامہ نگار، سماجی کارکن۔ کارکن تحریک پاکستان۔ بانی مدیر ماہنامہ ”نیاراہی“ کراچی

(اجراء: ۱۹۵۷ء)

۵۰ سے زیادہ اردو، پنجابی و انگریزی کتب نظم و نثر کے خالق

کتب ایک ٹہنی کے پھول (افسانے: ۱۹۵۷ء)

اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (۱۹۶۱ء)

زبورِ نعت۔ اسماء اللہ علیہا السلام (منظوم)

واگال میں ول موڑ (پنجابی شاعری)

لحہ بہ زندگی (خودنوشت)

اعزاز صدارتی ایوارڈ
ولادت ۶/۶ اپریل ۱۹۲۲ء
وفات ۵/۵ مئی ۲۰۱۷ء دہلی
تدفین کراچی
ماخذ نوائے وقت میگزین ۲/ جولائی ۲۰۱۷ء
روزنامہ پاکستان ۱۱/ جون ۲۰۱۷ء

فردوس حیدر

ممتاز اردو افسانہ ناول ڈرامہ و سفرنامہ نگار مترجم۔
انڈس ٹی وی کے لئے پہلا سوپ آپیرا ”جال“ لکھا۔
رکن پاکستان آرٹس کونسل کراچی
کتب نقش قدم (ناولٹ: ۱۹۷۸ء)۔ مردم گزیدہ (ناولٹ: ۱۹۷۹ء)
رازداں (ناولٹ: ۱۹۷۹ء)۔ راستے میں شام (افسانے: ۱۹۸۲ء)
دائروں میں دائرے (سفرنامہ: ۱۹۸۵ء)
بارشوں کی آرزو (۱۹۸۸ء)
جادو دا پرندہ (چینی لوک کہانیوں کے پنجابی تراجم کا مجموعہ: ۱۹۸۹ء)
پتھر میری تلاش میں (۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء)
خالی ہوا بیل دل (۲۰۰۳ء)۔ قلم کا سفر (مضامین: ۲۰۰۰ء)
فردوس حیدر چاچو ند افسانہ (۲۰۰۰ء)
تاحال (چار افسانوی مجموعوں کا مجموعہ)

دختر خواجہ محمد منظور
ولادت ۵/نومبر ۱۹۳۰ء گوجرانوالہ
وفات ۱۸/جنوری ۲۰۱۷ء
تدفین لاہور
ماخذ فیس بک عقیل عباس جعفری
ایل قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۰ء

فرزانہ ناز

راولپنڈی اسلام آباد کی معروف شاعرہ۔ سیکرٹری جنرل ادبی تنظیم کسب کمال
مجموعہ کلام ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے (۲۰۱۷ء)

زوجہ اسماعیل بشیر
ولادت ۱۸ جنوری ۱۹۷۹ء بھلووال ضلع سرگودھا
وفات ۲۵ اپریل ۲۰۱۷ء اسلام آباد
تدفین صادق آباد راولپنڈی
ماخذ فیس بک علی یاسر وارشد معراج

گوہر ملسیانی، پروفیسر (میاں طفیل محمد)

ممتاز شاعر و ادیب، نعت گو شاعر، نقاد، تذکرہ نگار، ماہر تعلیم۔
بچوں کے لئے اسلامی و تاریخی مشاہیر پر متعدد کتب لکھیں۔
شعری کتب شوق شہادت زندہ ہے۔
مظہر نور (نعتیہ مجموعہ)۔ تیری شان جل جلالہ
جذبات شوق (حمد و نعت)۔ متاع شوق (حمد و نعت)۔
چشمہ رحمت۔ ارمغان شوق (حمد و نعت)۔ غم اعلیٰ۔
انتخاب کلام شکیل بدایونی۔ جلتی رتوں کی یاد (غزلیات)
آفتاب آگہی کا سلسلہ (غزلیات)
چمن زار حقائق (منظومات)۔ رعنائیاں۔
نثری کتب عصر حاضر کے نعت گو (تذکرہ)۔
اقبال، علامہ اقبال کیسے بنے؟۔ اقبال کی فکری جہتیں۔
مقالاتِ نعت۔ اصغر گوٹروی: شخصیت اور شاعر۔ کلام اقبال اور
سیرتِ ہادی ﷺ۔ تذکارِ انوارِ انبیاء علیہم السلام۔
حریم شریفین کی فضاؤں میں (سفر نامہ)

ولدیت چودھری صدر الدین
ولادت ۱۵ جولائی ۱۹۳۴ء ملسیان تحصیل کوڈر ضلع جالندھر
وفات ۲۵ فروری ۲۰۱۷ء خانیوال
تدفین خانیوال
ماخذ فیس بک سید صبح الدین صبح رحمانی

محمد علی چراغ

ممتاز ادیب، ڈرامہ نگار، محقق، ریسرچ آفیسر مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ سابق مدیر پندرہ ہونہار
لاہور، ماہنامہ تعلیم و تربیت لاہور و ماہنامہ کتاب لاہور۔ نیشنل بک کونسل آف پاکستان سے ریٹائر ہوئے۔ متعدد کتب کے مصنف، مؤلف، مترجم

کتب	پروپینڈا۔ سید الکوئین رحمۃ اللہ علیہ ۔ پاکستان منزل بہ منزل۔
	تاریخ پاکستان۔ قائد اعظم کے ماہِ وسال (۱۹۸۰ء)
	قرارداد پاکستان۔ تحریک پاکستان
	اکابرین تحریک پاکستان (۱۹۸۸ء)
	پاکستان: سیاست ریاست آئین اور تاریخ
	انسائیکلو پیڈیا مسلم شخصیات۔ انسائیکلو پیڈیا حکایاتِ رمی
اردو تراجم	محمد رسول اللہ (آر وی سی ہاؤس)۔ روح اسلام (جسٹس امیر علی)
	فتوح الغیب۔ کشف الحجب۔ معالیٰ الہم۔
شروح	شرح آیات باہو۔ شرح دیوان باہو
	شرح دیوان حضرت غوث الاعظم۔
ولدیت	حاجی چراغ دین (پنجابی قصہ گو شاعر)
ولادت	۱۴ فروری ۱۹۴۳ء کوٹ مراد خاں، قصور
وفات	۱۲ مئی ۲۰۱۷ء لاہور
تدفین	شاہ کمال قبرستان رحمان پورہ لاہور
ماخذ	dailypakistan.com.pk

مختار مسعود

نامور اردو ادیب و سول سرونٹ

☆ Eye Witness of History: A Collection

of Letters addressed to Quaid-i-Azam: Karachi (1968)

(۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۳ء خطوط اور چارٹری گرام)

آوازِ دوست (۱۹۷۳ء: دو طویل مضمون)

سفر نصیب (۱۹۸۱ء: سفر نامہ و خاکے)

لوح ایام (۱۹۹۶ء: یادداشتیں)

حرفِ شوق (۲۰۱۷ء: چار مضامین۔ بعد از مرگ)

ولدیت

پروفیسر شیخ عطاء اللہ

ولادت

۱۵ دسمبر ۱۹۲۶ء علی گڑھ

وفات

۱۵ اپریل ۲۰۱۷ء لاہور

تدفین

شادمان لاہور

ماخذ

نوائے وقت راولپنڈی ۱۶ اپریل ۲۰۱۷ء

مسعود کاظمی، سید

ملتان کے معروف شاعر و ادیب، صحافی، ماضی کے سٹوڈنٹ لیڈر
کتب آزادی (۱۸۴۷ء تا ۱۹۴۷ء) کی تحریک آزادی کا احوال اور کارکنان
تحریک پاکستان کے انٹرویوز
کیسا جشن بہار جاناں (قومی المیوں پر مرثیے)
دلستان ملتان (۱۹۵۵ء مرحوم قلم کاروں کا تذکرہ)

ولادت ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء ملتان

وفات ۲۱ اپریل ۲۰۱۷ء ملتان

تدفین ملتان

ماخذ فیس بک رضی الدین رضی

ظفر خان نیازی

ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے سابق اسٹیشن ڈائریکٹر، ممتاز اردو شاعر و افسانہ نگار
کتب چوکور پیسے۔ خوابشار۔ پیوند۔ برف پوش چینی
وفات ۲۵ نومبر ۲۰۱۷ء اسلام آباد
تدفین میڈیا ٹاؤن، اسلام آباد
ماخذ جنید آزر (بذریعہ فیس بک)

مشکور حسین یاد، پروفیسر

نامور اردو ادیب، شاعر، طنز و مزاح نگار، نقاد، ماہر تعلیم۔
سابق استاد اردو گورنمنٹ کالج لاہور۔ چیف ایڈیٹر ہفت روزہ پکار (۱۹۴۵ء)، ایڈیٹر ماہنامہ ’زعفران‘ لاہور و ماہنامہ ’چشمک‘ لاہور
اعزازات ستارہ امتیاز۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی
کتب: آزادی کے چراغ (آپ بیتی)

دشنام کے آئینے (طنزیہ مزاحیہ مضامین: ۱۹۷۵ء)، اپنی صورت آپ (طنزیہ مزاحیہ مضامین: ۱۹۷۷ء)

ستم ظریف (طنزیہ مزاحیہ مضامین: ۱۹۸۸ء)، بات کی اونچی ذات (انشائیے: ۱۹۸۹ء)

وقت کا استخارہ (انشائیے: ۱۹۹۹ء)، جو ہر اندیشہ (انشائیے: ۲۰۰۸ء)

اپنی صورت آپ۔ ستارے چمچھاتے ہیں، مطالعہ انیس کے نازک مراحل۔ میں اردو ہوں۔

غالب نکتہ جو۔ لاجول ولاقوۃ۔ ممکنات انشائیہ۔ انیس کی شاعرانہ بصیرت

مطالعہ دبیر۔ غالب کا جمالیاتی شعور۔ بوطیقا۔ کلام اقبال کے عوامی افق

شعری کتب الہو (حمروں کا مجموعہ: ۲۰۰۴ء)

برداشت (غزلوں کا مجموعہ: ۲۰۰۴ء)
 پرداخت (غزلوں کا مجموعہ: ۲۰۰۶ء)
 نگہداشت (غزلوں کا مجموعہ: ۲۰۰۷ء)
 عرضداشت (غزلوں کا مجموعہ: ۲۰۰۸ء)
 پرش (غزلوں کا مجموعہ: ۲۰۱۰ء)
 ولادت ۱۱ ستمبر ۱۹۲۵ء حصار (مشرقی پنجاب)
 وفات ۱۱ نومبر ۲۰۱۷ء
 تدفین لاہور
 ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۱۲ نومبر ۲۰۱۷ء
 اہل قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۰ء

نجم الحسن رضوی، سید

ممتاز اردو ادیب، افسانہ ناول و طنز و مزاح نگار، صحافی۔ بچوں کے لئے بھی اردو اور انگریزی میں کہانیاں اور ناول لکھیں

افسانوی کتب: چشم تماشا (۱۹۸۲ء)۔ ہاتھ نیچنے والے (۹۳ء)

پُرسے کا موسم (۱۹۹۷ء)۔ انٹرنیٹ کیفے (۰۳ء)

آکسیجن (۲۰۰۸ء)۔ دریا کا گھر (۲۰۱۱ء)

ناول: ماروی اور مرجینا (۲۰۱۱ء)

طنز و مزاح: ہمارا بد معاشی نظام (۱۹۹۸ء)

معذرت کے ساتھ (۲۰۰۷ء)

دیگر: حرف تازہ (ادبی مضامین: ۲۰۱۰ء)

آوازِ پا (خودنوشت: ۲۰۱۵ء)

ولدیت سید سجاد حسین رضوی

ولادت ۲۳ اپریل ۱۹۴۳ء دیوگاؤں ضلع اعظم گڑھ

وفات ۱۷ نومبر ۲۰۱۷ء لاس ویگاس (امریکہ)

تدفین لاس ویگاس (امریکہ)

ماخذ عقیل عباس جعفری (کراچی)۔

شہر ہنرمیں (نجم الحسن رضوی: فن و شخصیت)



Editorial Board

Pattern in chief: Dr. Shahid Siddiqui

Supervisor : Dr.Abdul Aziz Sahir

Editor:Dr.Arshad Mahmood Nashad

Advisory Board

National

Iftexhar Arif (Islamabad)

Tehsin Firaqi (Lahore)

Khurshid Rizvi (Lahore)

Zahida Hina (Karachi)

M.Hamid Shahid (Islamabad)

Mirza Hamid Baig (Lahore)

Nasir Abbas Nayyar (Lahore)

Yasmin Hameed (Lahore)

International

Halil Toqar (Turkey)

Satiya Pal Anand (USA)

Soyamane Yasir (Japan)

Suhail Abbas Balouch (Japan)

Shams Ur Rehman Farooqi (India)

Muhammad Umer Memon (USA)

M.Kiomarsi (Iran)

ثبان-----۲۰۲۰

Sabaat

Creative Journal
of
Urdu Language & Literature

Issue:1

July-December,2017

Editor:

Arshad Mahmood Nashad

DEPARMENT OF URDU
ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD